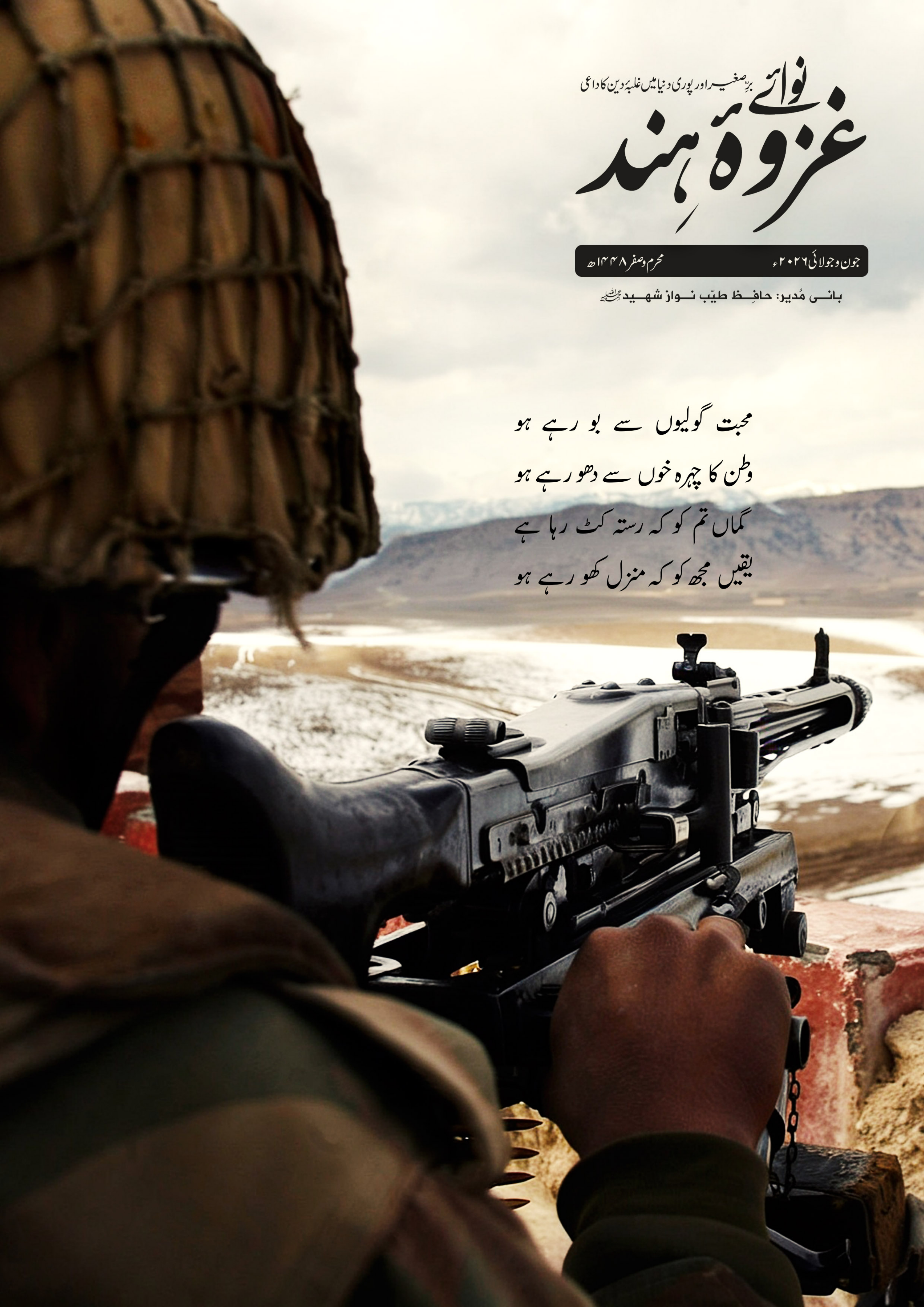

برِّصغیر اور پوری دنیا میں غلبۂ دین کا داعی

نوائے غزوۂ ہند

جون و جولائی ۲۰۲۶ء | محرم و صفر ۱۴۴۸ھ

بانی مُدیر: حافِظ طیّب نواز شہید رحمہ اللہ علیہ

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

سیدنا عبداللّٰہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نصیحتیں

''اے گناہ کرنے والے! گناہ کے بُرے انجام سے مطمئن نہ ہوجانا کیونکہ گناہ کرنے کے بعد بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جو گناہ سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔ گناہ کرتے ہوئے تمہیں اپنے دائیں بائیں کے فرشتوں سے شرم نہ آئے تو تم نے جو گناہ کیا ہے یہ اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ کیا کریں گے۔ اور پھر تم ہنستے ہو، تمہارا یہ ہنسنا گناہ سے بھی بڑا ہے۔ اور جب تمہیں گناہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوجاتی ہے اور تم اس گناہ پر خوش ہوتے ہو تو تمہاری یہ خوشی اس گناہ سے بھی بڑی ہے۔ اور جب تم گناہ نہ کرسکو اور اس پر تم غمگین ہوجاؤ تو تمہارا یہ غمگین ہونا اس گناہ کے کرلینے سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ گناہ کرتے ہوئے ہوا کے چلنے سے تمہارے دروازے کا پردہ ہل جائے تو اُس سے تم ڈرتے ہو اور اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے اس سے تمہارا دل پریشان نہیں ہوتا تو یہ کیفیت اس گناہ کے کرلینے سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ تمہارا بھلا ہو، کیا تم جانتے ہو کہ حضرت ایوب علیہ السلام سے کیا چُوک ہوئی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے جسم کو ایک بیماری میں مبتلا کردیا اور ان کا سارا مال ختم کردیا تھا؟ ان سے چوک یہ ہوئی تھی کہ ایک مسکین پر ظلم ہو رہا تھا، اس مسکین نے حضرت ایوب علیہ السلام سے مدد مانگی تھی اور کہا تھا کہ یہ ظلم رکوا دیں۔ حضرت ایوب علیہ اسلام نے اس کی مدد نہیں کی تھی اور ظالم کو اس مسکین پر ظلم کرنے سے نہیں روکا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں ڈال دیا تھا۔''

ابونعیم فی الحلیۃ (ج ۱ ص ۳۲۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوائے غزوۂ ہند

جلد نمبر: ۱۹، شمارہ نمبر: ۶

جون و جولائی ۲۰۲۶ء | محرم و صفر ۱۴۴۸ھ

بحمد اللہ... مسلسل اشاعت کا انیسواں ۱۹ سال!

تجاویز، تبصروں اور تحریروں کے لیے اس برقی پتے (email) پر رابطہ کیجیے: editor@nghmag.com

www.nawaighazwaehind.org

www.nawai.io/Twitter

www.nawai.io/Bot

www.nawai.io/ChirpWire

ContactNGH.313

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’زمین پر قائم کی گئی ایک شرعی حد (زمین کے لیے) چالیس دن کی بارش سے زیادہ بہتر ہے۔‘‘

(صحیح ابن حبان)

اس شمارے میں

اداریہ

محبت گولیوں سے بو رہے ہو! 5

تزکیہ و احسان

اللہ سے حسنِ ظن 9

آخرت

موت و ما بعد الموت 13

فکر و منہج

خطوط سُوئے مغربِ اسلامی 15

جنگی اسٹریٹجی کے ۳۳ رہنما اصول 19

مدارس و دینی جدوجہد کی تحریک 29

حربِ ظاہری کا حربۂ باطنی 35

سید احمد شہیدؒ کی تحریک پر اعتراضات کا مختصر جائزہ 44

کفار کا معاشی بائیکاٹ 51

عالمی منظر نامہ

اخباری کالموں کا جائزہ 53

کس کی جان گئی...... 61

بائیکاٹ انکل اور امریکہ 63

طوفان الاقصیٰ

غزہ کوئی استثناء نہیں! 65

فلسطینی اشرافیہ: ایک صدی سے استعمار کی معاون 71

ٹار چر ورثے میں ملا ہے! 74

افغان باقی کہسار باقی......الحکم للہ والملک للہ

عمرِ ثالث 76

پاکستان کا مقدر......شریعتِ اسلامی کا نفاذ!

پاک بھارت کشیدگی اور امریکی کردار 80

غزوۂ ہند

غزوۂ ہند کی فکری بنیادیں 85

جن سے وعدہ ہے مر کر بھی جو نہ مریں!

چراغِ بصیرت اور فدائی معرکہ 92

ناول و افسانے

الشوک والقرنفل (کانٹے اور پھول) 94

وغیرہ وغیرہ

اِک نظر اِدھر بھی 100

اس کے علاوہ دیگر مستقل سلسلے......

اعلانات از ادارہ:

- مجلّہ ’نوائے غزوۂ ہند‘ میں علمائے کرام کی اجازت کے بعد جانداروں کی تصاویر شامل ہوتی ہیں۔ تاہم یہ اجازت فقط مجلّے کے ویب ورژن (PDF وغیرہ) کے لیے ہے، اگر کوئی مجلّے کو کاغذ پر چھاپنا چاہے تو براہِ کرم مذکورہ تصاویر کو دھندلا (blur) کر کے چھاپے۔ قدیم و معاصر علماء کی اکثریت بہر حال کاغذ پر چھپی تصویر کی اجازت نہیں دیتی!
- مجلّہ ’نوائے غزوۂ ہند‘ میں شائع ہونے والے ’مستعار مضامین‘ (بشمول سوشل میڈیا پوسٹس/سٹیٹس/ٹویٹس) مجلّے کی ادارتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں اور ان مضامین وغیرہ میں موجود تمام خیالات اور ان کے مصنفین کے تمام افکار و آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

’غزوۂ ہند‘ تمام اہلِ ایمان کا قضیہ ہے اور اس ’غزوے‘ کی حمایت و نصرت تمام اہلِ ایمان بالخصوص برِّ صغیر میں بستے اہلِ ایمان کا فریضہ ہے۔ ’غزوۂ ہند‘ کی دعوت کو پھیلانے اور مضبوط کرنے کی ایک کوشش کا نام ’نوائے غزوۂ ہند‘ ہے۔

نوائے غزوۂ ہند:

- اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کفر سے معرکہ آرا مجاہدین فی سبیل اللہ کا موقف مخلصین اور محبّینِ مجاہدین تک پہنچاتا ہے۔
- برِّ صغیر، افغانستان اور ساری دنیا کے جہاد کی تفصیلات، خبریں اور محاذوں کی صورتِ حال آپ تک پہنچانے کی کوشش ہے۔
- امریکہ، بھارت، اسرائیل اور اس کے حواریوں کے منصوبوں کو طشت از بام کرنے، اُن کی شکست کے احوال بیان کرنے اور اُن کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی ایک سعی ہے۔

اس لیے...... اسے بہتر سے بہترین بنانے اور دوسروں تک پہنچانے میں ہمارا ساتھ دیجیے!

editor@nghmag.com

محبت گولیوں سے بور ہے ہو!

گزشتہ ایک ماہ سے کرفیو میں Kill on sight یعنی دِکھتے ہی قتل کر دیا جائے کا ’عملاً‘ حکم، ناکہ بندی، گرفتاریاں، جگہ جگہ جامہ تلاشیاں، حتیٰ کہ زندگی کی بنیادی ضروریاتِ اشیائے خورد و نوش میں آٹے تک کی ترسیل پر پابندی۔ یہ فلسطین کی، غزہ کی بات نہیں ہو رہی۔ نہ ہی یہ بھارتی مقبوضہ جموں و کشمیر کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ ذکر ہے آزاد کشمیر کا!

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے چند ہفتوں بعد مقامی مجاہدین نے مہاراجہ ہری سنگھ کے زیرِ قبضہ ’ریاستِ کشمیر‘ کو آزاد کروانے کے لیے جہاد کا آغاز کیا جس نے بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تھا اور کچھ ہی ہفتوں کی جانبازی و محنت کے نتیجے میں ضلع پونچھ ثم راجوری میں ان مجاہدین کو من جانب اللہ کامیابی حاصل ہو گئی۔ ان مقامی کشمیری مجاہدین کے ساتھ پاکستان کے قبائلی علاقوں سے آنے والے مجاہدین بھی شامل ہو گئے اور بعداً پاکستان فوج کے سپاہی بھی اس جہاد میں شریک ہو گئے۔ کم و بیش ایک سال کے جہاد کے نتیجے میں کشمیر کا ایک تہائی علاقہ آزاد کروا لیا گیا جس میں آج پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں گلگت بلتستان وغیرہ اور آزاد ریاست جموں و کشمیر کے تحت مظفر آباد، باغ، کوٹلی، میر پور، بھمبر، راولا کوٹ، حویلی اور سدھنوتی کے علاقے شامل ہیں۔ تاریخی روایت بتاتی ہے کہ یہ مجاہدین جن میں اس وقت کی پاکستان فوج کے سپاہی بھی شامل تھے سری نگر میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ مجاہدین سری نگر ائیر پورٹ پر قبضہ کر چکے تھے، جب پاکستان فوج اور حکومت کی ’اعلیٰ کمان‘ نے پہلی بار ان مجاہدین کو ’Abandon‘ یا تنہا چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ نتیجتاً آج کا سری نگر، کشمیر وادی کا بیشتر علاقہ، جموں اور لداخ کا اکثر حصہ بھارت کے قبضے میں رہ گیا، جو کہ کشمیر کا دو تہائی حصہ ہے۔ ۱۹۴۹ء کے آغاز میں پاکستان و بھارت کی حکومت نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا، ایک تہائی آزاد شدہ کشمیر اور دو تہائی مقبوضہ کشمیر کے درمیان ایک جنگ بندی لائن یا سرحد بنا دی گئی، اور بعد میں ۱۹۷۲ء کے شملہ معاہدے میں اسی جنگ بندی لکیر کو لائن آف کنٹرول کا نام دے دیا گیا۔ جسے قیامِ پاکستان کے وقت شہ رگ کہا گیا تھا، اس کشمیر کو ’مسئلۂ کشمیر‘ بنا دیا گیا۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

آگے بڑھنے سے قبل، یہاں ’جہادِ کشمیر‘ کو ’Abandon‘ کیے جانے والی بات پر کچھ توقف لازمی ہے۔ بلکہ اس ’Abandon‘ کرنے کے ’نظریے‘ یا ’ابن الوقتی‘ یا ’غداری‘ کے چند اور نظائر انتہائی اختصار سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ آج سے پندرہ برس قبل جنرل اشفاق پرویز کیانی نے کھاریاں کینٹ کا دورہ کیا، اس دورے میں افسروں سے خطاب کرتے ہوئے اس نے ’ریاستِ پاکستان‘ کی ایک ایسی پالیسی بیان کی جو پاکستان پر قابض امریکی غلام اشرافیہ کے بیانیے و زاویے کی وضاحت کرتی ہے، وہ اشرافیہ جو دو ڈھائی صدیوں سے اس خطے میں موجود اشرافیہ کا تسلسل ہے، شیطانی مثلث؛ فوج، افسر شاہی یا سول بیوروکریسی اور چند بیس بائیس سرمایہ دار و جاگیر دار سیاسی خاندان۔ جنرل کیانی نے واضح کیا کہ ہماری پالیسی ’قومی مفاد‘ ہے اور اس قومی مفاد کی خاطر ہی ہم نے جو کچھ کیا سو کیا، حتیٰ کہ ’We had to abandon the freedom movement in Kashmir as it was not in our National Interest.‘، ہمیں کشمیر کی تحریکِ آزادی سے کنارہ کشی کرنا پڑی کیونکہ یہ ہمارے قومی مفاد میں نہیں تھا۔ قومی مفاد کی پالیسی کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے، ساری دنیا کی کرپٹ حکومتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے، لیکن اصل بات یہاں جنرل کیانی کے منہ سے اس بات کا اقرار ہے[1]۔ دنیا میں ’نیو ورلڈ آرڈر‘ کے قیام کے بعد تبدیلی یہ آئی ہے کہ اسی قتلِ عام اور

---

[1]نشر کردہ ادارہ السحاب برِّصغیر

ظلم و جبر اور آمریت کو نئے اور خوبصورت الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ 'قومی مفاد' بھی انہیں اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ ہر بادشاہ، ہر جرنیل، ہر تخت نشین فیلڈ مارشل کے الفاظ اور اسی کا کردار و عمل 'قومی مفاد' ہوا کرتا ہے، اور اس قومی مفاد کی خاطر سب کچھ کرنا روا ہوتا ہے، چاہے چھ لاکھ جانوں اور تاریخ انسانیت کی سب سے بڑی ہجرت کے نتیجے میں قائم ہونے والی مملکتِ پاکستان کو دولخت کرنا ہی مقدر ٹھہرے! قیامِ پاکستان کے بعد تاریخ میں پہلی بار مجاہدینِ کشمیر کو ۱۹۴۸-۴۹ء میں Abandon کیا گیا۔ سنہ ۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں 'رضاکاروں' کو Abandon کیا، کارگل میں مجاہدین کو Abandon کر کے اپنے سپاہیوں کی لاشیں چھوڑ کر فوج بھاگ گئی، ۲۰۰۱ء میں امارتِ اسلامیہ افغانستان کو Abandon کیا گیا، ہزاروں مجاہدینِ عرب و عجم کو اور امت کی بیٹی عافیہ صدیقی کو Abandon کیا گیا، نائن الیون کے بعد جہادِ کشمیر کی قیادت اور اس جہاد کو Abandon کیا گیا اور آج آزاد کشمیر ہی میں مقبوضہ کشمیر کے مناظر دہرائے جا رہے ہیں۔

یہاں پاکستان فوج کے ملک و ملک سے غدار جرنیلوں کے کردار کو بیان کرنے کے بعد لازمی ہے کہ ایک اہم نکتہ بیان کیا جائے۔ یہ اہم نکتہ پاکستان و برِّ صغیر میں موجود تمام دینی و جہادی تحریکات کے اساسی نکات میں سے ایک ہونا چاہیے۔ مملکتِ پاکستان لاکھوں جانوں اور کھرب ہا روپے کے سرمائے اور املاک کی قربانی کے بعد وجود میں آئی، اس مملکت کو بنانے اور اس کی خاطر قربانیوں کا مقصدِ وحید 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کا نفاذ اور شریعتِ 'محمد رسول اللّٰہ' (علیہ ألف صلاۃ وسلام) کی اقامت تھا۔ دراصل برِّ صغیر کے ایک ٹکڑائے زمین پر ایک ایسا انقلابِ اسلامی برپا کرنا بانیانِ پاکستان کے پیشِ نظر تھا جہاں اولاً اسلام کو مکمل قائم کیا جا سکے، ایمان، عزت، جان، مال اور عقل کی حفاظت ہو سکے۔ شیخ الاسلام علامہ شبّیر احمد عثمانی نے ایک ایسی نظریاتی مملکت کی اولین پرچم کشائی کی تھی جو ایک ایسا قلعۂ اسلام بنے جہاں سے نواب سراج الدولہ شہید، سلطان فتح علی ٹیپو شہید اور سیّد احمد شہید کے مقصد کو پورا کیا جا سکے، اسلام کا وہ مضبوط قلعہ جہاں سے شوکتِ اسلام کے لشکر مُشکّل ہوں اور اندلس و اقصیٰ کی جانب یہاں سے قافلے نکلیں، وہ اسلام کا مورچہ جو گائے کے پجاریوں کے نرغے سے بابری مسجد تا ازہرِ ہند دار العلوم دیوبند کا دفاع کرے، گھر واپسی، لو جہاد، مسلمانوں کو گھس بیٹھیے بکتے اکھنڈ بھارت کے پرستاروں کو لگام ڈالے، وہ پاکستان جو نبوی پیشین گوئی 'غزوۂ ہند' کا پیش خیمہ ہو۔ پس اس مملکت کی نظریاتی و جغرافیائی حدود کی حفاظت اہلِ ایمان کا، اس خطے میں موجود ہر دینی و جہادی تحریک کا شیوہ ہونا چاہیے۔ یہ جاننا بھی لازمی ہے کہ آج امریکہ تا ہندوستان سبھی چاہتے ہیں کہ اس ملک کے حصے بخرے کر کے قوم پرستوں کو تھما دیے جائیں، جیسے کل قوم پرستی کے عنوان تلے بنگلہ دیش بنایا گیا، اسی طرح سندھو دیش، جناح پور، آزاد بلوچستان، سرائیکستان، پشتونستان اور کشمیر بنے گا خود مختار کے نعروں اور ایجنڈوں میں اس ملک کو تقسیم کر دیا جائے۔ ان باتوں سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اس امریکی و بھارتی سازش کو کامیاب بنانے کے لیے ارضِ پاکستان میں سب سے بڑی قوت کون سی ہے؟ پاکستان کو تقسیم کرنے کے ایجنڈے پر اپنی سازشی اور اکثر نادانی، جہالت اور متکبرانہ سوچ کے ساتھ کون کام کر رہا ہے۔ آئندہ سطور اسی قوت کے مزید کردار و عمل کو واضح کریں گی۔

اگرچہ بنگلہ دیش کے بننے یعنی پاکستان کے دولخت ہونے میں بھارت کی سازش کار فرما تھی۔ بے شک بھٹو اور شیخ مجیب دونوں نے اقتدار کی ہوس میں پورب و پچھم کو کاٹ دیا۔ لیکن بنگالیوں کو قوم پرست بنانے میں اصل کردار پاکستانی سول و ملٹری اسٹیبلشمنٹ کا تھا، اس اسٹیبلشمنٹ کا بنگالیوں سے تضحیک آمیز رویہ، ان کو کالا، چھوٹے قد کا اور انگریز کی طرح میز پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانے کے آداب سے عاری ہونے کا طعنہ دینا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ کا بنگالیوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرنا، ان کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ اور بنگالی قوم کا بطورِ قوم استحصال کرنا بنگالیوں کو جے بنگلہ کا نعرہ لگانے پر مجبور کرتا تھا۔ ہم شیخ مجیب کے ادنیٰ سے حامی نہیں، لیکن شیخ مجیب کی زندگی کو غور سے دیکھا جائے اور اس کی سیاسی زندگی پر نظر دوڑائی جائے تو واضح معلوم پڑتا ہے کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے رویے نے اس کو 'بنگا بندھو' بنایا۔ ہم لوگوں کو محروم کرتے ہیں، کرتے ہیں، کرتے ہیں اور پھر ان کو اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ بغاوت کی راہ پر پڑ جائیں۔

یہی منظر بلوچستان میں دہرایا گیا اور آج یہ منظر آزاد کشمیر میں دہرایا جارہا ہے۔ کشمیری جانتے ہیں کہ آزاد کشمیر حکومت کے بہت سے اساسی فیصلے مری میں بیٹھا پاکستان فوج کا Div Commander کر رہا ہوتا ہے، منگلا اور آگے کا علاقہ پاکستان فوج کے لیے اسٹریٹیجک اہمیت کا حامل ہے۔ کشمیر پر اپنا تسلط جمائے رکھنے کے لیے آزاد کشمیر کی سیاست ایک کھلا قمار و جوا ہے۔ پاکستانی ملٹری اسٹیبلشمنٹ خصوصاً آئی ایس آئی کے لیے آزاد کشمیر ایک شطرنج کی بساط ہے، ایک ایسی شطرنج کی بساط جس کے دونوں جانب آئی ایس آئی خود ہی کھیلتی ہے۔ آزاد کشمیر میں کوئی سیاسی پارٹی مستحکم نہیں، بادشاہ گر اسٹیبلشمنٹ کے پاس اس سیاست کے لیے ایسے مہرے؛ پیادے، شہسوار، فیل، رخ، وزیر اور بادشاہ ہیں جو سیاہ و سفید کی تفریق کے بنا، کبھی ایک طرف ہوتے ہیں یا کر دیے جاتے ہیں تو کبھی دوسری۔ ایسے سیاسی جغادری پن کے نتیجے میں اللہ کی رحمت سے دور نظامِ جمہوری میں جو عام فرد کے لیے بنیادی حقوق و سہولیات ہیں وہ ان سے بھی محروم ہے۔ لائن آف کنٹرول کے اِس پار بستی کشمیری قوم جو 'اسلام کی نسبت سے، اسلام کے رشتے سے پاکستانی' بنی تھی جب اپنے بنیادی حقوق کے لیے اٹھتی اور آواز بلند کرتی ہے تو پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کا وہی گھسا پٹا پرانا منجن و چورن بیچا جاتا ہے کہ ان مظاہروں کے پیچھے 'را' ملوث ہے۔ ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ بنگلہ دیش بنتے ہوئے اگر تلہ میں سازش ہوئی تھی اور آج بھی مظفر آباد سے میر پور تک 'را' کے بہت سے کارندے کام کرتے ہوں گے، آج بھی آزاد کشمیر کی سیاسی تحریک میں 'را' کے خدمت گار مثلِ شیخ مجیب موجود ہوں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ 'را' کو کام کرنے کے لیے زمین کس نے ہموار کی ہے؟ 'ریاست ہوگی ماں کے جیسی' لیکن کس ریاست نے ساری زندگی اپنی اولاد کے ساتھ سوتیلی ماں والا رویہ رکھا ہے اور نوالے نوالے کا محتاج اس کو بنایا ہے؟ پھر یہی اولاد بڑی ہو کر، ظلم و جبر سے تنگ آکر اگر گلی کوچوں میں نکلی ہے تو ایک بار نہیں صد بار 'را' اس کو استعمال کر سکتی ہے۔ ذکرِ کشمیر کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں کراچی کے پاس حب کے علاقے سے ہائی وے پر سفر شروع کیجیے، کوئٹہ پہنچیے اور کوئٹہ سے نوشکی اور وہاں سے مکران کی طرف جائیے...... اب اسلام آباد سے لاہور کو عازمِ سفر ہوں اور لاہور سے ملتان و بہاولپور کی طرف...... سڑک کا یہ سفر آپ کو بڑا واضح پیغام دے گا کہ یہ ایک ملک کے دو صوبے تو ہیں لیکن ایک غریب ہے اور دوسرا امیر، حالانکہ ریاست نے تو ماں جیسا ہونا تھا۔ اب بلوچستان سے کچھ نادان اٹھیں، پھر وہ لاکھ بار غلط و نادرست لیکن اسلام و پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو جوڑ کر وہ سیکولر ہو جائیں اور پھر بھارت کے ساتھ مل کر سازشیں کریں تو بتائیے ماں کی پہلے تادیب کریں گے یا اس اولاد کی؟ اسلامی دولت و سلطنت کے اولین فرائض میں سے عوام الناس کے عقائد و دین کی اصلاح کرنا ہے، کیا 'ہماری' ریاست بھی یہ کر رہی ہے یا الٹا یہ امریکی ورلڈ آرڈر ہی کی پرچارک ہے، بلکہ ضدِ اسلام میں ٹرمپ کے 'بورڈ آف پیس' میں دفاعِ اسرائیل کی خاطر بیٹھی ہوئی ہے؟

یقیناً 'را' بہت سی جگہوں پر ملوث ہے، لیکن جیسے محترمہ فاطمہ جناح کو 'را' کا ایجنٹ کہا گیا، بنگالیوں کو 'را' کا ایجنٹ کہا گیا، مجاہدین کو 'را' کا ایجنٹ کہا گیا، تو اس طرح اپنے حقوق کی خاطر اٹھنے والے کشمیریوں پر پہلے پہلے یہ تہمت لگانے والوں کا کردار بھی دیکھ لیجیے کہ وہ ڈھکے چھپے نہیں بلکہ اعلانیہ 'سی آئی اے' کے ایجنٹ ہیں۔ آج آزاد کشمیر میں مقبوضہ کشمیر جیسا حال برپا ہے، غزہ جیسی ناکہ بندی آزاد کشمیر کے بعض شہروں کی، کی گئی ہے۔ حبیب جالبؒ نے کہا تھا:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

ان حقائق کے ساتھ، آزاد کشمیر کے مجاہد صفت اور جہادِ کشمیر کے اعوان و انصار عوام سمیت تمام غیرت مند پاکستانی مسلمان عوام، خصوصاً علمائے کرام، داعیانِ دین، دینی و سیاسی قیادت، اکابرینِ ملت، شاعروں، صحافیوں، ادیبوں، اصحابِ فکر و دانش کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک

ظلم کے مقابل دوسرے ظلم کے حامی جانے یا انجانے میں نہ بن جائیں۔ حقوق کی فراہمی اگر کہیں ہے تو بس اسلامی نظام کے قیام میں۔ ذات سے لے کر اجتماع تک، بسترِ خواب سے ایوانِ حکومت تک، نفاذِ شریعت ہی حقوق کا ضامن اور دنیا و آخرت میں فوز و فلاح کا راستہ ہے۔ باقی نام نہاد جمہوریت ہو یا آج کا ہائیبرڈ مارشل لائی آمرانہ نظام، یہ سب سراب ہیں۔ پاکستان اگر اسلام کا قلعہ ہے تو تب جب یہاں نظامِ اسلام قائم ہو، اور پاکستان سے اگر کسی مسلمان کو محبت ہے یا ہونی چاہیے تو اسلام ہی کی خاطر ہونی چاہیے اور یہ محبت وطن پرستی اور وطنیت بقولِ اقبال ایک سیاسی نظریے کی صورت میں نہ بن جائے۔ ہمیں اور ہمارے اہلِ دین حضرات کو جاننا چاہیے کہ اسّی برس ہونے کو آئے لیکن یہ ملک اسلام کا قلعہ نہیں بن سکا، یہاں وہ اسلامی انقلاب نہیں آسکا جس کی خاطر یہ ملک بنایا گیا تھا۔ اہلِ کشمیر کے حقوق ہوں یا بلوچوں کے حقوق کی فراہمی ان سب کا واحد راستہ اسلامی نظام کے قیام کی بابرکت محنت ہے۔ جہاں جہاں یہ محنت وعظ و نصیحت سے باثمر ہو سکے تو کی جائے۔ تزکیہ و دعوت و تبلیغ سے نظامِ اسلامی کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ عوامی انقلابی جلسوں کے اہتمام، عوامی سطح پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تحریکات کی صورت اقامتِ دین کی جدوجہد ہو۔ امت کا غم، اقصیٰ کا درد، فلسطین و اہلِ غزہ کے ساتھ قولاً و فعلاً ہمدردی و معاونت کی فضا عام کی جائے۔ پھر یہ سب کرتے ہوئے یہ بھی ذہن نشین رہے کہ پاکستان میں حالاً قائم نظام ہماری گردنوں پر بزورِ بندوق نافذ کیا گیا ہے۔ کسی دانش ور کا قول ہے کہ شاعری بہت خوبصورت چیز ہے، لیکن مردِ میدان جانتا ہے کہ کیا کام شاعری سے ہوتا ہے اور کس کام کے لیے شمشیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنوں کی بزم ہو تو شاعری و نظم اچھی اور غیروں، غیروں کا کالا انگریزی نظام نافذ کرنے والوں سے سامنا ہو تو شمشیر و گاہِ رزم اچھی!

اللهم اهدنا فيمن هديت وعافنا فيمن عافيت وتولنا فيمن توليت وبارك لنا فيما أعطيت وقنا شر ما قضيت إنك تقضي ولا يقضى عليك وإنه لا يذل من واليت ولا يعز من عاديت تباركت ربنا وتعاليت!

اللهم وفقنا لما تحب وترضى وخذ من دمائنا حتى ترضى. اللهم اهدنا لما اختلف فيه من الحق بإذنك. اللهم زدنا ولا تنقصنا وأكرمنا ولا تهنّا وأعطنا ولا تحرمنا وآثرنا ولا تؤثر علينا وارضنا وارض عنا. اللهم إنّا نسئلك الثّبات فی الأمر ونسئلك عزيمة الرشد ونسئلك شكر نعمتك وحسن عبادتك. اللهم انصر من نصر دين محمد صلى الله عليه وسلم واجعلنا منهم واخذل من خذل دين محمد صلى الله عليه وسلم ولا تجعلنا منهم، آمين يا ربّ العالمين!

♦♦♦♦♦

مجلّہ ’نوائے غزوۂ ہند‘ اہلِ دین و دانش کے نصائح، رائے اور مشورے کا محتاج ہے
اور چاہتا ہے کہ اہلِ دین و دانش کے
قیمتی نصائح، رائے اور مشورے ادارے تک پہنچیں۔

editor@nghmag.com

اللہ سے حُسنِ ظن

شیخ اِیاد قنیبی

آزمائش وابتلا کو نعمتوں میں کیسے بدلیں؟ آزمائش کی نعمت کا مزہ کیسے حاصل کریں؟ قطع نظر اس سے کہ آپ کو زندگی میں کس کس مشکل کا سامنا ہے، آپ ایک پر سکون زندگی کیسے گزار سکتے ہیں؟ آپ ہر معاملے کا سامنا مثبت اندازِ فکر اور امید و حوصلے سے کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ وہ گہرا و قریبی تعلق کیسے بنا سکتے ہیں، کہ آپ کو اس کی ذات کے سوا کسی کا خوف اور کسی سے امید نہ رہے؟ آپ ایک ناقابلِ شکست عزم اور ایک ناقابلِ شکست شخصیت کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ آپ اپنے دل کا تزکیہ کیسے کریں، کہ قسمت و تقدیر کو الزام دینا چھوڑ دیں تا کہ اللہ سے ایک سالم و پاکیزہ دل کے ساتھ ملاقات کر سکیں؟ آپ اپنے خالق ومالک، اپنے ربّ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے اپنی محبت کو کیسے خالص و غیر مشروط بنا سکتے ہیں؟ تحریرِ ہٰذا میں آپ کو ان سوالوں کے جواب، اور مزید بہت کچھ ملے گا، ان شاء اللہ! (ایاد قنیبی)

اگر یہ آیات آپ کو غور و تدبر پر مجبور نہیں کرتیں، تو آپ کو تجدیدِ محبت کی ضرورت ہے

کیا یہ امر از حد تعجب و حیرت کا سبب نہیں کہ اللہ جل شانہ اپنی ذات کے لیے ہماری محبت کو جھنجھوڑتا ہے، بیدار کرتا ہے جبکہ اسے نہ ہماری ضرورت ہے اور نہ ہماری محبت کی کوئی حاجت؟

کیا اس کے ناموں میں سے ایک نام الوَدود (بے حد محبت کرنے والا) نہیں ہے؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا○ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا○ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا○۴۳ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ښ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا○(سورۃ الاحزاب: ۴۱-۴۴)

”اے ایمان والو! اللہ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔ اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ کتو وہی ہے جو خود بھی تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے، اور وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔ جس دن مومن لوگ اللہ سے ملیں گے اس دن ان کا استقبال سلام سے ہوگا، اور اللہ نے ان کے لیے باعزت انعام تیار کر رکھا ہے۔“

ان آیات میں اللہ تعالیٰ مومنین کو یاد دلاتے ہیں کہ اسی کی ذات ہے جو ان کی رہنمائی کرتی ہے، ان پر اپنی رحمتیں نچھاور کرتی ہے، اور وہ روزِ قیامت ان کا ایک بہترین انعام کے ساتھ استقبال کرے گا، ایک ایسا انعام جو ربّ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت کا مظہر ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ربّ تعالیٰ اپنے بندوں سے کہہ رہے ہیں: ”تمہارے پروردگار کی حیثیت سے جس نے تمہیں یہ سب عطا کیا ہے کیا میں تمہاری محبت اور مستقل تذکرے کا حقدار نہیں ہوں (جیسے ایک محب اپنے محبوب کو مستقلاً یاد کرتا رہتا ہے)؟“

اللہ سے ہمارا تعلق محض اس بنیاد پر استوار نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی ذات سے ہمیں کیا کیا دنیاوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، تعلق کی بنیاد محض اخروی انعامات کے حصول کی تمنا بھی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ خود اللہ کی رضا و خوشنودی کی طلب، اس طلب کو ہمیشہ اپنی ذات میں ایک مکمل ہدف و مقصد ہونا چاہیے۔ ہمیں اللہ سے محبت کرنی چاہیے، اور شوق و طلب کے ساتھ اس ربِ عظیم کی محبت حاصل کرنے کی تمنا و جستجو کرنی چاہیے، اس کی محبت کے بغیر جینے کا تصور ہمارے لیے محال ہونا چاہیے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ بہت سی ایسی آیات جن میں احکامِ شرعی کا تذکرہ ہوتا ہے، ان آیات کا اختتام اس تذکرے سے کرتے ہیں کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے جو فلاں امور پر عمل کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو بعض دیگر افعال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان آیات کے اختتامی حصّوں سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ اگر ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے وفادار ہوتے اور اللہ سے ہماری محبت خالص ہوتی، تو ان آیات کے یہ اختتامی ٹکڑے ہمیں ان آیات پر عمل کی تحریض دلانے کے لیے کافی ہیں۔ ہم اللہ کے احکام پر عمل کرتے تاکہ ہم اس عظیم انعام کے مستحق ٹھہرائے جا سکیں جو کہ اللہ کی محبت ہے۔

یہ آیات کس کثرت سے قرآن عظیم الشان میں مذکور ہیں؟ چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں:

...اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۹۵)

”...بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

...وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (سورۃ آلِ عمران: ۱۴۶)

”... اللہ ایسے ثابت قدم لوگوں سے محبت کرتا ہے۔“

...اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (سورۃ التوبۃ: ۴)

”...بے شک اللہ احتیاط کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

...اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (سورۃ البقرۃ: ۲۲۲)

"...بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی طرف کثرت سے رجوع کریں اور ان سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہیں۔"

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭوَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورۃ آل عمران:۳۱)

"(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کردے گا۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔"

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (سورۃ الصف:۴)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے راستے میں اس طرح صف بنا کر لڑتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔"

...اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (سورۃ آلِ عمران:۱۵۹)

"...اللہ یقیناً توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

کیا آپ نے کبھی آیات کے ان آخری حصّوں پر غور کیا ہے؟

کیا آپ نے کبھی اپنے دل میں ایک ابلتی ہوئی، ٹھاٹھیں مارتی ہوئی خوشی محسوس کی ہے جب آپ کو لگا ہو کہ آپ اس گروہ میں شامل ہیں جن سے اللہ محبت فرماتا ہے؟ کیا یہ محبت آپ کو دنیا و مافیہا سے بڑھ کر عزیز محسوس ہوئی؟ کیا اللہ کی محبت حاصل کرنا وہ عظیم ترین مقصد اور زندگی کا وہ عمیق ترین معنی و مفہوم نہیں ہے کہ جس کی خاطر ہم زندہ ہیں؟

اگر ہم نے کبھی آیات کے ان حصوں پر غور نہیں کیا، اگر ہم نے کبھی پروا نہیں کی کہ ہم بھی ان افراد میں شمار کیے جائیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں، اگر اللہ سے ہماری محبت اتنی طاقتور نہیں کہ وہ ہمیں متقین، صابرین، صالحین و مخلصین میں سے بنا دے، صادق و امین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں میں شامل کروا دے، اللہ پر انحصار و توکل کرنے والا بنا دے، اس کے راستے میں لڑنے والا بنا دے، اگر اللہ کی محبت حاصل کرنے کی طلب نے ہمیں یہ سب کرنے پر مجبور نہیں کیا، اس کی محبت حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوششیں یہ اوصاف اپنانے میں صرف کرنے پر نہیں ابھارا، تو کیا یہ اس چیز کی علامت نہیں کہ ہم خود اللہ سے ہی بے نیاز اور اس کی محبت کی طلب سے تہی ہیں؟

اس کے برعکس دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض امور سے منع فرمایا، اور منع فرمانے کے بعد ان امور کو کرنے والوں کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

...وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (سورۃ آل عمران:۵۷)

"...اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔"

...اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (سورۃ المائدۃ:۸۷)

"...یقین جانو کہ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

...اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (سورۃ الاعراف:۳۱)

"...یاد رکھو کہ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ (سورۃ الانفال:۵۸)

"...یاد رکھو کہ اللہ بدعہدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

کیا جب آپ یہ آیات پڑھتے ہیں تو آپ کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ 'اگر اللہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تو کیا وہ مجھے آزمائش و مصیبت میں مبتلا کرے گا اور مجھ سے بعض نعمتیں چھین لے گا؟'۔

کیا آپ کی کُل فکر اور پریشانی یہی ہے کہ دنیاوی نعمتیں برقرار رہیں اور مشکلات و مصائب دور ہو جائیں؟ کیا آپ کو اس بات پر دکھ اور تکلیف محسوس نہیں ہوتی کہ اللہ آپ سے محبت نہیں کرتا؟ کیا اللہ کی محبت سے محروم ہو جانا بذاتِ خود ایک عظیم مصیبت اور نا قابلِ برداشت سزا نہیں ہے؟ کیا یہ سزا کافی نہیں کہ آپ کو کسی بھی قسم کی زیادتی کرنے یا گناہ میں پڑنے سے روک سکے؟ اور آپ کو مجبور کرے کہ اپنے الفاظ و اعمال کا از سرِ نو جائزہ لیں اور اپنا سخت محاسبہ کریں تاکہ اللہ کی محبت سے محروم ہونے سے خود کو بچا سکیں؟

خود سے یہ سوال کیجیے، تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ آپ سخت دل بیٹے رامی کی مانند ہیں یا وفا شعار و احسان مند غسان کی مانند؟ جو اپنے والد کے چہرے پر غم کی پرچھائیں برداشت نہ کر سکا اور اس احساس کے ساتھ زندہ رہنا اس کے تصور سے بھی باہر تھا کہ اس کے والد کے دل میں اس کے لیے بال آ گیا ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک بچہ اپنے والدین کی اپنی ذات سے محبت محسوس کر کے اپنی ذات پر اعتماد حاصل کرتا ہے؟ وہ صرف تب ہی مطمئن و پرسکون محسوس کرتا ہے جب اس کے والدین اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر اس کا باپ اس سے کہے: "میں تم سے محبت نہیں کرتا"، تو اس کی دنیا درہم برہم ہو جاتی ہے، اس کا اپنی ذات پر اعتماد مٹی میں مل جاتا ہے، اور زندگی کے حوالے سے اس کا نقطۂ نظر منفی اور تاریک ہو جاتا ہے۔

کیا ہم مکمل طور پر اللہ پر منحصر نہیں ہیں، کہ اس کی ذات کے سوا ہمارا نہ کوئی پالنے والا ہے نہ مددگار، نہ ہی اس کے سوا کہیں کوئی جائے پناہ ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ آپ سے کہہ دے: "میں تم سے محبت نہیں کرتا"، تو کیا یہ چیز آپ کو خوفزدہ نہیں کرتی؟ کیا آپ کو ڈر کے مارے

لرزنے پر مجبور نہیں کرتی؟ کیا یہ آپ کی دنیا درہم برہم نہیں کرتی؟ کیا یہ آپ کو غم و پریشانی اور بے سکونی کی کیفیت میں مبتلا نہیں کرتی؟

کیا آپ کو ہر اس عمل، ہر اس قول پر اپنا محاسبہ نہیں کرنا چاہیے جو آپ کو ان افراد کی صف میں کھڑا کرتا ہو جن سے اللہ رب العزت محبت نہیں کرتا؟

جب آپ کا دل اس مفہوم کو پالیتا ہے تو آپ کے لیے فہم کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا ہے جس کے ذریعے آپ ان بے شمار آیات و احادیث کو ایک نئی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں اور ان کی ایک مضبوط تاثیر اپنے دل پر محسوس کرتے ہیں۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ (سورۃ التوبۃ:۲۱)

”ان کا پروردگار انہیں اپنی طرف سے رحمت اور خوشنودی کی، اور ایسے باغات کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے دائمی نعمتیں ہیں۔“

ذرا اس آیت پر غور کیجیے اور محسوس کریں کہ اللہ کی محبت کیسے ہر ہر لفظ سے عیاں ہو رہی ہے!

دوسری جانب ان آیات اور احادیث پر بھی غور کیجیے جن میں ان افراد کا تذکرہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نہ بات کریں گے نہ ہی ان کی جانب دیکھیں گے۔ یہ کس قدر اذیت ناک سزا ہے، کسی بھی صاحبِ دل کے لیے، کہ جب اس کا محبوب نہ اس کی جانب نظر اٹھائے اور نہ ہی اس سے بات کرے!

ذرا بخاری کی اس روایت پر غور کیجیے:

”اللہ تعالیٰ اہلِ جنّت سے کہیں گے: 'اے اہلِ جنت!'۔ وہ جواب دیں گے: 'ہم حاضر ہیں ہمارے رب! تمام خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے'۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: 'کیا تم راضی ہو؟'، وہ جواب دیں گے: 'اے ہمارے ربّ، ہم کیسے راضی نہ ہوں جب کہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا کیا ہے جو اپنی مخلوق میں کسی اور کو عطا نہیں کیا'۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: 'کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز عطا نہ کروں؟'، وہ پوچھیں گے: 'اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟'، اللہ تعالیٰ جواب دیں گے: 'میں تم سے راضی ہو گیا اور کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا'۔“

ایک لاپرواہ دل کے لیے اس بات کا ادراک کرنا بھی مشکل ہے کہ یہ انتہائی نعمت ہی سب سے عظیم نعمت کیونکر ہے! کیا جنّت کے باسی لازوال نعمتوں اور چھاؤں، قسم ہا قسم میووں اور خوبصورت آنکھوں والی دوشیزاؤں سے لطف اندوز نہیں ہوں گے؟ تو اللہ کی رضا حاصل ہو جانے میں کیا خاص بات ہے؟

جبکہ وہ لوگ کہ جن کی محبت سچی ہے، وہ جانتے ہیں کہ محبوب کی محبت و رضا حاصل ہو جانا ہی عظیم ترین مقصد اور اصل ہدف کی تکمیل ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (سورۃ التوبۃ:۷۲)

”اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے وعدہ کیا ہے ان باغات کا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور ان پاکیزہ مکانات کا جو سدا بہار باغات میں ہوں گے۔ اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو سب سے بڑی چیز ہے۔ (جو جنت والوں کو نصیب ہو گی) یہی تو زبردست کامیابی ہے۔“

جی ہاں، اللہ کی رضا تمام باغات، دریاؤں اور عالیشان محلوں سے بڑھ کر ہے۔ کہ یہ ہمارے ربّ عظیم الشان، محبوب مالک کی رضا ہے۔

آئیے اس آیت پر غور کرتے ہیں:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ... (سورۃ البقرۃ:۱۵۲)

”لہٰذا مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔“

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا تذکرہ کرنے کی تلقین کر کے ہماری محبت کو ابھارتا ہے، اور اس تذکرے کے بدلے میں ایک انعام کا وعدہ کرتا ہے۔ وہ وعدہ کیا ہے؟ وہ وعدہ یہ ہے کہ وہ، اللہ سبحانہ و تعالیٰ، ہمارا تذکرہ کرے گا۔

ایک لاپرواہ دل یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ اللہ کا اپنے بندوں کو یاد کرنے یا ان کا تذکرہ کرنے میں کیا خاص بات ہے۔ لیکن وہ جو اپنی محبت میں سچے ہیں، ان کے لیے یہ انعام ایک عظیم نعمت سے کم نہیں کہ ان کا محبوب و مالکِ کل جہاں ربّ ان کو یاد کرے گا، ان کا تذکرہ کرے گا۔

پھر اس حدیث پر بھی غور کیجیے، جس میں اس بات کا بیان ہے کہ جب بندہ اپنے ربّ سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کیسے خوش ہوتے ہیں۔

بے شک اللہ اپنے بندے کی توبہ پر اس شخص کی مانند خوش ہوتا ہے جس کا اونٹ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں کھو جائے اور جب وہ اس کے ملنے سے مایوس ہو جائے تو اچانک اس کا اونٹ اسے مل جائے۔

کیا ایک مسلمان کے لیے اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کے لیے یہی کافی نہیں کہ اس کی توبہ سے اس کا مالک، اس کا محبوب اللہ خوش و راضی ہو جائے گا؟

اس کے علاوہ اس سے بڑھ کر بھی ایک دلنشین رخ ہے۔ اگر آپ کا کوئی عزیز آپ کو کوئی تحفہ دے، تو کیا آپ کو تحفہ پانے کی خوشی زیادہ ہوگی یا اس امر کی کہ یہ تحفہ اس شخص کی آپ سے محبت کا مظہر ہے جس نے یہ تحفہ آپ کو دیا؟ یقیناً آپ تحفے سے زیادہ دینے والے کی محبت محسوس کر کے خوشی محسوس کریں گے۔

جنّت کے باسیوں کی خوشی اس طرح کئی گنا بڑھ جائے گی۔ وہ خوشیاں مناتے ہوں گے، صرف ان نعمتوں پر نہیں جو اللہ نے اہلِ جنّت کو عطا کی ہوں گی، بلکہ اس پر بھی کہ نعمتوں کے یہ تحائف دراصل اللہ کی ان سے محبت اور خوشنودی کی علامت ہوں گے۔ جب بھی کبھی آپ ان آیات واحادیث کو پڑھیں جن میں اللہ کے انعامات کا تذکرہ ہے، تو اس معنی کو محسوس کرنا نہ بھولیں، کہ یہ نعمتیں درحقیقت اللہ کی اپنے بندوں سے راضی ہونے اور ان سے اس کی محبت کا اظہار وعلامت ہیں۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ (سورۃ التوبۃ:۲۱)

”ان کا پروردگار انھیں اپنی طرف سے رحمت اور خوشنودی کی، اور ایسے باغات کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے دائمی نعمتیں ہیں۔“

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (سورۃ التوبۃ:۸۹)

”اللہ نے ان کے لیے وہ باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں یہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی زبردست کامیابی ہے۔“

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (سورۃ المائدۃ:۹)

”جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ (آخرت میں) ان کو مغفرت اور زبردست ثواب حاصل ہوگا۔“

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ...(سورۃ آل عمران:۱۷۰)

”اللہ نے ان کو اپنے فضل سے جو کچھ دیا ہے وہ اس پر مگن ہیں...“

اللہ کی رضا، کہ جس کا اظہار اس کی نعمتوں کی شکل میں ہوتا ہے، ان نعمتوں سے بڑھ کر قیمتی وعظیم ہے۔

مندرجہ بالا تمام گفتگو کا مطلب یہ نہیں کہ مومن اللہ کی اطاعت اور اس کی عبادت صرف اور صرف اس کی محبت میں کرتا ہے، اور اسے نہ اللہ سے حاصل ہونے والے انعام کی کوئی رغبت ہوتی ہے اور نہ اس کی جانب سے ملنے والی سزا کا کوئی خوف۔ قرآن وحدیث اس غلط فہم کا رد کرتے ہیں:

...يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ...(سورۃ السجدۃ:۱۶)

”...وہ اپنے پروردگار کو ڈر اور امید (کے ملے جذبات) کے ساتھ پکار رہے ہوتے ہیں...“

...وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ...(سورۃ الاسراء:۵۷)

”اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں، اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔“

بلکہ ہماری گفتگو کا مقصد صرف اس مخفی مگر مہم تر معنی کو نمایاں اور واضح کرنا ہے، جو ہمارے خوفِ الٰہی اور اسی کی ذات سے وابستہ امید ہی کے سبب اکثر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، کہ اللہ کی اطاعت اس کی ذات سے محبت کے سبب کرنی چاہیے، اور اس کی رضا اور محبت کی طلب میں کرنی چاہیے۔

کیا اب آپ کو یقین آ چکا ہے کہ اللہ رب العزّت ہماری محبت کو جگاتا ہے، ہمیں خود سے قریب کرتا ہے؟ کیا ان آیات نے آپ کو اپنے ماضی پر غور کرنے پر مجبور کیا؟ کیا آپ کے دل میں اللہ کی محبت کے جواب میں محبت پیدا ہوئی؟ کیا آپ نے یہ شوق محسوس کیا کہ اس کی محبت کے جواب میں اپنی محبت کا اظہار کریں؟ یا آپ کو اس کی نعمتوں نے اتنا مشغول کر لیا کہ آپ کو نعمتیں عطا کرنے والا ہی یاد نہ رہا؟ اگر آپ مشغول وغافل رہے تو آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیے اگر اللہ تعالیٰ آپ کو آزمائش ومصیبت میں مبتلا کر دے اور اس ذریعے سے آپ کو یاد دہانی کروائے کہ آپ کو اس کی محبت کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی آزمائش مشکل بھی ہوئی، تو بھی وہ اس خالی وتشنہ روح اور اس بے حس دل کی مصیبت سے بہتر ہے، جو نہ اللہ کی محبت محسوس کرتا ہے اور نہ ہی اس کا جواب دیتا ہے۔

خلاصۂ کلام:

اگر آپ کی آزمائش اللہ کے لیے آپ کی محبت میں اضافے کا سبب بنتی ہے تو چاہے آپ نے بظاہر کتنا ہی بڑا صدمہ یا نقصان کیوں نہ اٹھایا ہو، لیکن درحقیقت آپ نے کچھ نہیں کھویا اور سب کچھ پا لیا!

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆

موت و ما بعد الموت

اہل جہنم کے احوال

اس عنوان کے تحت ہم چار احوال دیکھیں گے:

۱. اہل جہنم کا جثّہ
۲. اہل جہنم کی خوراک
۳. اہل جہنم کے مشروبات
۴. اہل جہنم کا لباس

اہل جہنم کا جثّہ

اہل جنت اور اہل جہنم کا جثّہ، اہل دنیا کے جثّے سے بڑا ہو گا، نہ صرف بڑا بلکہ مبالغے کی حد تک بہت زیادہ بڑا ہو گا۔ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے:

إِنَّ غِلَظَ جِلْدِ الْكَافِرِ اثْنَانِ وَأَرْبَعُونَ ذِرَاعًا وَإِنَّ ضِرْسَهُ مِثْلُ أُحُدٍ وَإِنَّ مَجْلِسَهُ مِنْ جَهَنَّمَ كَمَا بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ

”کافر کی کھال کی موٹائی بیالیس گز ہو گی، اس کی داڑھ احد پہاڑ جیسی ہو گی اور جہنم میں اس کے بیٹھنے کی جگہ اتنی ہو گی جتنا مکہ اور مدینہ کے درمیان کا فاصلہ۔“

ذراع کے تعین میں مختلف آراء ہیں، البتہ تقریباً یہ ایک گز یا تین میٹر کے قریب ہے۔ یعنی کافر کی کھال ایک گز نہیں بلکہ قریباً بیالیس گز موٹی ہو گی۔ بالخصوص کھال کے ذکر اور اس کی اس قدر موٹائی کی وجہ یہ ہے کہ کھال ہی میں مرکزی اعصابی نظام ہوتا ہے اور یہی وہ حصہ ہے جہاں تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ جہنمی کی داڑھ احد پہاڑ جیسی ہو گی اور جہنم میں ان کے بیٹھنے کی جگہ مکہ اور مدینہ کے مابین فاصلے کے بقدر ہو گی، کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ وہ اس قدر بڑا رقبہ گھیریں گے؟ کیوں ان کے جثّے اس قدر بڑے ہوں گے؟ کیونکہ جتنی بڑی سطح ہو گی اسی قدر زیادہ آگ انہیں چھوئے گی اور اسی قدر زیادہ عذاب وہ محسوس کر سکیں گے۔

اہل جنت کے جسم بھی انسان کے دنیوی جسموں کے مقابلے بڑے ہوں گے مگر اس قدر نہیں جتنا اہل جہنم کے ہوں گے۔

اہل جہنم کی خوراک

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ○ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ○ (سورة الغاشیۃ: ۶، ۷)

”نہیں ہو گا ان کے لیے کھانے کو کچھ بھی، سوائے خار دار جھاڑیوں کے، جو نہ تو موٹا کرے اور نہ ہی بھوک مٹائے۔“

جہنمیوں کی اس خوراک کی حقیقت کیا ہو گی، یہ صرف اللہ ہی جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسے ضریع کہا ہے۔ مگر اس کی صفت یہ ہو گی کہ نہ تو وہ اہل جہنم کی بھوک مٹائے گی اور نہ ہی انہیں قوت بخشے گی۔

اہل جہنم کی بنیادی خوراک زقوم درخت کے پھل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اس درخت بارے فرماتے ہیں:

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ○ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ○ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ○ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ○ (سورۃ الدخان: ۴۳ تا ۴۶)

”یقین جانو کہ زقوم کا درخت، گناہ گار کا کھانا ہو گا، پگھلے ہوئے تانبے کی طرح، کھولے گا پیٹوں کے اندر جیسے کھولتا ہوا پانی۔“

نیز زقوم کے درخت کی مزید تفصیل بھی اللہ رب العزت نے بیان فرمائی ہے،

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ○ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ○ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ○ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ○ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ○ (سورۃ صٰفّٰت: ۶۲ تا ۶۷)

”بھلا یہ مہمانی اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ان ظالموں کے لیے ایک آزمائش بنا دیا ہے۔ دراصل وہ درخت ہی ایسا ہے جو دوزخ کی تہہ سے نکلتا ہے۔ اس کا خوشہ ایسا ہے جیسے شیطانوں کے سر۔ چنانچہ دوزخی لوگ اسی میں سے خوراک حاصل کریں گے، اور اسی

سے پیٹ بھریں گے، پھر انہیں اس کے اوپر سے کھولتے ہوئے پانی کا آمیزہ ملے گا۔“

یہ درخت جہنم کی تہہ سے، جو کہ جہنم کا بدترین حصہ ہے، نکلتا ہے، وہیں نشوونما پاتا ہے اور پھر جہنمیوں کی خوراک بنتا ہے۔ وہ اسی کا پھل کھائیں گے اور جس قدر کھائیں گے اسی قدر ان کی بھوک بڑھتی جائے گی اور پھر جب وہ پیاسے ہوں گے تو کھولتا ہوا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا اور یہی اہل جہنم کی خوراک ہو گی۔

نیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ○ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ○ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ○ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ○فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ○هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ○ (سورۃ الواقعۃ: ۵۱ تا ۵۶)

”پھر اے جھٹلانے والے گمراہو، تم لوگوں کو ایک ایسے درخت میں سے کھانا پڑے گا جس کا نام زقوم ہے، پھر اسی سے پیٹ بھرنے ہوں گے، پھر اس کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی پینا پڑے گا، اور پینا بھی اس طرح جیسے پیاس کی بیماری والے اونٹ پیتے ہیں، یہ ہو گی جزا و سزا کے دن ان لوگوں کی مہمانی۔“

یہ آیات مبارکہ ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو حق کو ضلالت اور گمراہی سمجھ لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں ان کے انجام سے آگاہ فرما رہے ہیں کہ تمہیں زقوم کے درخت سے ہی کھانا ہو گا اور اوپر سے کھولتا ہوا پانی اس طرح پینا ہو گا جیسے اونٹ پیتے ہیں۔ اونٹوں کو بعض مرتبہ ایک ایسی بیماری لاحق ہو جاتی ہے کہ وہ پانی پیے چلے جاتے ہیں مگر ان کی پیاس نہیں بجھتی، پیاس بجھانے کی چاہت میں وہ اس قدر پانی پی لیتے ہیں کہ اس سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اہل جہنم کے بارے میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ وہ انہی اونٹوں کی مانند پانی پییں گے، اور پانی بھی کون سا؟ کھولتا ہوا پانی۔ جس قدر وہ پیتے جائیں گے، ان کی پیاس اسی قدر بڑھتی جائے گی۔

اہل جہنم کے مشروبات

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جہنمیوں کے پینے کے لیے مختلف چیزوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں سے چار کا ذکر ہم یہاں کریں گے:

۱. **الحمیم:** کھولتا ہوا پانی
۲. **غسّاق، غسلین:** جہنمیوں کے زخمی جسموں سے بہنے والے مائع ہائے مختلف
۳. **الصدید:** زخموں سے بہنے والی پیپ۔
۴. **المھل:** کھولتا ہوا تیل

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

هٰذَا فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ○وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ○ (سورۃ ص: ۵۷، ۵۸)

”یہ ہے کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اس کا مزہ چکھیں۔ اور ان طرح طرح کی چیزوں کا جو اسی جیسی (تکلیف دہ) ہوں گی۔“

حمیم کھولتا ہوا پانی ہے اور امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ غسلین اور غسّاق ایک ہی چیز ہیں، یعنی جہنمیوں کے زخموں سے بہنے والا لہو اور پیپ اور ان کے جلے ہوئے جسموں سے بہنے والا مائع، یہی جہنمیوں کا مشروب ہو گا اور یہی انہیں پلایا جائے گا۔ نیز اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ○ (سورۃ الکھف: ۲۹)

”اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو گا، چہروں کو بھون ڈالے گا، کیسا برا ہو گا وہ پانی اور کیسی بری ہو گی وہ جگہ۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مسلم شریف کی حدیث ہے:

كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ إِنَّ عَلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ عَهْدًا لِمَنْ يَشْرَبُ الْمُسْكِرَ أَنْ يَسْقِيَهُ مِنْ طِينَةِ الْخَبَالِ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَمَا طِينَةُ الْخَبَالِ؟ قَالَ: عَرَقُ أَهْلِ النَّارِ أَوْ عُصَارَةُ أَهْلِ النَّارِ

”ہر نشہ آور چیز حرام ہے، بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو شخص نشہ آور چیز پیے گا، اسے اللہ تعالیٰ طینۃ الخبال پلائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! طینۃ الخبال کیا چیز ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: دوزخیوں کا پسینہ۔“

دنیا میں نشہ آور اشیاء استعمال کرنے والوں کو جہنم میں اہل جہنم کا پسینہ پینے کے لیے دیا جائے گا۔

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْلِهِ (وَيُسْقَى مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ يَتَجَرَّعُهُ) قَالَ: يُقَرَّبُ إِلَى فِيهِ فَيَكْرَهُهُ فَإِذَا أُدْنِيَ مِنْهُ شَوَى وَجْهَهُ وَوَقَعَتْ فَرْوَةُ رَأْسِهِ فَإِذَا شَرِبَهُ قَطَّعَ أَمْعَاءَهُ حَتَّى تَخْرُجَ مِنْ دُبُرِهِ، يَقُولُ اللَّهُ: وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ، وَيَقُولُ: وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ (جامع ترمذی)

(بقیہ صفحہ نمبر ۶۰ پر)

فکر و منہج

خطوط سُوئے مغربِ اسلامی

شیخ ابو بصیر ناصر الوحیشی رحمۃ اللہ علیہ / ترجمہ: مفتی محمد متین مغل

عرضِ مترجم

یہ دو مختصر خطوط جہاں ایک طرف جہادی قیادت کے عصری فہم اور سیاسی بصیرت کو واضح کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف اتباعِ شریعت اور نفاذِ شریعت کی بابت ان کا دوٹوک موقف بھی واضح کرتے ہیں، اس مسلکِ اعتدال کی بابت بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ”ہر ہوسنا کے نداند جام وسندان باختن“، اور یہ حق کی راہوں میں تکالیف جھیلنے پر ملنے والا الٰہی انعام ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ (سورۃ العنکبوت:٦٩)

”اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے۔“

ان اہلِ حق نے جہاں ایک طرف معاصر خوارج کی (رحم سے خالی، عقوبات میں منحصر خود ساختہ شرعی تعبیر) کو رد کیا ہے تو دوسری طرف اسلام کے اس امریکی واستشراقی نسخے (رینڈ کارپوریشن کی اصطلاح میں: سِول ڈیموکریٹک اسلام) کو بھی مسترد کیا ہے جس میں اقامتِ حدود، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا ہے۔ افراط و تفریط سے پاک اہلِ سنت کے اس اصیل منہج کو اپنانے کی قیمت کاتب و مکتوب الیہ ہر دو حضرات نے خون دے کر چکائی ہے، یہ خزینہ اس قابل ہے کہ اسے حرزِ جاں بنایا جائے، اس کی مفصل شرح کی جائے، ان مفاہیم کو عام کیا جائے۔

اللہ کریم کاتب و مکتوب الیہ کی طرح مترجم کو بھی اپنی راہ میں مقبول شہادت دے۔ آمین

نوٹ: مترجم نے متن میں جو توضیحی عبارت دی ہے اسے چوکور[] چوکھٹ میں درج کیا ہے، نیز سارے حواشی مترجم کی طرف سے اضافہ کیے گئے ہیں، اصل متن کا حصہ نہیں۔

پہلا خط

بسم اللہ الرحمان الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء و المرسلین

امابعد!

محبوب شیخ اور باصلاحیت امیر ابو مصعب عبد الودود حفظہ اللہ کے نام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ میرا یہ خط آپ تک پہنچے تو آپ خیریت سے ہوں، نعمتوں میں ہوں اور ایک کے بعد دوسری فتح کی جانب گامزن ہوں۔ [آمین]

مغربِ اسلامی سے فتح کی بادِ نسیم ہم تک پہنچی اور اس نے اہلِ مشرق کے مشامِ جاں کو معطر کر دیا، اپنے اسلاف کی فتوحات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا، آپ نے ہمارے اور اہلِ اسلام کے دلوں کو خوش کر دیا، اللہ آپ کی فتح اور اقتدار کے جھنڈوں کو بلند رکھے۔ [آمین]

ہمارے محبوب شیخ! گو ہمارے سامنے مالی اور ٹمبکٹو کی فتوحات کی مکمل تفصیل نہیں، لیکن [اجمالی طور پر] ہمیں معلوم ہے کہ یہ آپ کا کارنامہ ہے، آپ کے جہاد اور ثابت قدمی کی برکت ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ آپ [یعنی تنظیم القاعدۃ برائے مغربِ اسلامی] اور انصار الدین[1] دو الگ [لیکن برادر جہادی] جماعتیں ہیں یا آپ بھی ہماری طرح ہیں یعنی القاعدۃ برائے جزیرہ عرب اور انصار الشریعۃ! [جو بظاہر دو تنظیمیں ہیں، لیکن دراصل ایک ہیں]

ہمارے معزز شیخ! اللہ نے آپ کے ہاتھ کئی علاقے فتح کروا دیے ہیں، آپ کے زیرِ اقتدار علاقے اسلامی سلطنت کا ایک ماڈل و نمونہ ہیں۔ لوگ اور ساری دنیا آپ کے اگلے اقدام کو دیکھ رہی ہے کہ آپ کیسے اپنی سلطنت کو چلاتے ہیں؟ دشمن تو آپ کی ناکامی کی تاک میں بیٹھا ہے اور آپ کے سامنے رکاوٹیں بھی کھڑی کر رہا ہے، تاکہ لوگوں کے سامنے یہ ثابت کر سکے کہ مجاہدین صرف جنگ لڑ سکتے ہیں، ملک چلانا اور لوگوں کے مسائل حل کرنا ان کے بس میں نہیں۔

میرے معزز شیخ! آپ کو معلوم ہے کہ لوگ دین سے بہت دور جا چکے ہیں، امت کی کئی نسلیں ایسی ہیں کہ وہ دین کے محض کچھ احکام کو ہی جانتی ہیں، ان پر روزگار کے وسائل اتنے

[1] دسمبر ۲۰۱۱ء میں شمالی مالی میں شیخ ایاد الغالی نے اس کی بنیاد رکھی، اس وقت القاعدہ سے تعلق کی نفی کی گئی تھی، بعد ازاں مارچ ۲۰۱۷ء میں جب انصار الدین کے ساتھ دیگر جماعتوں کے اتحاد کے نتیجے میں ’جماعت نصرۃ الاسلام والمسلمین‘ تشکیل دی گئی تو اس وقت دیگر قائدین کی موجودگی میں منتخب امیر شیخ ایاد الغالی نے تنظیم القاعدہ کی بیعت کی۔ یہ ویڈیو جماعت نصرۃ الاسلام والمسلمین کے رسمی اعلامی ادارے (الزلاقۃ) سے نشر کی گئی۔

تنگ کر دیے گئے ہیں کہ زندہ بر قرار رکھنے کے لیے خوراک کے حصول کے لیے ہی سر گرداں رہتے ہیں[دین کیا سیکھیں اور اس کے تقاضے کیسے بجالائیں]،ان پر حکام بھی ایسے مسلط ہوئے جنہوں نے دہائیوں پر پھیلی طویل اور منظم سازشوں سے انہیں دین سے دور کیا۔ سو اس سب خرابی کے بعد اللہ نے امت کو آپ جیسے حکمرانوں سے نوازا ہے،لہذا آپ اپنی رعایا کے ساتھ احسان والا معاملہ کریں،نرمی ورحم دلی کے پہلو کو ترجیح دیں، دنیا کا ساز و سامان بڑا حقیر ہے،اسے خرچ کرکے ان کے دل جیتیں،ان کے کھانے پینے کی ضروریات کا خیال رکھیں، بجلی و پانی کی فراہمی اور صحت کے مسائل پر توجہ دیں، یاد رکھیں کہ ہماری عوامی حمایت میں ان چیزوں کا بڑا اثر ہے،اس سے وہ ہماری فکر کو بھی اپنا لیتے ہیں اور ہماری صف میں شامل ہو جاتے ہیں،اسی عرصے میں ہمارے اپنے تجربے کا سادہ سا حاصل بھی یہی ہے۔[2]

لوگوں کو دین پر لانے کے معاملے میں مرحلہ وار حکمتِ عملی اپنائیں، یہ شریعت ہی کا سکھایا ہوا سبق ہے، مثلاً: ہم ایسے لوگوں کو نشہ آور چیزوں کے استعمال پر زدو کوب نہ کریں، جو ابھی سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتے، تو سب سے پہلے سب سے بڑے معروف کو قائم کرنا ضروری ہے، یعنی دین کی اقامت اور توحید کے احکام کی ترویج[عقائد کی تصحیح اور معاشرے کے عمومی مزاج کو دینی ڈھب پر لانا]، اسی طرح ہماری اولین ترجیح ان کو سب سے بڑے منکر سے روکنا ہو گی، پھر اس سے چھوٹے منکر کی باری آئے گی اور پھر اس سے چھوٹے کی [یوں درجہ بدرجہ،الاھم فالاھم کی ترتیب پر]،سو جو منکر معاشرے میں بہت عام ہو چکا ہو تو اس کی بابت پہلے لوگوں کو نرمی سے، حکیمانہ دعوت سے سمجھایا جائے گا، پھر ایک معتدبہ وقت گزرنے کے بعد ڈانٹ ڈپٹ اور سختی کا لہجہ اپنایا جائے گا، اور آخر میں[منکر کی حقیقت اور اس کی مضرت واضح ہو جانے کے بعد] اس کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا، تو سب سے پہلے ہم توحید کے جوانب[اصلاحِ عقائد] پر زور دیں گے اور اس کی ضد یعنی شرک وسحر کا راستہ روکیں گے، پھر حدود اور دیگر کبیرہ گناہوں کا سدِباب ہو گا۔[3]

حالتِ جنگ میں حد قائم کرنے کا مسئلہ سلف میں مشہور ہے، اس کی بنیاد پر موجودہ صورتحال [یعنی جہاد کے نتیجے میں کم رقبے پر قائم ہونے والی، کم وسائل کی حامل کمزور جہادی حکومتیں جن کے بقا کے اسباب کم اور کچھ عرصے میں ختم ہونے کے امکانات زیادہ ہیں[4]] میں محدود اجتہادی فتوے کی ضرورت ہے، ہمیں جب اقتدار ملا تو شروع میں ہمارا اجتہاد یہ تھا کہ اقامتِ حد کو فی الحال مؤخر رکھا جائے، کچھ وقت گزرنے کے بعد جب لوگ کے دلوں میں توحید راسخ ہو گئی [دین داری غالب ہو گئی، تصحیح عقائد اور اصلاحِ اعمال کا کام ایک حد تک ہو گیا] تو پھر ہم نے اقامتِ حدود کا فریضہ بھی جاری کر دیا۔ البتہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بعض لوگ جو یہ سمجھتے ہیں یا انہیں سمجھایا گیا ہے کہ شریعت کے حاکم ہونے کا ایک ہی مطلب ہے یعنی حدود کا جاری ہونا تو یہ بات غلط ہے[یعنی جب تک کوئی حد جاری نہ ہو تو یہی سمجھا جائے کہ ابھی شریعت مکمل نافذ نہیں ہوئی]، تو لوگوں میں رائج اس غلط اصطلاح اور سوچ کو ٹھیک کرنا ضروری ہے۔

کوشش کریں کہ جہاں معاملہ مشکوک ہو وہاں حد جاری نہ کریں[یہی دین کی دی ہوئی تعلیم ہے[5]]، معاشرے ایسے جرائم سے خالی نہیں ہوتے، البتہ جہاں مجبور ہو جائیں[کہ کوئی شبہ نہ ہو اور قابلِ حد جرم ثابت ہو جائے] تو اور بات ہے۔ ہم نے لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا اور اس کے نتائج بہت اچھے نکلے، ہم سے لوگوں کی محبت اور ہمارے دشمنوں سے ان کی نفرت میں اضافہ ہوا اور وہ خود دینی واجبات پر عمل پیرا ہو گئے۔ معاشرہ ظاہری طور پر بھی بڑے اور سنگین گناہوں سے پاک ہو گیا، رہے نسبتاً کم درجے کے گناہ اور وہ معصیتیں جن کے گناہ ہونے میں اختلاف ہے تو ان میں مزید صبر، حوصلے، نرمی اور حکمت کی ضرورت ہے۔

یہ کچھ باتیں میں نے ذکر کی ہیں جو لوگوں کے ساتھ ہمارے تعامل کا حاصل ہے، ہم نے چاہا کہ آپ کو اس سے باخبر کر دیں، ورنہ آپ تو ہمارے بڑے اور بزرگ ہیں، ہماری مثال 'سورج کو چراغ دکھانے' والی ہے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ کو برکات سے نوازے۔[آمین]

ہمیں مزید اپنے احوال سے باخبر کریں، ہم بڑی شدت سے منتظر ہیں۔

راقم السطور: آپ کا بھائی ابو بصیر (جزیرہ عرب)

۲۰ جماد الآخر ۱۴۳۳ھ [۱۱ مئی ۲۰۱۲ء]

---

[2] مئی ۲۰۱۱ء میں القاعدہ جزیرۂ عرب نے یمن میں زنجبار کے ساحلی علاقے کو آزاد کروا کر وہاں شریعت کے مطابق حکمرانی کی۔ شیخ ابو بصیر شہید رحمہ اللہ یہاں اس جانب اشارہ کر رہے ہیں۔

[3] یہاں یہ واضح رہے کہ شیخ کسی ادارے یا حکومت کو کوئی لائحہ نہیں دے رہے، بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مسلمہ اصول و شروط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ رہنما اصول بتا رہے ہیں جن کی پاسداری کی ایک نوزائیدہ اسلامی حکومت کو بالخصوص ضرورت ہے۔

[4] درحقیقت یہ عارضی جہادی حکومت اور وقتی سلطہ جہاد کا ایک ایسا مرحلہ ہے جس میں مجاہدین کی دعوت معاشرے میں پھیل کر اپنی جگہ بنا لیتی ہے، لیکن اصل حکومت کا مرحلہ ابھی دور ہوتا ہے، یہ وقتی اقتدار تو جنگ ہی کا ایک رخ ہوتا ہے، جسے اپنانے میں جلد بازی یا اسے چھوڑنے میں تاخیر سخت مہلک ہوتی ہے، اس ضمن میں امارت اسلامی افغانستان، تنظیم القاعدہ برائے جزیرہ عرب، حرکۃ الشباب (تنظیم القاعدہ برائے مشرقی افریقہ) اور تنظیم القاعدہ برائے مغرب اسلامی کا طرزِ عمل انتہائی مفید ہے۔ دیگر جہادی تحریکات کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے کہ کب علاقہ پکڑنا چاہیے اور کب چھوڑ کر دوبارہ گوریلا جنگ کی طرف جانا چاہیے۔ بالخصوص حرکۃ الشباب کا تجربہ اس بابت انتہائی مفید ہے۔ یہ حضرات، جب بھی افریقی کفری اتحاد کی طرف سے بڑے پیمانے پر فوج کشی ہوتی ہے، تو آزاد علاقوں سے پسپا ہو کر دشمن کو آنے کا موقع دیتے ہیں اور پھر ان کی جو درگت بناتے ہیں تو اسے بھاگتے ہی بن پڑتی ہے۔

[5] ادرؤو الحدود عن المسلمين مااستطعتم [جامع الترمذی، كتاب الحدود، باب ماجاء فی درء الحدود]

دوسرا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین

امابعد!

محترم شیخ اور باصلاحیت امیر ابو مصعب عبد الودود حفظہ اللہ کے نام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اللہ آپ کو [رمضان کے] اس مہینے میں برکات سے نوازے، ہمارے اور آپ کے نیک اعمال کو قبول کرے، دعا گو ہوں کہ یہ خط خوش و خرم اور بہترین حالت میں آپ تک پہنچے۔[آمین]

ہم اپنے سابقہ تجربے کے واقعات کا ایک خلاصہ آپ کے سامنے رکھتے ہیں، معزز شیخ! ہمارا تجربہ دروس وعِبَر سے بھرپور تھا۔ جماعتیں اپنی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر عروج و اقتدار کے اس مرحلے سے ضرور گزرتی ہیں۔ یہ ہم پر اللہ کا احسان تھا کہ ہم نے لگ بھگ ایک سال اللہ کی شریعت کے مطابق حکومت کو چلایا۔ ہم نے لوگوں کو اور انہوں نے ہمیں قریب سے دیکھا، پہچانا، لوگوں نے ایسے اہلکار اور عہدے دار دیکھے جو ان کے لیے نامانوس تھے اور انہوں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اعلیٰ عہدے دار غریب مسکین کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہے، اس کے ساتھ چٹائی پر بیٹھا بات کر رہا ہے، نہ کوئی ڈیوڑھی اور نہ دربان، امیر خود مسجد، سڑک یا بازار میں گھوم کر لوگوں کی ضروریات پوری کر رہا ہے، مظلوم کو انصاف اور حق دار کو اس کا حق دلوا رہا ہے، عزت و ناموس کی تعظیم و توقیر کر رہا ہے۔ لوگوں کو یہ بھی پتہ چلا کہ یہ مجاہدین اللہ کے منہج پر کس قدر ثابت قدم ہیں اور یہ کہ شریعت ہر زمانے اور جگہ کے مسائل کے حل کی صلاحیت رکھتی ہے، بلکہ اسے چھوڑ کر تو عدل قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کے ساتھ گزرے ہمارے وہ دن بڑے قیمتی تھے جو شاید وہ دوبارہ نہ دیکھ سکیں۔ ہم نے اپنے مجاہدین اور مسئولین کو حکومت چلانے اور جنگوں میں آزمایا، یوں ہمیں کئی طرح کے تجربات حاصل ہوئے، سو اب ہمارے پاس ہر معاملے میں ذمے داری نبھانے والے لوگ موجود ہیں، اور اس کے علاوہ بھی بے شمار نعمتیں حاصل ہوئیں (للہ الحمد)۔ ان میں ایک بڑی نعمت یہ تھی کہ میڈیا کے زور پر مجاہدین کے خلاف جھوٹے الزامات پر کھڑی گئی ساری عمارت دھڑام سے زمیں بوس ہو گئی، لوگوں کو میڈیا کے دروغ و دجل کا پتہ چل گیا اور یہ بھی کہ میڈیا کیسے افواہوں کے ذریعے خوف پھیلا کر حوصلے توڑتا ہے، حقیقت کھل کر سب کے سامنے آگئی۔

پھر جب مشرق و مغرب کے دشمنوں نے متحد ہو کر ہم پر دھاوا بولا، گھمسان کے معرکوں اور مصیبت کی گھاٹیوں میں ہمارے مجاہد ساتھی پہاڑوں کی طرح ثابت قدم رہے، ان کی استقامت کو الفاظ کا جامہ پہنانا آسان نہیں، اس کا تصور کرنا بھی کافی مشکل ہے، وہ صبر و ثبات دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن چار ماہ بعد ہم نے پسپائی کو ترجیح دی، حملہ شدید تھا اور اپنے مقاصد پورے کیے بغیر دشمن اسے روکنے والا نہیں تھا، کیونکہ وہ ہماری پیش قدمی سے ڈر گیا تھا، لوگ ہم سے محبت کرنے لگے تھے اور ہمارے نفاذِ شریعت کے طریقے کو زیرِ اقتدار علاقوں میں بڑی پذیرائی ملی تھی، سو عالمِ کفر نے متحد ہو کر ہم پر حملہ کیا۔ اگر ہم اس حملے کے بالمقابل سینہ سپر رہتے تو یہ معرکہ طویل ہوتا اور ہمیں جانی و مالی لحاظ سے اس کی بھاری قیمت چکانی پڑتی، اور یہ بات ہمارے مقصد کے خلاف تھی، نیز عامۃ المسلمین کے گھروں پر بمباری کر کے انہیں دربدر کر کے بھی دشمن ہم پر دباؤ بڑھاتا۔ تو الحمد للہ ہم پیچھے ہٹ گئے، یہ بڑا بروقت اور درست فیصلہ تھا اور دشمن نے جو مجاہدین کی قیادت کو قتل کرنے اور گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا وہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

ایک سال تک حکومت کی جو قیمت ہمیں چکانی پڑی وہ کل یہ تھی: تقریباً پانچ سو شہید، سات سو زخمی، دس کے لگ بھگ ساتھیوں کے ہاتھ یا پاؤں کٹے، اور مالی اخراجات تقریباً دو کروڑ ڈالر۔

اب ہماری حالت پہلے سے بہت بہتر ہے، بلکہ موازنہ ہی نہیں بنتا، پہلے جنگ ہمارے خلاف برپا تھی، حریف ہمارے خلاف ایک ہو چکے تھے اور ہم ان کا سامنا کر رہے تھے، اب علاقہ پکڑنے کے بعد یہ حریف دوبارہ آپس میں الجھ گئے ہیں۔ یہ ہمارے لیے گوریلا جنگ کر کے حساب برابر کرنے کا بہترین موقع ہے اور یہ کام ہم نے پسپائی کے اول روز سے شروع کر رکھا ہے۔ ہم نے اس جنگ کے کمانڈر کو قتل کیا اور الحمد للہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ جنگ کا اکثر بلکہ تمام خرچ غنیمتوں سے پورا ہوتا ہے، غنیمت کا تقریباً نصف قیدیوں کے فدیے سے حاصل ہوتا ہے۔ بخدا! یہ تو آسانی سے حاصل ہونے والی غنیمت ہے، اور اگر یہ کہنا درست ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ 'نفع بخش تجارت' اور 'قیمتی خزانہ' ہے۔

دشمن کا سب سے اہم اسلحہ امن کمیٹیاں تھیں، یہ کرائے کے غنڈے ہمارے اقتدار سے متاثر ہوئے تھے اور ان کی لوٹ مار بند ہو گئی تھی، نیز کچھ جعلی پیر واخوانی، چند سروری اور نام نہاد سلفی بھی اس میں شامل تھے، ان متضاد عناصر کو دشمن نے اکٹھا کر کے منظم کیا، تاکہ علاقے کے لوگوں پر مشتمل ایک منظم فوج بنائے۔

ان کا دوسرا بڑا اسلحہ میڈیا تھا، جھوٹ عام کرنا اور افواہیں پھیلانا، یہ میڈیائی حملہ اگر عسکری حملے سے سخت نہیں تھا تو کم بھی نہیں تھا۔

ان کا ایک اسلحہ جاسوس تھے کہ ان کے ذریعے مجاہدین کے اندر نقب لگائی جائے، انہی جاسوسوں کی وجہ سے دشمن ڈرون طیاروں کے ذریعے اکثر قائدین کو شہید کرنے میں کامیاب ہو سکا، پس قائدین اور رجالِ کار کی بابت اللہ سے ڈریں، ان کی امنیت و راز داری میں سختی سے کام لیں، نئے شامل ہونے والے افراد سے ہوشیار رہیں اور احتیاط کریں۔

اے ہمارے معزز شیخ! ہمارا اہم ترین اسلحہ میڈیا و اعلام ہے۔ اس اہم محاذ کی بابت اللہ سے ڈریں، یہاں اسی کو مقرر کریں جو مدعا بخوبی بیان کر سکے، پیغام کو پہنچا سکے، جہاد کے مراحل

کو پہچانے اور ہر مرحلے پر وہی بات کرے جس کی جہاد کو ضرورت ہے۔ ہر ساتھی یا مسئول کو میڈیا پر آنے اور بیان دینے کی اجازت نہ ہو، تاکہ آپ اپنی صورتحال کی مناسبت سے (نہ کہ اپنی امنگوں کے مطابق) معاملات کو کنٹرول میں رکھ کر چلائیں، ہم نے اپنے تمام ساتھیوں اور ذمے داروں کو میڈیا پر آنے اور بیان دینے سے منع کر رکھا ہے، سوائے اس کے جس کو ہم مناسب سمجھیں [اور اجازت دیں] اور وہ اپنے مخصوص موضوعات پر بات کرے [جس موضوع پر بات کرنے کا اسے کہا جائے]، یہ سب جماعت کی سمت کو درست رکھنے کے لیے ہے، نیز اس لیے کہ قائدین میں خود پسندی پیدا نہ ہو [جو کہ میڈیا پر آنے کا ایک عمومی جانبی اثر (side effect) ہے] اللہ سے دعا ہے کہ سب کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔

میرے محترم! ہمارے اقتدار کی شروعات میں قیادتِ عامہ کے بھائیوں نے ہمیں نصیحت کی کہ ہم اسلامی امارت یا سلطنت کے اعلان سے گریز کریں۔ اس کے کئی اسباب ہیں، ایک یہ ہے کہ اس طرح ہم لوگوں کے ساتھ حکومت والا معاملہ کرنے کے پابند نہیں ہوں گے، جس سے ہمیں کئی احکام [اور ذمے داریوں] سے چھوٹ ملے گی، کیونکہ ہماری حکومت بہر حال ایک کمزور حکومت تھی، ہمارے خلاف عالمی کفر کے اتحاد کی صورت میں اس کے سقوط کا قوی امکان تھا [اور ایسا ہی ہوا بھی]، یہ اعلان نہ کرنا اس لیے بھی مناسب ہے تاکہ لوگ جہاد سے مایوس ہو کر یہ نہ سوچنے لگیں کہ جہاد سے قائم ہونے والی ہر حکومت لازماً سقوط کرے گی، سو جہاد کارگر وسیلہ نہیں، اس کے علاوہ بھی اسباب ہیں۔ پھر جب ہم سمٹنے پر مجبور ہوئے تو ہم نے اس رائے کی برکت و درستگی کو دیکھا، کیونکہ ہم نے سرے سے کوئی اعلان ہی نہیں کیا تھا، صومالیہ والے بھائیوں کی بھی یہی نصیحت ہے، وہاں کی اکثر زمین پر اقتدار کے باوجود انہوں نے حکومت کا اعلان نہیں کیا۔

محترم امیر! کھلے محاذ اور مستقل مورچوں کی نظامی جنگ کے طویل معرکوں نے ہمیں نچوڑ کر رکھ دیا ہے، اگرچہ اس طریقِ جنگ کا اپنا فائدہ ہے، لیکن مال، رجالِ کار اور اسلحہ بھی اس میں بہت لگتا ہے۔ ہم نے اتنا اسلحہ غنیمت میں حاصل کیا تھا کہ ہمارے خیال میں وہ کئی سالوں تک ہمارے لیے کافی ہو گا۔ لیکن جب ہم پسپا ہوئے تو اپنا سارا اسلحہ ہمیں خریدنا پڑ رہا ہے [وہ سارا ایمونیشن و ذخیرہ چار ماہ کی جنگ میں استعمال ہو گیا]، سو ہم آپ کو نصیحت کرتے ہیں کہ طاقت نچوڑنے والی طویل جنگوں میں نہ الجھیں، پہاڑوں، جنگلوں اور صحراؤں میں اپنی پرانی امنیتی جگہوں کی نگہداشت کریں [وہ دوبارہ بھی کام آئیں گی]، بلکہ بدترین صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے مزید بھی ایسے خفیہ ٹھکانے تیار کریں، اپنی پسپائی سے ہم نے یہ سبق لیا ہے۔

شیخ! ہم آخر میں اس بات پر معذرت چاہتے ہیں کہ ہم استاد کی طرح آپ کو نصیحت کر رہے ہیں، حالانکہ ہمارا یہ مقام نہیں [یہ مقام آپ کا ہے]، یہ تو کچھ عملی تجربے تھے، جن سے ہمیں فائدہ ہوا، ان کی کارگزاری ہم نے آپ کے سامنے پیش کی، کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حکمت کی بات اپنے سے زیادہ سمجھدار تک نقل کر کے پہنچاتے ہیں[٦]، یہ جہاد [جہاں کہیں ہو رہا ہے] پوری امت کا ہے، اس کی حفاظت کرنا اور خیال رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔

امید ہے کہ اللہ ہمارے ہاتھوں خلافت کو دوبارہ قائم کرے اور آپ کی دعا کی برکت سے ہماری کوششوں میں برکت ڈالے۔

میں نے جمادی الثانیہ میں آپ کی طرف خط بھیجا تھا اور مجھے یہ معلوم کر کے تشویش ہوئی کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا، اب میں ایک بار پھر آنجناب کی خدمت میں خط ارسال کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں تو وہ سابقہ خط بھی ہمراہ لف ہے، اس کے ساتھ ہی خراسان سے بھائیوں کے خطوط بھی ہمراہ ہیں۔

تمام بھائیوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچے، بالخصوص ٹمبکٹو اور ازواد کے مردانِ میدان کو!

آپ کا قدردان بھائی: ابو بصیر (جزیرہ عرب)

١٨ رمضان ١٤٣٣ھ [٦ اگست ٢٠١٢]

☆☆☆☆☆

بیت المقدس کے کھونے کا سبب کون؟

"ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم حقائق کا بہادری سے سامنا کریں اور حقائق سے نظریں نہ چرائیں۔ پس یہ بات مسلَّم ہے کہ القدس کے کھونے اور اس میں ہونے والے واقعات کا انتہائی اہم سبب ہم خود ہیں۔ ہماری اپنی غیر ذمہ داری، القدس کے معاملے سے دست برداری، دنیا کی محبت، اپنے بچاؤ میں ہی عافیت سمجھنا، اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینا اور سارا الزام امریکیوں اور یہود کو یا ہم پر ان کے مسلط کردہ حکمرانوں کو ہی دینا، القدس کو کھونے کے اہم اسباب ہیں۔ ہم اس لیے القدس کو کھونے کے ذمہ دار ہیں کیوں کہ ہم نے امریکہ، یہود اور ان کے پروردہ حکمرانوں کے خلاف جہاد کے بجائے ان کی اطاعت اختیار کر لی۔ ہم نے غلامی کو قبول کیا جو ہمارے کچھ لوگوں کے اندر رچ بس گئی اور نسل در نسل ان کو وراثت میں ملی۔ یہاں تک کہ ہمارے اندر سے ایسے لوگ نکلے جو کفار سے قربت اور ان کے ساتھ سلامتی ہی سے پیش آنے کے مناہج کی پیروی کرنے لگے جس کی ناکامی کا انہیں خود بھی یقین ہے۔ بات یہاں تک آ پہنچی کہ ہم میں سے ایسے لوگ نکلے جو کہتے ہیں کہ امریکہ کے خلاف جہاد فساد ہے۔ حالانکہ امریکہ اپنی فوجوں کو مسلمان ملکوں کی جانب اکٹھا کر چکا ہے۔ ان کی باتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کفار کبھی مسلم ممالک پر حملہ آور ہوئے ہی نہیں تھے، جیسے کہ گیارہ ستمبر سے قبل امریکہ کے فوجی اڈے مصر، اردن اور جزیرۃ العرب میں تھے ہی نہیں! جیسے ہمیں اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ اسرائیل امریکہ سے باہر امریکہ کا سب سے بڑا فوجی اڈا ہے۔"

شیخ ایمن الظواہری

(بحوالہ بیان: بیت المقدس کے کھونے کا سبب کون؟)

[٦] فان الشاهد عسى ان يبلغ من هو اوعى له منه [صحیح بخاری، کتاب العلم]

جنگی اسٹریٹجی کے ۳۳ رہنما اصول

فضیلۃ الشیخ محمد صلاح الدین زیدان (سیف العدل)

بسمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيم

۷-حوصلے (Morale) کی اسٹریٹجی

تکافل، یکجہتی اور قربانی کی حقیقی روح

اللہ پر ایمان، واضح منہج، ربانی قیادت، مخلصانہ اخوت، راہیوں کی دیانت داری، عدل کا فروغ، نوجوانوں کے جوش و ہمت اور بزرگوں کی حکمت کے درمیان ہم آہنگی، ذات کی نفی اور ٹیم سے وابستگی، پیش گوئیاں اور بشارتیں، کارنامے اور انہیں انجام دینے والے ابطال، پرچم اور نعرے، علامات اور نمونۂ عمل (رول ماڈل)، یہ سب حوصلہ / مورال بڑھانے کی بنیادیں ہیں اور انہی سے حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ پس ہم ایک امت ہیں جسے اکٹھا کیا گیا ہے: ایک خدا، ایک ہی نبی، ایک کتاب، ایک پیغام، ایک قبلہ اور ایک ہی امت کے ذریعے۔

اسلام نے حوصلے یا روحِ معنوی کو بہت اہمیت دی ہے اور مسلمان فرد کی ''میں'' کو امت کے ''ہم'' میں ڈھالنے پر کام کیا ہے، اور اس کا ثمرہ دنیا میں اجتماعی کامیابی قرار دیا ہے، اور دنیا میں سربلندی دین کے لیے رکھی اور اس کے لیے غلبہ اور انسانوں کے لیے ہدایت کو مقصد [یعنی رضائے الٰہی] تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا، اور واضح کیا کہ عزت اور وقار کا اچھا مفہوم صرف دین کے ذریعے اور پوری امت کے لیے ہوتا ہے، کسی امیر، حاکم یا ان کے وارثوں کی جاگیر یا پہنایا ہوا لباس نہیں، ہم وہ قوم ہیں جسے اللہ نے اسلام کے ذریعے عزت دی، اور اسلام نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ فرد کے لیے حقیقی اجر آخرت میں ہے اور دنیا کے حصے (لذتوں) سے بے رغبتی کی ترغیب دی اور اس سے سبکدوشی کو پاکیزہ اور صاف راستے کی نشانیاں قرار دیا۔

☆☆☆☆

پس حوصلے یا روحِ معنوی بلند کرنے کا مثالی طریقہ یہ ہے کہ دین کو ہی رمز و علامت بنایا جائے اور فرد، جماعت، سلطنت، وسائل، اشیاء اور آلات محض ایک دائرے کے اجزا ہوں جو باہم تکمیل پا کر بنیادی قضیے کی خدمت کریں، یعنی زبان اور تلوار دونوں سے اللہ کی طرف دعوت۔ دین فرد کے ضمیر کو 'کُل' کے ساتھ جوڑتا ہے اور قربانی و تواضع کے ذریعے اس کا تزکیہ کرتا ہے تاکہ اس کے سینے کو خود غرضی (انانیت)، تکبر اور غرور سے خالی کر دے، غیب پر ایمان کو راسخ کرے اور یہ یقین پیدا کرے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے، اور یہ کہ ان کی دعوت اور ان کا جہاد ایک عادلانہ قضیے اور ایک منصفانہ مقصد کے لیے ہے۔ یوں اجزا جمع ہو کر ایک ہم آہنگ 'کُل' بن جاتے ہیں، اور یہ ہر صاحبِ ایمان نفس اور ہر مومن روح کو سیراب کرتا ہے۔ یہ انہیں اپنے ذاتی مفادات سے نکال لیتا ہے، ایثار و قربانی کے پہلو کو غالب کر دیتا ہے اور انفرادی مفادات کو اجتماعی مفادات کے ساتھ قطع کر دیتا ہے۔ پس عزت و افتخار اسلام کی نصرت میں ہے اور ذلت و رسوائی اسے بے یار و مددگار چھوڑنے یا کسی اور چیز کی مدد کرنے میں ہے۔ چنانچہ فرد کا اپنے دین سے حسنِ التزام اسے اجتماعی ضمیر کے بارے میں نہایت حساس بنا دیتا ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

ایمان ایک نورانی کیفیت ہے، جذبات کی بلندی اور احساس کی لطافت کی حالت، جو فرد کو کُل کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اجتماعی ضمیر کو خالقِ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ وابستگی کی حقیقت کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ خشیت اور شوق کی ایک کیفیت ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ○ (سورۃ الزمر: ۲۳)

''اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، جس کی باتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں اپنے پروردگار کا رعب ہے ان کی کھالیں اس سے کانپ اٹھتی ہیں، پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ذریعے وہ جس کو چاہتا ہے راہِ راست پر لے آتا ہے، اور جسے اللہ راستے سے بھٹکا دے، اسے کوئی راستے پر لانے والا نہیں۔''

یہاں قربانیاں شیریں ہو جاتی ہیں، مشکلات آسان ہو جاتی ہیں، روح بلند ہوتی ہے اور جسم کا فنا ہو جانا، نجات کی ایک کشتی بن جاتا ہے، جو روح کو عالمِ برزخ کی زندگی سے اٹھا کر سبز پرندوں کے قالب میں بسنے تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ ○ (سورۃ آل عمران: ۱۶۹)

''اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں، انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا، بلکہ وہ زندہ ہیں، انہیں اپنے رب کے پاس رزق ملتا ہے۔''

مسروقؒ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی تو انہوں نے فرمایا:

”ہم نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: ’ان کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں ہیں، ان کی قندیلیں عرش کے ساتھ معلق ہیں، وہ جنت (کے میووں) سے جہاں سے چاہتے ہیں کھاتے ہیں، پھر انہیں قندیلوں میں واپس آ جاتے ہیں، پھر ان کا رب ان کی طرف دیکھ کر فرماتا ہے: کیا تم کسی چیز کی خواہش رکھتے ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں: ہم کس چیز کی خواہش رکھیں، ہم جنت میں جہاں چاہیں جاتے اور وہاں سے من پسند چیزیں کھاتے ہیں، رب تعالیٰ ان سے تین مرتبہ یہی سوال فرمائے گا جب وہ دیکھیں گے کہ ان کو چھوڑا نہیں جائے گا، ان سے سوال ہوتا رہے گا تو وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم چاہتے ہیں کہ ہماری روحیں ہمارے جسموں میں لوٹائی جائیں حتیٰ کہ ہم تیری راہ میں پھر شہید کر دیے جائیں، جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھے گا کہ ان کو کوئی حاجت نہیں ہے تو ان کو چھوڑ دیا جائے گا‘۔“ رواہ مسلم۔

☆☆☆☆

کچھ قائدین شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر، علم کے ساتھ یا لاعلمی میں، حوصلہ بلند کرنے کے لیے تعریف اور تزکیہ (سفارش) میں مبالغہ کرتے ہیں، یا انعامات و عطیات میں اور عہدوں کی تقسیم اور اختیارات کی بخشش میں فراخ دلی دکھاتے ہیں، وغیرہ۔ یہ رویہ نُفوس کو تباہ کرتا ہے، عقلوں کو بگاڑتا ہے، ضمیروں کو خریدتا ہے، نورانی کیفیت کو تاریک کرتا ہے اور روحانی معاہدے کو توڑ دیتا ہے۔ یہ طرزِ عمل انہیں اسباب کی دنیا میں بھٹکنے کا موقع دیتا ہے، جہاں نہ تو کوئی اندرونی واعظ ہوتا ہے نہ ہی بیرونی، جو انہیں لوٹا سکے۔ آخر کار قائد پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ اس نے حد سے زیادہ لاڈ پیار سے انہیں بگاڑ دیا ہے، جس نے ان میں خود غرضی، انا کا جذبہ، دنیا کی محبت اور قربانی سے بے رغبتی کو پروان چڑھایا ہے۔ پھر جب قائدین اصلاح کی کوشش میں سزا اور نظم وضبط کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مصنوعی محبت حقیقی نفرت میں بدل جاتی ہے، یا جب وہ خطیبانہ تقاریر یا اجتماعی سرگرمیوں کے ذریعے ان کے ضمیروں کی از سرِ نو تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں محض تمسخر اور حقارت بھرے الفاظ ہی ملتے ہیں۔ اجساد بگڑ چکے ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ روحیں اور ضمیر بھی، جبکہ عقلیں ماؤف ہو چکی ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قائد نے ان کی وفاداری عطیات اور نوازشوں کے ذریعے خریدی، وہ اللہ کے لیے نہیں تھی بلکہ صرف اس کی علامتی حیثیت کے لیے تھی۔ اس نے ان کی وفاداری خریدنا شروع کی تو انہیں بگاڑ دیا، پھر جب ان کا علاج کرنا چاہا تو ان کی دشمنی مول لے لی۔ اب جو بھی تبدیلی ان کی عادت کے خلاف ہو گی، وہ اپنی حاصل شدہ مراعات کو بچانے کے لیے دفاعی رویّے کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ کتنے ہی لوگ لاڈ، دولت اور مال نے بگاڑ دیے۔ اس کا کوئی اصلاحی حل نہیں مگر قیادت اور اس کے قریبی حلقے کی اصلاح کے ذریعے، جو علامتی حیثیت کی خرابی اور رویّوں کی خرابی پر متنبہ ہوں اور ابتدا ہی سے اس طریقے پر عمل کریں جس سے اولین مردوں نے کامیابی حاصل کی تھی۔

☆☆☆☆

ان لوگوں کے علاج کے لیے جنہیں لاڈ، دولت، عہدوں اور قرابت داری نے بگاڑ دیا ہے، ایک راستہ ہے۔ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ حوصلہ اور روحِ معنوی متعدی ہوتی ہے، منفی بھی اور مثبت بھی۔ اس لیے مطلوب یہ ہے کہ انہیں دوبارہ ایسے گروہوں میں مقرر کیا جائے جن کی تربیت درست انداز میں کی گئی ہو، ایسے تربیت یافتہ، ہم آہنگ اور سرگرم گروہ، جو بھٹکی ہوئی روحوں اور منتشر ذہنوں کو اپنی طرف کھینچ لیں اور فطری انداز میں حوصلے بلند کرنے کے لیے ایک صحیح منہج کے مطابق ان کی رہنمائی کریں۔ یہ اجتماعی وجدان خود غرضانہ رویّوں کی طرف ان کی واپسی کی کوشش کو محدود کرتا ہے۔ جو اس کے بعد بھی انکار کرے گا، اسے آسانی سے تنہائی اور برطرفی کا سامنا کرنا پڑے گا، اور یہ وہ آخری چیز ہے جس کی کوئی انسان آرزو کرتا ہے۔

اور تاکہ ہم ایسے سرگرم اور مؤثر گروہ تشکیل دے سکیں جو بحرانوں کو سمیٹنے اور رکاوٹوں سے کامیابی سے گزرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ذیل میں چند ہدایات اور رہنما خطوط پیش کیے جاتے ہیں جنہیں قائدین کو راسخ کرنا یا نافذ کرنا چاہیے:

- غیب پر ایمان اور یہ یقین کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے،
- نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسی عبادات کو وقت پر ادا کرنے کی پابندی،
- دنیا سے بے رغبتی کے اصولوں کو راسخ کرنا اور باہمی تعاون و تکافل اور ایثار و قربانی کی روح کو عام کرنا،
- ایسی سچی قیادت کا نمونہ پیش کرنا جو اسی ماحول میں ان کے ساتھ شریک ہو جس میں وہ چل رہے ہیں،
- فکری وحدت کا حصول،
- جنگ میں فتح کے حصول کے لیے درست اسٹریٹیجی کے مطابق معرکوں میں اترنا،
- مجاہدین کے لیے اعلیٰ درجے کی تربیت فراہم کرنا،
- مناسب اسلحہ اور سازوسامان کی فراہمی،
- باصلاحیت، ہنرمند اور مومن قیادتوں کا تقرر،
- عسکری کارروائیوں کے لیے کامیابی کے عناصر مہیا کرنا،
- ہر طبقے کے لیے مناسب معاش[1]، محنت کرنے والوں کے لیے انعامات،

[1] مالی بنیاد سب کے لیے ایک ہی ہے، پھر اس کے بعد اس کے زیرِ کفالت افراد کی تعداد کو مدنظر رکھا جاتا ہے، اگلا مرحلہ تقدّم (سنیارٹی/Seniority) کا ہے، پھر تجربہ کار اور ماہر افراد کو ترجیح دی جاتی ہے، یہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت ہے جب انہوں سابقین اولین اور بعد میں آنے والوں کے درمیان فرق کیا۔

- امت کے عام لوگوں کے لیے اچھے طریقے سے عذر تلاش کرنا اور نرمی اور حلم کے ساتھ انہیں دعوت دینا اور تذبذب کا شکار افراد کے ساتھ خوش اسلوبی سے مانوس ہونا۔

ان میں سے بعض کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی (ان شاء اللہ)۔

☆☆☆☆

میدانِ جنگ میں سپاہیوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے اہم نکات

اوّلاً: جس قضیے کے لیے وہ لڑ رہے ہیں اس کا مبنی بر انصاف ہونا

پس وہ حملہ آور دشمن (عدو الصائل) جو دین و دنیا دونوں کو بگاڑتا ہے، ایمان کے بعد اسے دفع کرنے سے بڑھ کر کچھ بھی واجب نہیں، اس کے لیے کسی شرط کی ضرورت نہیں بلکہ حسبِ استطاعت اسے روکا جائے گا۔ ذمہ داران، کارکنان اور اہلِ علم پر لازم ہے کہ وہ اپنے سپاہیوں میں شعور بیدار کریں اور ان کے اذہان سے اس حقیقت پر پڑے پردے ہٹائیں جس میں وہ جی رہے ہیں۔ یہاں ہمارے لیے دو حقیقتیں اہم ہیں: پہلی، یہ کہ جو کچھ اللہ ان سے چاہتا ہے، اور دوسری، انسانی وجود کا جوہر۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ۝ (سورۃ ھود: ۶۱)

> ”اور قوم ثمود کے پاس ہم نے ان کے بھائی صالح کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا، اور اس میں تمہیں آباد کیا۔ لہٰذا اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ یقین رکھو کہ میرا رب (تم سے) قریب بھی ہے، دعائیں قبول کرنے والا بھی۔“

[توحید اور زمین کی آبادکاری و تعمیر]، ان دونوں کی اچھی وضاحت سے لوگوں میں تبدیلی کا ارادہ پیدا ہوتا ہے، اور سپاہیوں میں ایک طرف اپنے عقیدے کی نصرت کے لیے فداکاری و قربانی کی خواہش دوچند ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اس کے سائے میں باعزت زندگی گزارنے کی تمنا بڑھتی ہے۔ بہت سے لوگ انقلاب کے محرک کے طور پر دین کے کردار کو مشکل سمجھتے ہیں، لیکن سبھی معاشرتی ناانصافی و سماجی ظلم، دولت کی غلط تقسیم اور اقتدار پر قبضے کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یقیناً یہ بھی شرعی مطالبات ہیں جنہیں اسلام نے عدل کے قیام، باہمی کفالت اور امور کو دیانت دار اہلِ ایمان کے سپرد کرنے کے ذریعے بلند کرنے کی ترغیب دی ہے۔ قضیے کا مبنی بر انصاف ہونا اور اس کا اللہ کی رضا سے تعلق دونوں، سپاہیوں اور عوام کو جہاد و قتال اور قربانی دینے کا بنیادی محرک فراہم کرتے ہیں، تاکہ آنے والی نسلیں شریعت کے سائے میں آزادی، وقار اور بہتر مستقبل کے مواقع کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

☆☆☆☆

ثانیاً: انسان روح اور جسم پر مشتمل ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کی اپنی ضروریات ہیں اور ان ضروریات کو پورا کرنے میں احتیاط لازم ہے

روح: روح اللہ پر ایمان اور عالمِ غیب پر یقین میں اضافہ ہونے سے متحرک ہوتی ہے، روح الفاظ و کلمات، حالات و واقعات، مبشرات اور پیش گوئیوں سے غذا حاصل کرتی ہے اور انہی کے ذریعے جوش و جذبے کے ماحول میں پرواز کرتی ہوئی اور اللہ کے پاس جو کچھ ہے اس کی رغبت رکھتی ہوئی آسمان کے قریب پہنچتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام (یعنی قرآن و حدیث) سے بڑھ کر کوئی کلام نہیں، سوائے اس کے جو آیات و احادیث کے درمیان ربط قائم کرے اور ان کی تشریح کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ (سورۃ التوبہ: ۱۱۱)

> ”بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے اس طرح کہ بدلے میں ان کے لیے جنت ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ (سورۃ محمد: ۷)

> ”اگر تم اللہ تعالیٰ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔“

اور فرمایا:

> إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ (سورۃ آل عمران: ۱۶۰)

> ”اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں۔“

اور فرمایا:

> وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ (سورۃ النسآء: ۱۰۴)

> ”اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے جو وہ نہیں رکھتے۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> والله ليتمن هذا الأمر، حتى يسير الراكب من صنعاء إلى حضرموت لا يخاف إلا الله والذئب على غنمه، ولكنكم تستعجلون

”اللہ کی قسم! اللہ اس دین کو پورا کر کے رہے گا، یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک جائے گا اور سوائے اللہ کے یا اپنی بکریوں کے سلسلہ میں بھیڑئے کے، کسی اور سے نہیں ڈرے گا لیکن تم لوگ جلدی کرتے ہو۔“

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

أبشر يا أبا بكر! أتاك نصر الله، هذا جبريل على ثناياه النقع

”اے ابو بکر! تمھیں خوشخبری ہو کہ تمہارے پاس اللہ کی مدد آگئی ہے، یہ جبرئیلؑ اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے ہیں۔“

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

الآن نغزوهم ولا يغزوننا، نحن نسير إليهم

”اب ہم ان پر حملہ کریں گے، وہ ہم پر حملہ نہیں کر سکیں گے بلکہ ہم ہی ان پر فوج کشی کیا کریں گے۔“

اور آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

تلك غنيمة المسلمين غدًا إن شاء الله

”ان شاءاللہ یہ سب کل ہم مسلمانوں کا مال غنیمت ہو گا۔“

اور جہاں تک حالات و واقعات، مبشرات اور پیش گوئیوں کا تعلق ہے تو وہ بہت زیادہ ہیں۔ انہی میں سے (سیف الدین) مظفر قُطُز کا وہ واقعہ ہے جب انہوں نے تاتاری حملوں کا جواب دیا:

”پس بادشاہ مظفر قُطُز (رحمہ اللہ) خود اپنے لشکر کے ایک دستے کے ساتھ حملہ آور ہوئے اور میسرہ (بائیں بازو) کو پیچھے سے سہارا دیا یہاں تک کہ وہ سنبھل گئے اور لوٹ آئے۔ مظفر نے خود لڑائی میں کُود کر براہِ راست قتال کیا اور اس دن نہایت عمدہ کارنامہ سر انجام دیا، جنگ شدید ہو گئی اور باوجود تاتاریوں کی کثرت کے، دونوں فریق ڈٹے رہے، مظفر اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، انہیں اچھی موت کی تلقین کرتے رہے، ان کے ساتھ بار بار خود بھی حملہ کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے اسلام کو فتح عطا فرمائی اور اسے عزت بخشی، تاتاری شکست کھا گئے اور اپنے سرداروں میں سے اکثر کے قتل ہو جانے کے بعد نہایت بدترین حالت میں پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔“

اور مبشرات سے متعلق شیخ محمد المنجد (حفظہ اللہ) فرماتے ہیں:

”پھر وہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ [۱۱ ستمبر] کے بعد (مغربی دنیا کے) مقامی لوگوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد تین گنا بڑھ گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اسلام کو جاننا اور اس کے بارے میں پڑھنا چاہتے ہیں۔“[۲]

اور پیش گوئیوں میں سے وہ ہے جو طائفۂ منصورہ کے بارے میں وارد ہوئی ہے:

”میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر غالب رہے گی، جو اسے چھوڑ دے وہ اسے نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا امر آ جائے۔“

یہ ایک عجیب امت ہے، بارش کی طرح، معلوم نہیں اس کا پہلا حصہ بہتر ہے یا آخری۔

☆☆☆☆

جسم: میدانِ عمل قربانی، فداکاری، ایثار اور عطا کا میدان ہے، پس تم اپنی روح، جسم اور مال سب کچھ اس کے بدلے پیش کرو کہ آنے والی نسلیں اسلام کے سائے میں زندگی گزاریں، یہ سخاوت کی انتہا ہے، اور یہی اس انسان کی مثالی حالت ہے جو اپنے ذاتی تقاضوں سے بالاتر ہو کر اپنے دین کی نصرت اور لوگوں کی محبت میں جیتا ہے۔ لیکن جنگ اور انسانی نفس کی اہم ضروریات ہوتی ہیں، جن کے بغیر ہم توانائی اور حوصلے کا ایک حصہ کھو دیتے ہیں۔ جنگ کے جسمانی میدان میں ضروری ہے کہ سپاہیوں کے پیٹ بھرے ہوں اور ان کے بدن پر ایسا لباس ہو جو کارروائیوں کے مطابق ہو اور موسموں کے بھی موافق ہو، تاکہ ان کی جنگی پیش قدمی جاری رہے اور ان کے حوصلے مستحکم رہیں۔ نفسیاتی میدان میں لازم ہے کہ ان کی جیبوں میں رقم بھی ہو، کیونکہ ان کے پیچھے ایسے لوگ ہیں جنہیں زندگی کی ضروریات کا سامنا کرنے کے لیے اس رقم کی ضرورت ہے۔

یہ احساس و التزام دونوں کے لحاظ سے ایک ذمہ داری و جوابدہی ہے اور اسے ایک لفظ، ایک حدیث اور ایک ادراک میں بیان کیا جا سکتا ہے: [رعایہ]، [تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے]، [اگر عراق میں ایک خچر بھی ٹھوکر کھا جائے تو میں خود کو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ (مسؤل) سمجھوں گا کہ میں نے اس کے لیے راستہ ہموار کیوں نہ کیا]۔

جنگی کارروائی کے اخراجات عموماً قابلِ حساب ہوتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ جڑے اور اس کے واقعات کے بعد آنے والے اخراجات کا حساب نہیں لگایا جا سکتا۔ ہر جنگ میں فاتح اور مفتوح دونوں کو قیمت چکانی پڑتی ہے، کیونکہ جنگ ہلاکتیں چھوڑ جاتی ہے، جس کا مطلب

---

[۲] امت کی موجودہ حالت اور داعیان و مبلغین کا فرض کہ وہ حوصلہ بڑھائیں، شیخ محمد المنجد کے دروس۔

بیوائیں اور یتیم ہیں۔ زخمی بھی ہوتے ہیں، جس کا مطلب طبی اور نفسیاتی نگہداشت ہے، اور جنگ میں قیدی ہوتے ہیں، جس کا مطلب سیاسی، مالی یا عسکری کوشش ہے۔ نیز جنگ اپنے پیچھے لاپتہ افراد بھی چھوڑ جاتی ہے، جس کا مطلب سماجی بے چینی اور معاشرتی اضطراب ہے۔

لہٰذا قائدین کو اپنے کندھوں پر موجود امانت کے حجم کا اِدراک ہونا چاہیے اور انہیں صف کی مضبوطی، حوصلوں کے استحکام اور اعتماد کی بتدریج افزائش کو یقینی بنانے کے لیے اپنی ذمہ داری سے وابستہ رہنا چاہیے۔ انہیں جن چیزوں کی فراہمی کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے وہ یہ ہیں: مضبوط انتظامی امور، اہل ترین اور متحرک عناصر کو ان کی ذمہ داری سونپنا اور خود ان کی نگرانی کرنا۔

میدانی طور پر: جنگ کے دوران باقاعدہ کھانے فراہم کیے جائیں اور جنگی دنوں کے دوران کم از کم ایک گرم کھانا لازماً فراہم ہو، ایسے موزوں لباس اور جوتے مہیا کیے جائیں جو میدانِ جنگ میں سپاہی کے کام کو آسان بنائیں، زخمیوں کے انخلا اور انہیں میدانِ معرکہ سے منتقل کرنے کی مہارت میں تخلیقی انداز اختیار کیا جائے۔

معاشرتی طور پر: کفالت اور مناسب معاش کی فراہمی لازمی ہے، جس میں تقدّم (سنیارٹی/Seniority)، تجربہ اور کیڈرز کو مدِ نظر رکھا جائے، محنتی افراد کی قدر دانی انعامات کے ذریعے کی جائے، غنائم کی تقسیم، شہداء کے خاندانوں، بیواؤں اور یتیموں، کی کفالت اور انہیں تنظیمی اتار چڑھاؤ سے دور باعزت زندگی کی فراہمی، زخمیوں کے لیے بہتر طبی نگہداشت، لاپتہ افراد کی تلاش کے لیے کوششوں میں اضافہ، قیدیوں کی رہائی کے لیے مال کے ذریعے یا لڑائی کے ذریعے یا اغوا کے ذریعے بھرپور کوشش، وغیرہ۔

☆☆☆☆

ثالثاً: قائدین عملی نمونہ اور رول ماڈل بنیں، محض لیکچر جھاڑنے پر اکتفا نہ کریں

صفِ اوّل میں رہیں، سپاہیوں کے ساتھ حسی رابطہ قائم کریں اور اپنی گاڑی کی شان و شوکت یا اپنے ہتھیاروں اور ساز و سامان کی چمک دمک سے ان کے دل نہ توڑیں، خصوصاً جب بعض قائدین سپاہیوں کے نزدیک اس حد تک نمونہ بن جائیں کہ وہ افسانہ محسوس ہوں۔

جب تنظیم وجود میں آتی ہے تو قائد پر لازم ہے کہ وہ سامنے سے قیادت کرے، پیچھے سے نہیں، کیونکہ یہ مرحلہ ابھی بہت دور ہے، اسے ان سے زیادہ محنت کرنی ہوتی ہے، وہ ایک میدانی کمانڈر کے مانند ہوتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے سپاہیوں کے لیے عملی نمونہ پیش کرے تاکہ وہ اس کی پیروی کریں، تاکہ اس کی سرزنش یا تعریف برمحل ہو بلکہ ایک مؤثر محرک بن جائے جو اس کے سپاہیوں کو درکار ہوتا ہے، تاکہ ان کے حوصلے بلند اور ان کی ہمت اعلیٰ رہے۔ کمانڈر کے لیے انسانی نفسیات کی گہرائیوں کو سمجھنا نہایت اہم ہے تاکہ وہ اسے بہترین طریقے سے منظم کر سکے، اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے سپاہیوں اور معاونین کے درمیان مثبت مسابقت کی جبلّت کو متحرک کرے۔

نبی کریم ﷺ سب سے بڑھ کر خوبصورت اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ایک رات اہل مدینہ (ایک آواز سن کر) خوف زدہ ہوگئے، لوگ آواز کی طرف نکل کھڑے ہوئے، تو نبی کریم ﷺ انہیں اس جگہ سے واپس آتے ہوئے ملے۔ آپ سب سے پہلے آواز (کی جگہ) تک پہنچے، آپ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی (بغیر زین) ننگی پیٹھ پر سوار تھے، آپ کی گردن مبارک میں تلوار تھی اور آپ فرما رہے تھے: ”خوف زدہ نہ ہو، خوف زدہ نہ ہو‘۔ پھر آپ نے فرمایا: ”ہم نے اس (گھوڑے) کو سمندر کی طرح پایا ہے یا فرمایا: یہ تو سمندر رہے“۔ اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

قائد اور کمانڈر کی بلند حسِّ معنوی اور حوصلہ متعدی ہوتا ہے، اور بطورِ قائد آپ خود رفتار (Rhythm) متعین کرتے ہیں، لہٰذا اسے سپاہیوں پر نہ چھوڑیں۔ اگر معاونین اور سپاہی یہ جان لیں کہ آپ خود کسی بھی قربانی کے لیے تیار ہیں تو وہ اس میں سبقت کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے، لیکن اس کے برعکس معاملہ بھی درست ہے۔ اپنے آپ کو عملی نمونہ اور رول ماڈل بنانا، کام کے لیے درست رفتار قائم کرنے اور حوصلے بلند کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ جب معاونین اور سپاہی آپ کے اخلاص اور مقصد کے لیے آپ کی وابستگی دیکھتے ہیں تو وہ آپ کے بلند حوصلے، روحانیت اور آپ کی ذاتی قربانی سے توانائی حاصل کرتے ہیں، وہ آپ کے معیار تک پہنچنے کے لیے آپ سے سبقت کریں گے اور آپ انہیں اپنے پیچھے دوڑتے پائیں گے۔ آپ پر لازم ہے کہ آپ مقصد تلاش کریں، اپنے سپاہیوں کے ارادوں کو یکجا کریں اور انہیں اس کے حصول کے لیے ہم آہنگ بنا دیں۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں غزوۂ حنین کے بارے میں روایت کیا ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”اللہ کی قسم! جب لڑائی شدت اختیار کر جاتی تو ہم آپؐ کی اوٹ لیتے تھے اور ہم میں سے بہادر وہ ہوتا جو آپؐ کے، یعنی نبی کریم ﷺ کے ساتھ قدم ملا کر کھڑا ہوتا“۔

مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب لیڈر اور قائد ایک بت میں بدل جاتا ہے۔ اگر لیڈر پر فخر اور حسد غالب آ جائیں تو یہ تسلّط [آمریت] کے راستے کا آغاز ہے۔ وہ بعض کیڈرز اور بہادروں کے نمایاں ہونے سے جلنے لگتا ہے اور انہیں نظر انداز کرنا یا سپاہیوں کی نظروں سے دور محض مشیروں میں تبدیل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں لیڈر نے ٹوٹ پھوٹ اور اختلافات کے بیج بو دیے ہوتے ہیں اور اُس تنظیم کے خاتمے کی تاریخ متعین ہو جاتی ہے جس کی طویل عمر کبھی متوقع تھی۔ پس لیڈروں اور قائدین پر لازم ہے کہ وہ اطاعت، تجرد اور صالح صحبت کے ذریعے خود پر محنت کریں۔

☆☆☆☆

چہارم: جوش و جذبہ بیدار کرنا، اسے برقرار رکھنا اور اس کی چنگاری کو روشن رکھنے کی منصوبہ بندی کرنا، ساتھ ہی آگے بڑھتے وقت رفتار و اعتدال اختیار کرنا

سستی اور جمود جوش و جذبے کے قاتل ہیں، اس لیے سپاہیوں کا اگلے ہدف کی جانب حرکت اور سرگرمی کی حالت میں رہنا ضروری ہے[3]۔ اسلام روح اور جسم دونوں کو مخاطب کرتا ہے اور جذبات کو بھڑکانا، نہ تو فریب ہے اور نہ ہی اداکاری۔ بلکہ روح اور نفس کو اس بات کے لیے تیار کرنا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان رکھتا ہے اس کی تکمیل کے لیے پوری قوت صرف کرے۔ صرف سچے قائدین ہی ترغیب دینے اور جوش و جذبہ ابھارنے کے فرض کو احسن طریقے سے ادا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝ (سورۃ النسآء:۸۴)

”لہٰذا تم اللہ کے راستے میں جنگ کرو، تم پر اپنے سوا کسی اور کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہاں مومنوں کو ترغیب دیتے رہو، کچھ بعید نہیں کہ اللہ کافروں کی جنگ کا زور توڑ دے۔ اور اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست ہے اور اس کی سزا بڑی سخت۔“

اور جوش و جذبے کی آگ کو برقرار رکھنے کے لیے ٹیم اسپرٹ کو پروان چڑھانا، اس کی حوصلہ افزائی کرنا اور ٹیم سے وابستگی کا ماحول پیدا کرنا ضروری ہے، نیز سپاہیوں کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کسی ایسے دستے یا گروہ میں شامل ہوں جس کی خاص صلاحیتیں ہوں، فتوحات سے بھرپور ریکارڈ ہو، اور جس کا شعار، پرچم، وردی اور ایسی علامتیں ہوں جو نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچیں اور انہیں اس کے ارکان ہونے پر فخر کا احساس دلائیں۔

ٹیم کی روح بنیادی تربیت کے ذریعے بھی پروان چڑھتی ہے، کیونکہ تربیتی کیمپ (معسکر) میں آنے والا ہر نیا دستہ پہلے ہی دن سے لے کر شہادت یا تمکین (فتح) حاصل کرنے تک خود کو ہتھیاروں اور جدوجہد کا ساتھی سمجھتا ہے اور جوں جوں وہ اگلی تربیتوں میں اکٹھے آگے بڑھتے ہیں، ان کے اندر یہ احساس گہرا ہوتا جاتا ہے کہ وہ ایک ہی ہم آہنگ ٹیم ہیں جو اپنی صلاحیتوں اور اپنے ممکنہ کاموں کو جانتی ہے۔ جتنا زیادہ تربیت سنجیدہ اور مضبوط ہوتی ہے اتنا ہی ان کے درمیان اعتماد بڑھتا ہے اور فرد کی ٹیم کے لیے اور ٹیم کی فرد کے لیے جان نثاری اور قربانی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ یہ ایمان اور مسؤولیت (ذمہ داری) ہے، ہتھیاروں کے بھائی چارے کا رشتہ مضبوط ترین رشتوں میں سے ایک ہے۔

ہتھیاروں کی بہتری اور ان کا معیار بھی سپاہیوں کے حوصلے کو دوچند کر دیتا ہے، مثلاً طیارہ شکن ہتھیار کی موجودگی اس کے مقابلے میں بے بسی کے احساس کو دور کر دیتی ہے اور دشمن کی فضائی قوت کو غیر مؤثر بنانے کے اطمینان کے ساتھ سپاہیوں کو جوش و جذبے سے آگے بڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ہر ٹیم اپنے مقصد پر یقین رکھنے والے افراد کے ایک گروہ سے تشکیل دی جاتی ہے، جو اس مقصد کی خاطر قربانی دینے کے لیے آمادہ ہو۔ انہیں ایک ورکنگ ٹیم (Working Team) میں جمع کیا جاسکتا ہے اور وہ خود بھی ایک ورکنگ ٹیم تشکیل دے سکتے ہیں۔ گوریلا جنگ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مشترک صفات رکھنے والے افراد کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ نظم و ضبط کے پابند ہو سکتے ہیں یا وہ افراتفری اور انتشار کا شکار بھی ہو سکتے ہیں، البتہ اہم صفت یہ ہے کہ جو ذمہ داریاں انہیں سونپی جائیں وہ انہیں بہترین طریقے سے ادا کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ یہ گروہ فوج کے حوصلے بلند رکھتے ہیں اور اُس دستے کی تشکیل میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں جسے (آج کل) سپیشل فورسز کہا جاتا ہے۔ مختصراً، ٹیم بنائی بھی جاسکتی ہے یا خود بخود بھی وجود میں آسکتی ہے، اہم بات اس کی اچھی دیکھ بھال ہے تاکہ اس کی کوششوں سے بہترین فائدہ اٹھایا جاسکے۔

چار بہادر سپاہی جو ایک دوسرے کو نہیں جانتے، شیر پر حملہ نہیں کر سکتے، جبکہ چار سپاہیوں کی ایک ٹیم جو ان سے کم بہادر ہو، مگر ایک دوسرے کو جانتی ہو اور اس بات پر اعتماد رکھتی ہو کہ وہ ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکتے ہیں، تو وہ دلیری سے حملہ کرے گی۔ یہی فوجوں کی تنظیم کے علم کا نچوڑ ہے۔[4]

☆☆☆☆

پنجم: حلم (بردباری) اور حزم (احتیاط) کو یکجا کریں

بردبار، عادل اور محتاط رہیں، اور جزا و سزا کے درمیان بہترین توازن قائم رکھیں، کیونکہ کسی بھی سبب سے انعامات کی کثرت ان کے مقصد کو خراب کر دیتی ہے اور سزا کی زیادتی حوصلے کو تباہ کر دیتی ہے۔ عدل کی درست پابندی معاشرے کو سلامتی، فوج کو قوت اور حکومت کو ہیبت و وقار عطا کرتی ہے۔

جزا و سزا کے نظریے کا معیار یہ ہے:

۱. حق، عدل اور انصاف کی پیروی کرنا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ (سورۃ النسآء:۵۸)

”یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یقین جانو اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ بیشک اللہ ہر بات کو سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔“

[3] کچھ فوجیں اپنے سپاہیوں کی توانائی کو فضول کاموں میں ضائع کرتی ہیں جن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ ان کی توانائی کو خرچ اور ضائع کیا جائے تاکہ وہ ناکام قیادت کے خلاف غصے میں تبدیل نہ ہو۔

[4] فرانسیسی کرنل چارلس آردن ڈوپیک (French Colonel Charles Ardant du Picq 1821-1870)

۲. نیکی کرنے والے سے کہنا کہ تم نے اچھا کیا، اور برائی کرنے والے سے کہنا کہ تم نے غلط کیا۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ○ (سورۃ الرحمن: ۶۰)

”اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا اور کیا ہے؟“

۳. سچائی نہ کہ خوشامد۔

اللهم إني أبرأ إليك مما صنع خالد

رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی اجتہادی خطا پر فرمایا: ”اے اللہ میں خالد کے فعل سے بری ہوں“۔

۴. دلوں کو جوڑنا نہ کہ ضمیروں کو خریدنا۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (سورۃ الانفال: ۶۳)

”اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا کر دی۔ اگر تم زمین بھر کی ساری دولت بھی خرچ کر لیتے تو ان کے دلوں میں یہ الفت پیدا نہ کر سکتے، لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا، وہ یقیناً اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔“

۵. مدارات اختیار کرنا، نہ کہ مداہنت دکھانا۔

مدارات کا معنی ہے دین کے فائدے کے لیے دنیا کو خرچ کرنا اور اس کے برعکس مداہنت سے مراد ہے دنیا کے فائدے کے لیے دین کو بیچ دینا۔

۶. سزا دینا، نہ کہ انتقام لینا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (سورۃ الانعام: ۱۶۰)

”جو شخص کوئی نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس جیسی دس نیکیوں کا ثوب ہے اور جو شخص کوئی بدی لے کر آئے گا، تو اس کو صرف اسی ایک بدی کی سزا دی جائے گی، اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہو گا۔“

کیونکہ مقصد رویے کی اصلاح، جرم کے مرتکب کو باز رکھنا، اس کے دوبارہ وقوع کو یقینی طور پر روکنا اور دوسروں کو ڈرانا اور نصیحت کرنا ہے۔

لوگ حقوق میں برابر ہیں، لہذا جانبداری (امتیازی سلوک) کی کوئی گنجائش نہیں، ایمان، عدل اور صلاحیت وہ صفات ہیں جو اہلیت (Merit) رکھنے والوں کو کردار، مشن و ذمہ داری حتیٰ کہ القاب تک عطا کرتے ہیں۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر کی لڑائی کے دن ارشاد فرمایا:

”کل میں ایسے شخص کے ہاتھ میں یہ جھنڈا دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور جس سے اللہ اور اس کا رسول بھی محبت رکھتے ہیں۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو ان کے فطری اوصاف کے مطابق القاب اور کنیتیں عطا فرمائیں:

امینِ اُمت (امت کا امین)، صدیق (تصدیق کرنے والا)، فاروق (حق و باطل میں فرق کرنے والا)، ذوالنورین (دو نور والا)، تاجرُ الرحمن (رحمٰن کا تاجر)، اسدُ اللہ (اللہ کا شیر)، سیفُ اللہ (اللہ کی تلوار)، اسد فی براثنہ (شیر اپنے پنجوں کے ساتھ)، مؤذنِ رسول، خطیبِ انصار، سفینہ (کشتی)، ذاتُ النطاقین (دو کمر بند والی)، اور خود رسول اللہ ﷺ الصادقُ الامین (سچے اور امانت دار) کے لقب سے معروف ہوئے۔

قرآنی تربیت ہمیں ہمیشہ ترغیب کو ترہیب (ڈرانے) پر مقدم رکھنے کی رہنمائی کرتی ہے، کیونکہ اجر و ثواب لوگوں کا ہاتھ تھام کر انہیں نیکی پر ابھارتا ہے، البتہ سزا بھی ضروری ہے، کہ بعض لوگوں کے لیے کوڑے کا دیکھ لینا ہی کافی ہوتا ہے اور بعض کے لیے لازم ہے کہ کوڑا ان کی جِلد کو چھوئے۔ پس لشکر کے کمانڈر کو چاہیے کہ وہ حلیم و بردبار بھی ہو اور حازم و محتاط بھی، کسی کے ساتھ جانبداری نہ کرے اور لوگوں کو ان کی صلاحیت اور محنت (Competence and Devotion) کے مطابق مقدم و مؤخر رکھے (ترقی و تنزلی کا فیصلہ کرے)۔

☆☆☆☆

ششم: افواہوں اور جوابی پروپیگنڈے کا مقابلہ کریں، گرتے ہوئے حوصلے کے خلاف مزاحمت کریں، ایک نئی عوامی رائے تشکیل دیں۔

افواہیں اور سیاہ پروپیگنڈا ذیل میں بیان کیے گئے عوامل سے تقویت پاتے ہیں: قیادت کی عدم وضاحت، معاہدات کی رازداری، الفاظ و مواقف کی دھندلاہٹ و ابہام، ان کی حقیقت سے ملتے جلتے تاریخی یا معاصر واقعات سے شواہد کی غلط مثالیں بیان کرنا اور ناقص حوالے دینا۔ افواہوں اور سیاہ پروپیگنڈے کا مقابلہ قائد، اس کے قریبی رفقاء اور اس کی شوریٰ کی نیک نیتی سے کیا جاتا ہے اور اس بات سے کہ وہ خود ان چیزوں میں نہ پڑیں جو ہم نے اوپر بیان کیں ہیں اور جو افواہوں کو غذا دیتی ہیں۔ نیز افواہوں کا مقابلہ افواہیں پھیلانے والوں اور حوصلہ شکنی کرنے والوں کے ساتھ سختی، انہیں جلد از جلد الگ تھلگ کرنے اور انتہائی پابند، منضبط اور پُر جوش عناصر کو آگے لانے سے بھی کیا جاتا ہے، یہی لوگ ان افواہ ساز حوصلہ شکنی کرنے والوں کے مقابل ایک ڈھال ہوں گے۔

الفاظ، چاہے وہ جوابی افواہیں ہوں یا حوصلہ افزا ترغیبی الفاظ، یا ایسے الفاظ جو تکبر اور کھوکھلے فخر کے رویّوں کے ساتھ ہوں جو سپاہیوں کو باہر سے متاثر کرتے ہیں، جو جذبات کو چھوتے ہیں اور شاید خواہشِ نفس کو بھی، مگر ایمان کو نہیں چھوتے۔ ابو جہل متکبرانہ فخر کے ساتھ خطیب بن کر کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ”واللہ ہم واپس نہیں لوٹیں گے یہاں تک کہ بدر پہنچیں، وہاں تین دن قیام کریں، اونٹ ذبح کریں، کھانا کھلائیں، شراب پلائیں، گانے والیاں ہمارے لیے ساز بجائیں اور عرب ہم سے، ہمارے سفر اور ہمارے اجتماع سے باخبر ہوں، پھر وہ ہمیشہ ہم سے ڈرتے رہیں گے“۔

وہ کلمات جو قیادت کے ایمان افروز مواقف کے ساتھ ہوں اور جو دل سے اور سچائی و تواضع کے ساتھ نکلتے ہوں، وہ دلوں کو اندر سے متاثر کرتے ہیں خصوصاً مشکل ترین اوقات میں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن مقداد ؓ کے سوا ہم میں سے کوئی بھی گھوڑے پر سوار نہیں تھا اور (رات کے پڑاؤ کے دوران) ہم میں سے کوئی بھی نہیں جاگ رہا تھا سوائے رسول اللہ ﷺ کے جو درخت کے نیچے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے اور روتے جا رہے تھے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور جب ملاقات ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے خطاب کیا، جس میں فرمایا: ”اس جنت کی طرف بڑھو جس کی چوڑائی آسمان و زمین ہے جو متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے“۔

گرتے ہوئے حوصلے [یعنی مایوسی، ناامیدی اور بے بسی] کا مقابلہ کرنا: ایک بُرا اور نکما کمانڈر اپنے ماتحتوں (کیڈرز) اور اپنی ہیئتِ ارکان (اسٹاف) کو مایوسی کی ایسی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے جو سستی اور ناامیدی کا باعث بنتی ہے، یوں ان کے اندر بیک وقت متضاد کیفیت پیدا ہو جاتی ہے [یعنی انقلابی جوش اور جمود]۔ یہاں اس کمانڈر کی تبدیلی ناگزیر ہے جس کے پروگرام نے یہ حالت پیدا کر دی اور بعد ازاں جس کے نتیجے میں شکستیں ہوئیں۔ نئے کمانڈر کو اپنے ماتحتوں (کیڈرز) اور سپاہیوں میں از سرِ نو اعتماد قائم کرنے کے لیے توانائی کے ذرائع تک پہنچنے کا بالواسطہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے اور انہی کے ذریعے انہیں متحرک کرنا چاہیے۔ اسے میدان میں انہیں دوبارہ تربیت دینی چاہیے اور تمام سطحوں کے درمیان باہمی رابطہ بڑھانا چاہیے، اور ان مثبت مفاہیم پر گفتگو کرنی چاہیے جو ایک عرصے سے غائب رہے ہیں، جو اصولوں سے وابستگی رکھتے ہیں اور شجاعت، وفاداری اور مردانگی کو نمایاں کرتے ہیں، توانائی کو متحرک کرتے ہیں اور جوش و جذبے کو بھڑکاتے ہیں، اور ان منفی تصورات پر بات کرنے سے گریز کرے جو کرنے والے کو رسوائی اور عار سے دوچار کرتے ہیں۔ سپاہیوں کے گروہوں (مجموعات) کی ایک اجتماعی شخصیت ہوتی ہے، اچھے انداز میں رہنمائی سے اس کی مثبت مضبوطی وقت کے ساتھ بڑھتی ہے، لیکن اس کے برعکس معاملہ بھی درست ہے۔ فعالیت اور سرگرمی پر زور دیں کیونکہ یہ کامیابی تک لے جاتی ہیں؛ اور کامیابی حوصلے بلند کرتی ہے اور یہی مطلوب ہے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک باصلاحیت، متاثر کن، کامیاب، تخلیقی و اختراعی اور تجدیدی کمانڈر تھے۔ معرکہ مؤتہ میں قیادت سنبھالنے کے بعد ناکامی ان کے قدموں تک نہ پہنچ سکی اور وہ اپنے سپاہیوں کی نظر میں ایک عسکری افسانہ (Legend) بن گئے۔ ان کے سپاہیوں نے محسوس کیا کہ وہ بھی اس افسانے (Legend) کا حصہ ہیں، اس لیے وہ اللہ کی طرف سے حضرت خالد ؓ کی تائید پر ایمان و اعتماد کے ساتھ ان کے ہمراہ رہے، حالانکہ خالد نہ تو خود سوتے تھے اور نہ دوسروں کو سونے دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں کو ناز و نعم سے بگاڑا نہیں، نہ ہی اہلِ صلاحیت کے علاوہ کسی کو اپنے قریب آنے دیا۔ وہ زاہد تھے، اللہ کے پاس جو کچھ ہے اسی کے طالب تھے، وہ ہمیشہ اپنے سپاہیوں سے عزت و مردانگی کی بات کرتے تھے اور نفسانی لالچ کو مخاطب نہیں کرتے تھے۔ جب وہ کسی کو انعام دیتے یا ترقی دیتے تو وہ استحقاق (Merit) کی بنیاد پر ہوتی، نہ کہ قبائلی یا سیاسی حساب کتاب پر۔ خالد ؓ نے ہمیشہ آگے بڑھ کر قیادت کی، ان کے ہاتھ میں تلواریں ٹوٹیں اور انہوں نے سپاہیوں کے درمیان جوش و فدائیت کی ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ وہ دلیری میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگے۔ حضرت خالد ؓ کی جنگوں کا مطالعہ کرنے والا دیکھتا ہے کہ خالد ؓ میں قیادت کی صفات کا ایسا سبق ہے کہ صفحات کے صفحات ان صفات کو سمو نہیں پاتے اور حروف اظہار سے عاجز ہو کر بھٹک جاتے ہیں۔ چنانچہ خالد ؓ کے متعلق حضرت ابو بکر ؓ نے فرمایا: عورتیں خالد ؓ جیسے لوگوں کو جنم دینے سے عاجز رہیں، حضرت عمر ؓ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابو بکر ؓ پر رحم فرمائے، وہ لوگوں کو مجھ سے بہتر پہچانتے تھے، اور حضرت عمر ؓ نے فرمایا: خالد جیسے لوگوں پر ہی رونے والے روئیں۔

☆☆☆☆

جنگ ارادوں کا تصادم ہے، خواہ وہ سرد جنگ ہو یا گرم۔ جنگ صرف مسلح قوتوں کے درمیان واقع نہیں ہوتی بلکہ قوموں کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اللہ پر ایمان حوصلے اور روحِ معنوی کا جوہر اور ارادے کا منبع ہے۔ یہ ایک روحانی، ایمانی، ذہنی اور نفسیاتی کیفیت ہے جو جرأت اور امید کو مضبوط کرتی ہے اور ٹیم اسپرٹ، وحدت سے محبت اور عزم و استقلال میں مجسم ہوتی ہے۔ ٹیم اسپرٹ دین، قیادت، نظم و ضبط، عزتِ نفس، خودداری اور محرکات و اسباب کے عدل پر پختہ یقین سے پھوٹتی ہے۔ جو فریق حوصلے اور معنوی قوت کو برقرار رکھتا ہے وہ تمام رکاوٹوں کے باوجود کامیابی سے آخر تک پیش قدمی کر سکتا ہے، لیکن اگر یہ معنوی و روحانی قوت اور حوصلہ کھو جائے تو تمام منصوبے، اقدامات اور صلاحیتیں بے کار ہو جاتی ہیں۔

بلند حوصلے فوج کی کارکردگی کو دوگنا کر دیتے ہیں اور مجاہد کی صلاحیتوں کو اپنے سے دگنے دشمنوں سے برتر بنا دیتے ہیں، بلکہ اس کی برتری دس بلکہ شاید ہزار تک پہنچ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ حَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَى ٱلْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ
صَٰبِرُونَ يَغْلِبُوا۟ مِا۟ئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّا۟ئَةٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفًا مِّنَ ٱلَّذِينَ
كَفَرُوا۟ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ۝ ٱلْـَٔـٰنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ

ضَعۡفًا‌ؕ فَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ‌ۚ وَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ اَلۡفٌ يَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَيۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ۝ (سورۃ الانفال: ۶۵،۶۶)

”اے نبی! مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تمہارے بیس آدمی ایسے ہوں گے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے۔ اور اگر تمہارے سو آدمی ہوں گے تو وہ کافروں کے ایک ہزار پر غالب آ جائیں گے، کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ اب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا، اور اس کے علم میں ہے کہ تمہارے اندر کچھ کمزوری ہے۔ لہٰذا (اب حکم یہ ہے کہ) اگر تمہارے ثابت قدم رہنے والے سو آدمی ہوں تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے، اور اگر تمہارے ایک ہزار آدمی ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آ جائیں گے، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اور صحابہؓ کے بعض سوار جنگ میں ایک ہزار آدمیوں کے برابر شمار ہوتے تھے، ان میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن العوام، حضرت محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ، حضرت مقداد رضی اللہ عنہ بن الاسود، حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بن الصامت، حضرت مسلمہ رضی اللہ عنہ بن مخلد، حضرت خارجہ رضی اللہ عنہ بن حذافہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن خویلد الاسدی سب شامل ہیں۔

ہمیں سچے مومنوں کی ضرورت ہے جو نماز قائم کرتے ہیں، اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں، گمانوں اور حوادث نے جو کچھ بگاڑا ہے اسے درست کرتے ہیں، اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں، اور جب وہ اسے یاد کرتے ہیں تو ان کے دل لرز اٹھتے ہیں، جب ان پر اس کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ پس وہ اللہ پر بہترین توکل کرتے ہیں، جب وہ اللہ سے فریاد کرتے ہیں تو وہ ان کی دعا قبول کرتا ہے، انہیں بشارت دیتا ہے، ان کے دلوں کو مضبوط کرتا ہے، ان کے قدم جما دیتا ہے اور انہیں سکھاتا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ‌ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ۝ (سورۃ البقرۃ: ۲۸۲)

”اور اللہ کا خوف دل میں رکھو، اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

اللہ سے اور اللہ کے دین سے حقیقی وابستگی امت کی وحدت کو جنم دیتی ہے، جبکہ کسی صحیح مرجعیت (مضبوط اتھارٹی) کے التزام کے بغیر افراد یا تنظیموں کے پیچھے اندھا دھند چلنا، ایک تنظیم کی سطح پر صفوں میں انتشار پیدا کرتا ہے، جبکہ متعدد فعال تنظیموں کی سطح پر، مستقبل میں اتحاد کے تصور کو معدوم کر دیتا ہے۔ یہاں ان باتوں سے تنظیموں یا جماعتوں کی تحقیر ہمارا مقصود نہیں ہے، ایسا وہی لوگ کہتے ہیں جن کا تبدیلی کے منصوبوں میں کوئی حصہ نہیں۔ بلکہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ فرد، تنظیم اور جماعت سب کی وفاداری، وابستگی اور مرجعیت اللہ اور اس کے دین کے ساتھ ہونی چاہیے جسے اس نے پسند فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا‌ؕ (سورۃ المآئدۃ: ۳)

”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لیے) پسند کر لیا۔“

یہاں سے اور صرف یہیں سے، دل مطمئن ہوتے ہیں کہ یہ سفر درست اور صحیح (سمت میں) ہے، اور سنتیں باقی رہتی ہیں، اور اسباب بھی باقی رہتے ہیں۔

اور خوش خبری سن لو اے اللہ کے بندو! امام احمد نے اپنی مسند میں تمیم داریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یہ دین ضرور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک رات اور دن پہنچتے ہیں، اور اللہ نہ کسی کچے گھر کو چھوڑے گا اور نہ کسی اون کے خیمے کو، مگر یہ کہ اللہ اس دین کو اس میں داخل کر دے گا، یا تو کسی باعزت کی عزت کے ساتھ، یا کسی ذلیل کی ذلت کے ساتھ، وہ عزت کہ اللہ جس کے ذریعے اسلام کو سربلند کرے گا، اور وہ ذلت کہ اللہ جس کے ذریعے کفر کو ذلیل کرے گا۔“

☆☆☆☆

(ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ) اگر ہم فتح حاصل نہ کر سکیں اور نتیجہ اس کے برعکس نکل آئے تو خبردار! اس پر پردہ نہ ڈالنا اور نہ ہی اس کے بنیادی اسباب سے انکار کرنا۔ مضبوطی سے اٹھ کھڑے ہونے کے لیے غلطیوں کی اصلاح پر کام شروع کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ دوبارہ ان کے شکنجے میں نہ آئیں اور شکست کے سبق سے مستقبل کی فتح کے بیج بوئیں، نہ کہ ناکامی کی ذمہ داری سے راہِ فرار اختیار کر کے (اگلی شکست کا انتظار کریں)۔

معرکۂ ”حمراء الاسد“ وہ عنوان ہے جس پر میں لکھنا چاہتا ہوں، یہاں اس کے واقعات درج کیے جا رہے ہیں تاکہ آپ ان سے یہ اخذ کر سکیں کہ کسی بھی خسارے کے بعد کیسے اٹھنا ہے:

چنانچہ غزوۂ اُحد کے سانحے کے بعد اگلے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو حکم فرمایا کہ وہ اعلان کریں: ”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اپنے دشمن کے تعاقب کا حکم دیتے ہیں اور ہمارے ساتھ وہی نکلے گا جو کل لڑائی میں شریک تھا“۔ حالانکہ ان پر گہرے زخم تھے، حتیٰ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی تھے۔ پس وہ حمراء الاسد میں جمع ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت انہیں لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دیتے اور جب شام ہو جاتی تو آگ جلانے کا حکم فرماتے، چنانچہ ہر آدمی ایک آگ جلاتا۔ وہ رات کو آگ کے پانچ سو الاؤ روشن

کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ دور دراز مقام سے بھی نظر آتی تھی۔ یوں مسلمانوں کے لشکر اور ان کی آگ کا چرچا ہر سمت پھیل گیا، حتیٰ کہ یہ ان اسباب میں سے تھا جن کے ذریعے اللہ نے ہمارے دشمن کو زیر کر دیا۔

اور قریش بھی اپنے دل میں یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ جلدی میں نکل آئے اور کوئی خاطر خواہ کام انجام دیے بغیر واپس ہو رہے ہیں، یہاں تک کہ معبد بن ابی معبد ان سے آملا۔ اس نے ابوسفیان اور قریش کو روحاء کے مقام پر پایا، وہ ایک دوسرے کو ملامت کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ”نہ تو تم نے محمد (ﷺ) کو پایا اور نہ ہی جوان لونڈیوں کو اپنے ساتھ لے جا سکے، تم نے بہت برا کام کیا، پس وہ سب واپسی پر متفق ہو چکے تھے“۔ اور عکرمہ بن ابی جہل نے کہا: ”ہم نے کچھ نہیں کیا، ہم نے ان کے اشراف کو قتل کیا پھر واپس لوٹ آئے اس سے پہلے کہ انہیں جڑ سے اکھاڑ دیتے، اس سے پہلے کہ انہیں دوبارہ قوت حاصل ہو“۔ معبد جب ابوسفیان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا: ”یہ معبد ہے اور اس کے پاس خبر ہے، اے معبد! تمہارے پاس کیا خبر ہے؟“ اس نے کہا: ”میں محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں، وہ تم پر آگ کی مانند غصے میں جل رہے ہیں اور ان کے ساتھ کل پیچھے رہ جانے والے اوس اور خزرج کے لوگ بھی جمع ہو چکے ہیں، انہوں نے عہد کر لیا ہے کہ وہ واپس نہیں لوٹیں گے جب تک تمہیں جا نہ پکڑیں اور تم سے بدلہ نہ لے لیں، وہ اپنی قوم کے لیے اور اپنے اُن اشراف کے لیے جنہیں تم نے قتل کیا ہے سخت غضب ناک ہیں“۔ انہوں نے کہا: ہلاکت ہو تجھے! تو کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! ہم نہیں سمجھتے کہ ہم کوچ کریں یہاں تک کہ (ان کے) گھوڑوں کی پیشانیاں دیکھ لیں۔ اور ان باتوں میں سے جن کے ذریعے اللہ نے ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں کو واپس پلٹا دیا، صفوان بن امیہ کا وہ کلام بھی تھا جو اس نے معبد کے آنے سے پہلے کہا تھا، اس نے کہا: ”اے لوگو! ایسا نہ کرو، بے شک وہ لوگ غمگین ہو چکے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ وہ خزرج میں سے پیچھے رہ جانے والوں کو تمہارے خلاف جمع نہ کر لیں، پس واپس لوٹ جاؤ، فتح تمہاری ہے، کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم لوٹے تو کہیں فتح تمہارے خلاف نہ ہو جائے“۔ اور ابوسفیان کے پاس عبد القیس کے چند آدمی گزرے جو مدینہ جا رہے تھے، تو اس نے کہا: ”کیا تم محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں تک وہ بات پہنچا دو گے جس کے لیے میں تمہیں بھیج رہا ہوں، اس شرط پر کہ میں کل عکاظ میں تمہارے اونٹوں کو کشمش سے بھر دوں، اگر تم میرے پاس آؤ؟“ انہوں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: ”جہاں کہیں تم محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں سے ملو، انہیں بتا دینا کہ ہم نے ان کی طرف دوبارہ پلٹ کر آنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے“۔

یہ ان دونوں لشکروں کی حالت تھی۔ ان میں سے ایک زخمی تھا مگر اپنے دشمن کا تعاقب کرنے کا خواہاں، اور دوسرا خیالات میں گھرا ہوا تھا اور فرار پر متفق ہو چکا تھا۔

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی اس حالت کو اپنے اس فرمان کے ذریعے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا:

اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَہُمُ الۡقَرۡحُ ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡہُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۚ۝ اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡہُمۡ فَزَادَہُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ۝ فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡہُمۡ سُوۡٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ ۝ (سورۃ آل عمران: ۱۷۲-۱۷۴)

”وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار کا فرمان برداری سے جواب دیا، ایسے نیک اور متقی لوگوں کے لیے زبردست اجر ہے۔ وہ لوگ جن سے کہنے والوں نے کہا تھا: یہ (مکہ کے کافر) لوگ تمہارے (مقابلے) کے لیے (پھر سے) جمع ہو گئے ہیں، لہٰذا ان سے ڈرتے رہنا، تو اس (خبر) نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بول اٹھے کہ: ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہ لوگ اللہ کی نعمت اور فضل لے کر اس طرح واپس آئے کہ انہیں ذرا بھی گزند نہیں پہنچی، اور وہ اللہ کی خوشنودی کے تابع رہے۔ اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے۔“

اسی جذبے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو متحرک کیا، ان کے حوصلے بلند کیے اور غزوۂ اُحد میں جو کچھ وہ کھو بیٹھے تھے وہ انہیں واپس دلایا، اور اللہ کی جانب سے آنے والا یہ جواب ان کے شکستہ دلوں کا مداوا اور ان کے زخموں کا مرہم بن گیا، چنانچہ اللہ نے ان سے اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا، ان کے ایمان کی خوبی کو واضح کیا اور ان کے عمل پر ان کی تعریف فرمائی۔ یوں غزوۂ احد (میں اٹھائے گئے نقصان) کے اثرات مٹ گئے، حوصلے بحال ہوئے، روحِ معنویہ واپس آ گئی، اور تکلیفوں اور زخموں کی کوکھ سے فتح کے بیج بو دیے گئے۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆

بقیہ: بائیکاٹ انکل اور امریکہ

سرمایہ دارانہ نظام کی غلاظت میں سب سے پہلے ڈوبنے والا ملک ترتیب کے لحاظ سے برطانیہ کہلاتا ہے، ۲۰۰ سال قبل جو دنیا کی سب سے بڑی استعماری سپر پاور تھا، ساری دنیا میں لوٹ مار کرتا تھا، آج اپنے ہی بنائے نظام کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ اس کی ہمت نہیں ہے کہ ایسا کوئی آزاد ملک ہوتے ہوئے ایک کھرب دس ارب پاؤنڈ کی کرنسی چھاپ کر سارا قرض ایک منٹ میں ختم کر دے۔ اس کی ہمت نہیں اس لیے کہ یہ جس سودی نظام کی دلدل میں پھنسے ہیں وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ خودکشی (استعفیٰ) کے علاوہ نہیں۔

[یہ مضمون ایک معاصر روزنامے میں شائع ہو چکا ہے۔ مستعار مضامین مجلے کی ادارتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)]

☆☆☆☆☆

قسط ۱۴

مدرسہ ومبارزہ

مدارس اور دینی جدوجہد کی تحریک

مولوی عبدالهادی مجاهد

زیرِ نظر تحریر افغانستان سے تعلق رکھنے والے عالم، داعی اور فکری جنگ پر دقیق نظر رکھنے والے مفکر فضیلۃ الشیخ مولوی عبد الہادی مجاہد (دامت برکاتہم) کی پشتو تصنیف 'مدرسه او مبارزه' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر افغانستان میں مدارس اور دینی تعلیم کے نظام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے، لیکن کتاب میں بیان کی گئی امت مسلمہ کی حالت اور اس حوالے سے جو مطالبہ ایک افغان عالم اور مدرسے سے کیا گیا ہے وہ در حقیقت باقی عالمِ اسلام کے علماء اور مدارس سے زیادہ مطلوب ہے۔ اس لیے کہ افغانستان میں تو آج ایک شرعی و اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے جبکہ باقی عالَمِ اسلام اس سے کہیں پیچھے ہے۔ اس کتاب کے اصل مخاطبین علماء و طلبہ ہیں جن کی تاریخ بالاکوٹ، شاملی، صادق پور اور دیوبند کے پہاڑوں، دروں، میدانوں اور مساجد و مدارس کے در و دیوار پر نوشتہ ہے! ومن الله التوفيق! (ادارہ)

باب ہشتم: مدارس کے نصاب میں طلباء کے اندر انقلابی فکر و سیاسی شعور پیدا کرنے والے مضامین کا فقدان (۲)

باطل کی پہچان کیوں ضروری ہے؟

باطل کی پہچان اس لیے ضروری ہے کہ اسلام کی آمد کا بنیادی مقصد انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف بلانا، ان کے عقائد، اخلاق، معاملات، افکار اور تصورات کی اصلاح کرنا اور فساد و گمراہی کا خاتمہ کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

ظاہر ہے کہ امر بالمعروف اسی وقت ممکن ہے جب معروف کو پہچانا جائے، اور نہی عن المنکر اسی وقت مؤثر ہو سکتا ہے جب منکر، اس کے نقصانات، خطرات اور اس کے انکار کی وجوہات کو سمجھا جائے۔ معروف کی دعوت دینا اور اصلاحِ احوال کی کوشش کرنا دین کا ایجابی اور تعمیری پہلو ہے، جبکہ منکر اور فساد کے خلاف جدوجہد دین کا دفاعی اور اصلاحی پہلو ہے۔

لہٰذا جس طرح حق کو لوگوں تک پہنچانا، اس کا دفاع کرنا اور اس کی اشاعت ضروری ہے، اسی طرح لوگوں کو منکر سے خبردار کرنا، اس کے خطرات سے آگاہ کرنا، اس کا مقابلہ کرنا اور اسے ختم کرنے کی کوشش کرنا بھی ناگزیر ہے۔ اس مقصد کے لیے منکر اور باطل کی پہچان ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں اور زمانوں میں یہی فریضہ انجام دیا۔ اگر قرآنِ کریم کے مضامین پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تقریباً نصف حصہ ایمان، عقائد اور حقائقِ ایمان سے متعلق ہے، جبکہ باقی نصف میں کفر و ضلالت کی مختلف شکلوں کا تعارف، کفار کے باطل دلائل کا رد، اور ان کے مقابلے کے اجمالی و تفصیلی طریقوں کا بیان موجود ہے۔

جس طرح قرآنِ کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سابقہ امتوں اور اپنے زمانے کے مختلف کفر و ضلالت کے مظاہر سے آگاہ کیا، اسی طرح بعد کے ادوار میں علماء نے بھی اپنے زمانے کے لوگوں کو باطل عقائد، گمراہ کن نظریات اور ان کے شرعی احکام سے روشناس کرایا۔

لہٰذا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے ادوار کے کفر اور باطل کی معرفت ضروری تھی، اسی طرح آج کے دور کے کفریہ نظریات، باطل عقائد اور گمراہ کن افکار کو جاننا اور ان کے بارے میں دینی نصاب میں مناسب معلومات شامل کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

کفر اور باطل کی پہچان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورہ انعام میں ارشاد فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ۝ (سورۃ الانعام: ۵۵)

”اور ہم اسی طرح نشانیاں تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں (تاکہ سیدھا راستہ بھی واضح ہو جائے) اور تاکہ مجرموں کا راستہ بھی کھل کر سامنے آجائے۔“

ایک قراءت کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”مجرموں کا راستہ نمایاں اور واضح ہو جائے“، جبکہ دوسری قراءت کے مطابق معنی یہ ہیں کہ ”تاکہ آپ مجرموں کا راستہ پہچان لیں“۔

مذکورہ آیت میں "وَكَذٰلِكَ" کے لفظ کے ذریعے ان تمام امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کا ذکر اس سے پہلے کی آیات میں آیا ہے: مثلاً کفار کے بے جا اعتراضات، ان کے سامنے دلائل کا بیان، ان کی گمراہی اور تاریکیوں میں بھٹکتے رہنے کا تذکرہ، ان پر نازل ہونے والے عذاب، ان کے دلوں کی سختی، مسلمانوں کو حقیر اور کم تر سمجھنے کا رویہ، نیز ان کی سازشوں اور اہلِ ایمان کے ساتھ ان کی عداوت کا ذکر۔

اس کے بعد مسلمانوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ یہ تمام واقعات اور حقائق محض تاریخی بیانات نہیں، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ مجرموں اور گمراہ لوگوں کی راہ کو پہچانیں، خود کو اس سے محفوظ رکھیں، اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا صحیح اور مناسب طریقہ سیکھیں۔ چنانچہ حالات اور مواقع کے لحاظ سے کبھی دعوت و تبلیغ، کبھی نصیحت و انذار، اور کبھی قتال و جہاد کی صورت اختیار کرنا بھی اسی صحیح فہم اور بصیرت کا تقاضا ہوتا ہے۔

یہ آیت دو قرأتوں کے ساتھ منقول ہے:

۱. "سبیلُ المجرمین" رفع (پیش) کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں "تستبین" میں موجود "ت" تانیث کے لیے ہے، کیونکہ لفظ "سبیل" سماعی مؤنث ہے۔ اس قرأت کے مطابق آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے:

"تاکہ مجرموں کا راستہ واضح اور نمایاں ہو جائے۔"

۲. "تستبین" کی "ت" واحد مخاطب کے صیغے کے طور پر ہے، جس کا خطاب براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا معنی یہ ہوگا:

"اور تاکہ آپ مجرموں کی راہ کو پہچان لیں۔"

اگرچہ بظاہر اس آیت میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن مفسرین اور اصولِ تفسیر کے علماء کا اصول یہ ہے کہ جب تک کسی نص میں تخصیص کی واضح دلیل موجود نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جانے والا خطاب پوری امت کے لیے بھی رہنمائی کا درجہ رکھتا ہے۔

لہٰذا اس آیت کا پیغام صرف عہدِ نبوی تک محدود نہیں، بلکہ پوری امت کے لیے ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اپنی آیات کو اس قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ تم مجرموں، گمراہوں اور اہلِ باطل کے راستے کو پہچان سکو، اس سے خود کو محفوظ رکھ سکو اور دوسروں کو بھی اس کے شر سے بچا سکو۔

ان دونوں قرأتوں کا حاصل ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ کفار کے عقائد، ان کے مکر و فریب، ان کی سازشوں، نظریات اور مقاصد سے واقفیت حاصل کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ ان کے اثرات سے بچا جا سکے، لوگوں کو ان کے خطرات سے آگاہ کیا جا سکے اور ضرورت کے مطابق ان کا علمی، فکری اور عملی مقابلہ کیا جا سکے۔

اسی لیے اسلام میں باطل کی پہچان ایک بنیادی اور اہم مقصد کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح حق کو جاننا، سمجھنا اور اس پر قائم رہنا ضروری ہے، اسی طرح باطل کو پہچاننا، اس کے شبہات کو سمجھنا اور اس کے خطرات سے آگاہ ہونا بھی ناگزیر ہے۔

یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ تاہم یہ ذمہ داری صرف انبیاء علیہم السلام یا ان کے زمانوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ آج کے دور میں اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے، کیونکہ کفر اور باطل کی صورتیں، اسالیب، فکری حملے اور سازشیں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ متنوع، پیچیدہ اور طاقتور ہو چکی ہیں۔

کفر کی مختلف اقسام اور اس کے گمراہ کن نظریات کو جاننا اس لیے ضروری ہے کہ باطل ہمیشہ یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ اپنے کفریہ عقائد اور نظریات کو کسی نہ کسی پردے میں اسلام کے اندر داخل کر دے، تاکہ عام لوگ، بالخصوص کم علم اور سادہ لوح افراد، ان کی حقیقت کو نہ پہچان سکیں۔

آج بھی مغربی افکار سے متاثر سیکولر عناصر اسی طرزِ عمل پر کاربند ہیں۔ وہ "معتدل اسلام"، "روشن خیال اسلام" اور اسی نوع کے دیگر دلکش نعروں کے تحت مغربی نظریات اور تصورات کو اسلامی معاشروں میں رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں جتنے باطل فرقے وجود میں آئے اور جن کی وجہ سے امت مختلف گروہوں میں تقسیم ہوئی، ان کی فکری جڑیں اور تاریخی پس منظر کسی نہ کسی شکل میں غیر اسلامی مذاہب، کفریہ عقائد یا بیرونی فلسفوں سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ اہلِ سنت والجماعت کے علاوہ باقی فرقوں کے افکار و نظریات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے پس منظر میں کسی نہ کسی بیرونی فکری اثر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

باطل ادیان اور مذاہب نے ہمیشہ اسلام میں نفوذ کرنے اور اسے مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید برآں، اپنے نظریات کو قابلِ قبول بنانے کے لیے انہوں نے اسلامی مصادر ہی سے ایسے دلائل تلاش کرنے کی کوشش کی جنہیں اپنے افکار کی تائید میں پیش کیا جا سکے۔

افغانستان میں کمیونسٹوں نے "معاشرتی انصاف" کے عنوان سے، سیکولر حلقوں نے "اسلامی جمہوریت" کے نام پر، اور قوم پرست عناصر نے "حب الوطنی"، "مغرب دوستی" اور "اعتدال پسند اسلام" جیسے نعروں کے تحت اپنے نظریات کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان تمام مثالوں میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ غیر اسلامی افکار کو اسلامی اصطلاحات اور دلکش عنوانات کا لبادہ اوڑھا کر پیش کیا گیا، تاکہ انہیں آسانی سے قبولیت حاصل ہو سکے۔

باطل ادیان، مذاہب اور کفریہ نظریات کی معرفت ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم اسلامی معاشرے میں باطل فرقوں کی دراندازی کا بروقت سدِّباب کر سکیں، اسلام کو مسخ کرنے کی ان کی کوششوں سے خود بھی آگاہ رہیں اور دوسروں کو بھی باخبر کر سکیں۔ اسی طرح ہم ان

پیچیدہ فلسفیانہ اور کفریہ تصورات کو بھی پہچان سکتے ہیں جنہیں بعض حلقے اسلامی اصطلاحات اور دینی تعبیرات کا لبادہ اوڑھا کر مسلمانوں، خصوصاً نئی نسل کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب ہمارے علماء، طلبہ اور دینی حلقوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ کون سے نظریات اسلام سے بیگانہ اور فکری اعتبار سے کفریہ بنیادوں پر قائم ہیں، ان کی اصل جڑیں کہاں ہیں، ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے، اور ان کے ساتھ کس نوعیت کا علمی و عملی رویہ اختیار کرنا چاہیے، تو پھر باطل کے لیے معاشرے میں وسیع پیمانے پر پھیلنا آسان نہیں رہتا۔

افغانستان میں کمیونزم کو نسبتاً آسانی کے ساتھ فروغ ملنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مساجد کے بہت سے ائمہ اور دینی مدارس کے ایک بڑے طبقے کا دین کے ساتھ تعامل نہایت محدود اور سطحی ہو گیا تھا۔ ان میں سے بہت سوں نے دینی خدمت کو صرف امامت یا لغت و منطق کی چند کتابوں کی تدریس تک محدود سمجھ لیا تھا۔ نتیجتاً نہ وہ اپنے دور کے باطل نظریات، کفریہ فلسفوں اور ان کے فکری لٹریچر سے پوری طرح واقف تھے اور نہ ہی ان کے مقابلے میں علمی و فکری جدوجہد کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے تھے۔

اسی غفلت کا نتیجہ تھا کہ لاکھوں مساجد اور بے شمار ائمہ کی موجودگی کے باوجود کمیونزم اور بعد ازاں جمہوریت کے افکار معاشرے میں اپنی جڑیں مضبوط کرتے گئے۔ پہلے عوام نے کمیونسٹ اور جمہوری نظاموں کے تلخ نتائج کا سامنا کیا، اور اس کے بعد جدید الحاد، نیشنلزم، لبرلزم اور مغربی طرز کی آزادیٔ نسواں کے تصورات نے بھی معاشرے کے ایک بڑے طبقے کے اذہان میں جگہ بنالی۔

عصرِ حاضر میں باطل کی پہچان اور اس کی پیچیدہ صورتیں

عصرِ حاضر میں کفر کی مختلف صورتوں اور اس کے فکری و نظریاتی مظاہر کے بارے میں معلومات اس قدر محدود، سطحی، بلکہ بعض اوقات نہ ہونے کے برابر ہیں کہ نہ صرف ان کے مقابلے کا جذبہ پیدا نہیں ہو پاتا، بلکہ نئی نسلیں انہی گمراہ کن نظریات اور دلکش اصطلاحات کے سحر میں اس طرح گرفتار ہو جاتی ہیں کہ پوری دلجمعی کے ساتھ کفار کی فکری قیادت کو قبول کر لیتی ہیں۔

نتیجتاً وہ منبر، محراب، مسجد، جہاد اور دینی محاذوں سے اس طرح نفرت کرنے لگتی ہیں گویا اسی میں اپنے لیے نجات اور کامیابی دیکھتی ہوں۔ یہاں تک کہ بیرونی قوتوں کی صفوں میں جگہ پانے اور ان کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لیے سفارشیں تلاش کی جاتی ہیں، درخواستیں دی جاتی ہیں اور مختلف ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں، تاکہ ان کی فوجوں میں شامل ہو کر انہی کے حکم پر اپنے اُس مجاہد بھائی کے خلاف ہتھیار اٹھایا جائے جو اپنے دین، وطن اور آزادی کے دفاع کے لیے انہی جارح قوتوں کے مقابل کھڑا ہو۔

ماضی میں کفر اور گمراہی کی بیشتر صورتیں نسبتاً سادہ اور واضح تھیں۔ ان کے اثرات بھی محدود ہوتے تھے اور مسلمان انہیں آسانی سے پہچان کر ان کا مقابلہ کر لیتے تھے۔ مثال کے طور پر ماضی کا عیسائیت پر مبنی کفر ایک سادہ شکل رکھتا تھا۔ اس کا دائرہ زیادہ تر رہبانیت تک محدود تھا، جہاں عیسائی راہب شہروں یا دور افتادہ علاقوں میں واقع کلیساؤں اور خانقاہوں میں گوشہ نشینی اختیار کر کے اپنے مخصوص طریقے کے مطابق عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

لیکن آج عیسائیت اپنی اُس قدیم اور محدود صورت میں باقی نہیں رہی۔ اب وہ منظم تبلیغی و مشنری سرگرمیوں، وسیع عالمی اداروں اور اربوں ڈالر کے وسائل کے ذریعے دنیا بھر میں اپنا اثر و نفوذ قائم کر چکی ہے۔ اس نے کرۂ ارض کے تقریباً ہر خطے تک رسائی حاصل کر لی ہے، اور آج دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا شہر باقی ہو جہاں کسی نہ کسی شکل میں عیسائی تبلیغی یا مشنری سرگرمیاں موجود نہ ہوں۔

آج عیسائیت کی سرگرمیاں اتنی ہمہ جہت ہیں کہ نہ صرف دیگر اقوام و ادیان کے ماننے والوں کو متاثر کیے ہوئے ہے بلکہ عالمِ اسلام میں بھی جڑیں پھیلا چکی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ عیسائی مشنری ادارے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تمام دستیاب ذرائع اور وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انٹرنیٹ، کتابیں، ذرائع ابلاغ، فلاحی ادارے، سیاسی اثر و رسوخ، مالی ترغیبات، سفارتی دباؤ اور دیگر ممکنہ ذرائع کو وہ اپنی سرگرمیوں کے فروغ اور توسیع کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

صرف افغانستان ہی کی مثال لیجیے، جو ایک عرصے تک امریکی قبضے کے زیرِ اثر رہا۔ امریکی مداخلت کے دوران ملک میں تقریباً چار ہزار غیر سرکاری تنظیمیں (این جی اوز) سرگرم تھیں، جن میں سے ایک بڑی تعداد بین الاقوامی کلیسائی اداروں اور مشنری تنظیموں سے مالی معاونت حاصل کرتی تھی۔

۲۰۰۴-۲۰۰۳ء میں، جب رمضان بشر دوست حامد کرزئی کی کابینہ میں وزیرِ منصوبہ بندی تھے، انہوں نے افغانستان میں غیر سرکاری تنظیموں کی سرگرمیوں کا قریب سے مشاہدہ کیا اور ان کے بعض مشکوک اور خطرناک پہلوؤں کو محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دن میں ہی ۱۹۳۵ این جی اوز کی رجسٹریشن منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس وقت انہیں یہ گمان تھا کہ وہ واقعی وزیرِ منصوبہ بندی ہیں اور اپنی وزارت کے اختیارات استعمال کر سکتے ہیں، لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ انہی غیر ملکی تنظیموں کے دباؤ کے نتیجے میں انہیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت کا حکومتی ڈھانچہ بڑی حد تک انہی مغربی طاقتوں اور ان کے حمایت یافتہ اداروں کے زیرِ اثر قائم ہوا تھا۔

اس زمانے میں افغانستان میں موجود غیر سرکاری تنظیموں میں سے تقریباً دو سو ایسی تھیں جو براہِ راست مغربی ممالک کے مشنری اداروں سے مالی معاونت حاصل کرتی تھیں۔ یہ

تنظیمیں مغربی حکومتوں اور مشنری حلقوں کے مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے مختلف شعبوں میں سرگرمِ عمل تھیں۔

یہودیت بھی ماضی میں نسبتاً ایک محدود اور سادہ شکل کی حامل تھی۔ جزیرۂ عرب میں مدینہ کے اطراف بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ جیسے چند یہودی قبائل آباد تھے۔ ان کے اکثر افراد یثرب (جو بعد میں مدینہ منورہ کہلایا) میں تجارت، زراعت اور روزمرہ معاشی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے، جبکہ شام اور عراق کے بعض علاقوں میں بھی ان کی محدود بستیاں موجود تھیں۔ اس دور میں نہ ان کے پاس ایسی عالمی سیاسی و معاشی قوت تھی اور نہ ہی وہ دنیا بھر پر اثر انداز ہونے والی علمی، ابلاغی اور اقتصادی برتری رکھتے تھے۔

لیکن آج یہودیت اپنی اُس قدیم اور محدود صورت میں باقی نہیں رہی۔ عصرِ حاضر میں یہودی حلقے عالمی سیاست، معیشت، ذرائع ابلاغ اور جدید عسکری صنعت کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی اثر و رسوخ کے حامل ہیں، اور دنیا کے بہت سے ممالک ان کے سیاسی و اقتصادی دباؤ اور اثرات کے تحت ہیں۔

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہودیت اور دیگر مظاہرِ کفر کی حقیقت کو سمجھنا ضروری تھا، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس دور کے مسلمانوں کے سامنے کفر کی مختلف صورتیں، اہلِ باطل کے مکر و فریب اور ان کی سازشوں کو واضح فرمایا، اسی طرح آج بھی مسلمانوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ایمان اور عقائدِ حقہ کی معرفت جتنی اہم ہے، باطل کی پہچان بھی اتنی ہی ضروری ہے۔

مسلمان جب تک باطل کو نہ پہچانیں، اس کے خطرات اور گمراہ کن پہلوؤں کو نہ سمجھیں گے، وہ اس سے اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکیں گے؟ کیونکہ جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو، اس کا مؤثر مقابلہ بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اگر باطل کی نوعیت، اس کے نظریات، اس کے مقاصد اور اس کے طریقۂ کار سے آگاہی نہ ہو تو اس سے نفرت، اس کے خلاف مزاحمت اور دوسروں کو اس کے نقصانات سے خبردار کیسے کیا جائے گا؟

اسی طرح اگر اہلِ باطل کے مکر و فریب، منصوبے اور اہداف معلوم نہ ہوں تو انسان اپنے دین، اپنی حکومت، اپنے اخلاق، اپنی تہذیب اور اپنی اجتماعی زندگی کو ان کے منفی اثرات سے کیسے محفوظ رکھ سکتا ہے؟

لہٰذا ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے باطل کی معرفت اور اس کی صحیح پہچان ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آسمانی کتابوں اور اپنے انبیاء علیہم السلام کی دعوت و رسالت کے ذریعے ہر دور کے کفر، گمراہی اور باطل نظریات کو واضح فرمایا، تاکہ اہلِ ایمان حق کو بھی پہچان سکیں اور باطل سے بھی خود کو محفوظ رکھ سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں انبیائے کرام علیہم السلام اور اہلِ ایمان کے دشمنوں کی عداوت کی مختلف صورتوں، ان کے طریقۂ کار، انبیاء علیہم السلام کے خلاف ان کی سازشوں اور دشمنیوں کے واقعات و تاریخ کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ اسی طرح یہود، نصاریٰ، مجوس، صابئین اور دیگر باطل و کفریہ اقوام کے عقائد، افکار اور طرزِ عمل کی حقیقت اور بطلان کو بھی واضح کیا ہے، تاکہ ہر دور کے مسلمان کفر اور باطل کی مختلف شکلوں کو پہچان سکیں اور ان کے فتنوں سے محفوظ رہیں۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر قرآنِ کریم میں بنی اسرائیل اور دیگر کفریہ اقوام کے حالات و واقعات کو بار بار اور اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور آخر قرآنِ کریم کا ایک بڑا حصہ ان اقوام کے تعارف، ان کے عقائد و نظریات کے رد اور ان کے باطل افکار کی تردید و ابطال کے لیے کیوں مخصوص کیا گیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم محض گزشتہ قوموں کی تاریخ بیان کرنے کی کتاب نہیں، بلکہ وہ ہر دور کے انسانوں کے لیے ہدایت اور بصیرت کا سرچشمہ ہے۔ اسی لیے اس نے باطل کی مختلف صورتوں، اہلِ کفر کے شبہات، ان کے مکر و فریب اور ان کی فکری گمراہیوں کو نمایاں کیا، تاکہ اہلِ ایمان حق و باطل میں امتیاز کر سکیں، باطل کے دھوکوں سے محفوظ رہیں اور ہر زمانے میں دینِ حق کی حفاظت اور اس کے دفاع کی ذمہ داری بہتر انداز میں ادا کر سکیں۔

قرآنِ کریم کا ایک بڑا حصہ باطل کی پہچان پر کیوں مشتمل ہے؟

چونکہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت آخری امت ہے، اور حق کی دعوت، جہاد، اصلاحِ امت اور باطل کے ہر قسم کے فکری، سیاسی اور عملی چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری قیامت تک اسی امت کے سپرد کی گئی ہے، اس لیے ضروری تھا کہ اسے حق و باطل کی کشمکش کے مختلف مراحل، باطل کے فلسفے اور دلائل، ان کے نتائج اور تاریخی تجربات سے پوری طرح آگاہ کیا جائے۔

اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں حق اور باطل کے درمیان ہونے والے مختلف معرکوں، انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے مخالفین کے حالات، اہلِ ایمان کی کامیابیوں اور اہلِ باطل کے انجام کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے، تاکہ مسلمان تاریخِ انسانی میں حق و باطل کی طویل کشمکش سے سبق حاصل کریں اور ہر دور میں پیش آنے والے فکری، اعتقادی، سیاسی اور عملی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے علمی، فکری، روحانی اور مادی اعتبار سے تیار رہیں۔

گویا قرآنِ کریم صرف ماضی کے واقعات کا بیان نہیں، بلکہ ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے ایک دائمی رہنمائی، تربیت اور تیاری کا سرچشمہ ہے، جو انہیں باطل کی مختلف صورتوں کو پہچاننے، ان کے خطرات کو سمجھنے اور ان کا مؤثر مقابلہ کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔

باطل کی معرفت اور اس کی حقیقت کو جاننے کی شدید ضرورت کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ حق اور باطل کے درمیان جاری اس ازلی کشمکش میں باطل کے لشکر کا قائد ابلیس ہے، جو انتہائی مکار، کینہ پرور اور انسان کا کھلا دشمن ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں اور ساتھیوں کو ہر دور

میں انسانوں کو گمراہ کرنے کے مختلف طریقے سکھاتا اور انہیں اس مقصد کے لیے مسلسل آمادہ کرتا رہتا ہے۔

ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ اعلان کیا تھا کہ وہ بنی آدم کو راہِ راست سے ہٹانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا اور انہیں مختلف راستوں سے گمراہ کرنے کی تدبیریں اختیار کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں اس کا یہ قول نقل فرماتا ہے:

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ○ (سورۃ الاعراف: ۱۶،۱۷)

”(شیطان) کہنے لگا: اب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں (بھی) قسم کھاتا ہوں کہ ان (انسانوں) کی گھات لگا کر تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ رہوں گا۔ پھر میں ان پر (چاروں طرف سے) حملے کروں گا، ان کے سامنے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی، اور ان کی دائیں طرف سے بھی، اور ان کی بائیں طرف سے بھی۔ اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔“

مذکورہ آیت سے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ شیطان کی شدید اور مستقل دشمنی واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اور ہر دور میں اس کے پیروکار، خواہ وہ کسی بھی باطل مذہب، نظریے یا فکر سے وابستہ ہوں، اہلِ ایمان کے خلاف اپنی عداوت کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں کریں گے۔ وہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے مومنین کو مغلوب کرنے کی خاطر ہر قسم کے مادی، فکری اور معنوی ذرائع استعمال کرتے رہیں گے۔

اسی لیے ضروری ہے کہ مومنین کو ہر زمانے کے کفری عقائد، نظریات، طریقۂ کار، شبہات اور اسلام دشمن قوتوں کی حکمتِ عملیوں سے آگاہی حاصل ہو۔ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اہلِ باطل مسلمانوں کے خلاف کن ذرائع اور تدابیر سے کام لیتے ہیں اور ان کا مؤثر اور کامیاب مقابلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اہلِ ایمان کے لیے باطل پرست قوتوں اور ان کے افکار و مقاصد کے بارے میں معقول اور کافی معلومات رکھنا ناگزیر ہے۔ اسی مقصد کے تحت ربّ العالمین نے اپنے فضل و احسان سے اہلِ ایمان کے سامنے باطل کی حقیقت، اس کے مکر و فریب، اس کی چالوں اور گمراہ کن تدبیروں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، تاکہ انسان ان کے دھوکے اور فریب کا شکار نہ ہو، باطل کے شر سے محفوظ رہے اور حق و ہدایت کے راستے پر ثابت قدم رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ان امور کے بیان کو نمایاں اور وسیع مقام دیا گیا ہے۔

جاہلیت کو پہچاننے کی اہمیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر میں

حذیفہ بن یمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت قریبی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار ساتھی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ اس حدیثِ مبارک میں، جسے امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں:

كَانَ اصحاب النبیﷺ يسألونه عَنِ الْخَيْرِ، وَكُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ أَنْ يُدْرِكَنِي.... (متفق عليه)

”لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے، جبکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شر کے بارے میں پوچھتا تھا، اس خوف سے کہ کہیں وہ مجھے آنہ گھیرے۔“

اسی طرح عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، جو اسلام کی روح اور اس کے مقاصد کو گہرائی سے سمجھتے تھے، جاہلیت کی معرفت کو اسلام کے صحیح فہم اور اس کی حفاظت کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب منہاج السنۃ النبویۃ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب یہ قول نقل کیا ہے:

تُنْقَضُ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةً عُرْوَةً، إِذَا نَشَأَ فِي الْإِسْلَامِ مَنْ لَا يَعْرِفُ الْجَاهِلِيَّةَ.

”اسلام کی مضبوط گرہیں ایک ایک کر کے اس وقت ٹوٹنے لگیں گی جب اسلام میں ایسی نسل پروان چڑھے گی جو جاہلیت کو نہیں پہچانتی ہو گی۔“

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس قول کی تشریح میں لکھتے ہیں:

فَإِنَّ كَمَالَ الْإِسْلَامِ هُوَ الْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَمَنْ نَشَأَ فِي الْمَعْرُوفِ فَقَدْ لَا يَعْرِفُ غَيْرَهُ، فَقَدْ لَا يَكُونُ عِنْدَهُ مِنَ الْعِلْمِ بِالْمُنْكَرِ وَضَرَرِهِ مَا يَكُونُ عِنْدَ مَنْ عَلِمَهُ، وَلَا عِنْدَهُ مِنَ الْجِهَادِ لِأَهْلِهِ مَا يَكُونُ عِنْدَ الْخَبِيرِ بِهِ.[1]

”اسلام کی تکمیل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی سے ہوتی ہے۔ جو شخص معروف (نیکی اور حق) کے ماحول میں پروان چڑھے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے واقف نہ ہو، اس کے پاس منکر اور اس کے نقصانات کے بارے میں وہ علم و آگاہی نہیں ہوتی جو اس شخص کے پاس ہوتی ہے جو منکر کو جانتا اور پہچانتا ہو۔ اسی طرح ایسے شخص میں اہل باطل کے خلاف جہاد اور ان کا مقابلہ کرنے کی وہ صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوتی جو منکر اور اس کے طریقوں سے باخبر لوگوں میں ہوتی ہے۔“

[1] منهاج السنة النبوية ج ۲ ص ۳۹۸

اسی تناظر میں ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ کفر، شرک اور باطل کی معرفت کیوں ضروری ہے، لکھتے ہیں:

وهذا لأنه إذا لم يعرف الشرك والجاهلية وما عابه القرآن الكريم وذمَّه، وقع فيه وأقرَّه ودعا إليه وصوَّبه وحسَّنه، وهو لا يعرف أنه هو الذي كان عليه أهل الجاهلية، أو نظيره، أو شرٌّ منه، أو دونه.

فينقض بذلك عُرَى الإسلام عن قلبه، ويعود المعروف منكراً، والمنكر معروفاً، والبدعة سنَّة، والسنَّة بدعة، ويُكفَّر الرجل بمحض الإيمان وتجريد التوحيد، ويُبدَّع بتجريد متابعة الرسول صلى الله عليه وسلم ومفارقة الأهواء والبدع ومن له بصيرة وقلب حيٌّ يرى ذلك عياناً، والله المستعان.

”اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص شرک اور جاہلیت کو، نیز ان امور کو جنہیں قرآنِ کریم نے برا قرار دیا، ان کی مذمت کی اور ان پر نکیر فرمائی، نہ پہچانے تو وہ خود انہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، انہیں درست سمجھنے لگتا ہے، ان کی طرف دعوت دیتا ہے، ان کا دفاع کرتا ہے اور انہیں اچھا اور پسندیدہ تصور کرتا ہے، حالانکہ اسے یہ شعور بھی نہیں ہوتا کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن پر اہلِ جاہلیت کاربند تھے، یا ان سے ملتی جلتی، بلکہ بعض اوقات ان سے بھی زیادہ بری ہوتی ہیں۔
نتیجتاً اسلام کی مضبوط گرہیں اس کے دل سے ایک ایک کر کے کھلنے لگتی ہیں۔ پھر نیکی برائی اور برائی نیکی بن جاتی ہے، بدعت سنت کا روپ دھار لیتی ہے اور سنت بدعت قرار پاتی ہے۔ خالص ایمان اور توحید کو اختیار کرنے والے شخص کو کافر کہا جاتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی کامل پیروی اور خواہشاتِ نفس و بدعات سے کنارہ کشی اختیار کرنے والے کو بدعتی قرار دیا جاتا ہے۔ اور جس شخص کو بصیرت نصیب ہو اور جس کا دل زندہ ہو، وہ ان حقائق کو اپنی آنکھوں سے وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ واللہ المستعان۔“

(جاری ہے، ان شاءاللہ)

☆☆☆☆☆

بقیہ: حرب ظاہری کا حربہ باطنی

یہاں سے ایک نہایت دلچسپ اور اہم بحث شروع ہوتی ہے، جسے بعض معاصر مسلم مفکرین یوں بیان کرتے ہیں:

جدید انسان خدا سے دور صرف اس لیے نہیں ہوا کہ اس نے خدا کو رد کر دیا بلکہ اس لیے ہوا کہ اس نے ایک خاص Epistemology قبول کر لی۔ یعنی اس نے پہلے یہ طے کر لیا کہ ”صرف وہی چیز قابلِ علم ہے جو حواس یا تجربے سے ثابت ہو سکے“۔ جب یہ اصول قبول کر لیا گیا تو خدا، وحی، روح، فرشتے اور آخرت خود بخود دائرۂ علم سے باہر چلے گئے۔

یہی وجہ ہے کہ اصل معرکہ آج اکثر ”خدا کے وجود“ پر نہیں بلکہ ”علم کی تعریف“ پر ہوتا ہے۔ اگر علم صرف تجربہ گاہ میں ناپی جانے والی چیزوں کا نام ہے تو یقیناً خدا، اخلاق، حسن، محبت اور مقصد سب مشکل میں پڑ جائیں گے، لیکن اگر علم کا دائرہ عقل، فطرت، اخلاقی شعور، وجدانی ادراک اور وحی تک پھیلتا ہے تو پھر تصویر یکسر بدل جاتی ہے، اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں ہماری گزشتہ گفتگو دوبارہ سامنے آتی ہے:

وجودِ باری کا سوال دراصل Epistemology کے سوال سے جدا نہیں۔

غرضیکہ انسان خدا کو اکثر اس لیے نہیں کھوتا کہ اس کے پاس خدا کے خلاف کوئی قطعی دلیل آگئی ہوتی ہے، بلکہ اس لیے کہ اس نے حقیقت کو دیکھنے کے لیے ایک ایسا چشمہ پہن لیا ہوتا ہے جس میں خدا کو دیکھنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کی دعوت صرف ”خدا موجود ہے“ کہنے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ انسان کو یہ بھی سکھاتی ہے کہ حقیقت کو دیکھنے کا صحیح زاویہ کیا ہے، علم کیا ہے، انسان کیا ہے، اور کائنات کا مطلب کیا ہے۔

(جاری ہے، ان شاءاللہ)

☆☆☆☆☆

آج کا نوجوان اسلامی ہے!

”دیکھیے! کل تک کا مسلمان صرف پاکستانی، ہندوستانی، مصری و سعودی تھا...... لیکن آج کا نوجوان اسلامی ہے...... ایک کلمہ کی سرحدوں کو ماننے والا، جو لکیریں کلمے نے طے کی ہیں ان کو اپنے خون سے امت کو سمجھانے والا، اس کے علاوہ ہر لکیر کو مٹانے کا عزم لیے...... وہ ایک مسلمان ہے! وہ کہتا ہے کہ اگر شام میں کسی مسلمان کا خون گرتا ہے تو یہ میرا خون ہے! افغانستان میں ایک مسلمان کا خون گرتا ہے تو یہ میرا خون ہے! وہ کہتا ہے کہ اگر ہندوستان میں کسی مسلمان کا خون گرتا ہے تو یہ میرا خون ہے، اگرچہ مولویانِ برہمن اس کو کہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان پہلے ہندوستانی ہے، حالانکہ یہ خود کو دھوکہ دیتے ہیں یا اس مال کا احسان چکاتے ہیں جو برہمن کی جانب سے ان کو عطا کیا جاتا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ دور گزر چکے! امت آج کہیں اور کھڑی ہے! نوجوان کو اب مولویانِ برہمن ہندوستانی لکیروں میں قید نہ کھ سکیں گے، امت امت بن کر جیے گی! اس کا جینا اور اس کا مرنا اسی کلمے کی خاطر ہو گا!“

حضرت الأمیر مولانا عاصم عمر سنبھلی شہید رحمۃ اللہ علیہ

حربِ ظاہری کا حربۂ باطنی

مولانا ابن عمر عمرانی گجراتی

ضرورتِ وحی

جب ہم اسلامی علمیات (epistemology) پر آتے ہیں اور ذریعۂ وحی کو بطورِ سببِ علم پہلا و ابتدائی سبب بتاتے ہیں تو اکثر ایک معقول سوال یہ پیش آتا ہے کہ وحی کی ضرورت در حقیقت کیوں ہے؟

اس سوال کا کچھ سادہ سا جواب تو ضمنی طور پر گزشتہ قسطوں میں آتا رہا کہ جب قومیں وحی سے دور ہوتی ہیں تو تاریخ شاہد ہے کہ بدترین انحطاطِ فکری و اخلاقی کو پہنچ جاتی ہیں یعنی ایک غیبی راہنمائی، علوی تربیت، روحِ انسانی کے ساتھ ملکوتی ربط فطری ضرورت ہے سلامت افکار و اقدار کے لیے، نیز انسانی عقل اور تجربات حقائق کے ادراک کے لیے کافی نہیں ہیں، بدیہی بات ہے کہ تقریباً ہر عقل کی سمت اور اس کا ناحیہ مختلف ہوتا ہے اس وجہ سے بھی ادراکِ حقیقت میں حتمیت حاصل نہیں ہوتی، اسی لیے کئی بار دو ذہین سمجھے جانے والے لوگ ایک ہی مسئلے پر بالکل مختلف نتائج تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ پہنچے ہیں جیسا Isaac Newton اور Stephen Hawkins دونوں اعلیٰ ذہانت رکھنے والوں میں شمار کیے جاتے رہے ہیں لیکن جب محض عقل کے ذریعے وجودِ باری پر بات کرتے ہیں تو ایک اثبات کرتا ہے اور دوسرا نفی حالانکہ ان کے ضوابط ان کی Equations ان کے تجربے عموماً معاملوں میں یکساں ہیں لیکن ایک اہم اور سیدھے مسئلے میں اتنا بڑا اختلاف، تو پوری انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ فلاسفہ، مفکرین اور دانشور ہزاروں سال سے حقیقت، اخلاق، خیر و شر اور زندگی کے مقاصد پر اختلاف کرتے آ رہے ہیں اور کوئی اتفاقی فیصلہ کن نکتے پر جمع نہیں ہو پا رہے ہیں تو اگر عقل اکیلی ہی کافی ہوتی تو اتنے بنیادی سوالات پر اتنا شدید اختلاف نہ ہوتا۔ یہی بات تجربات کے باب میں ہے کہ وہ محدود ہوتے ہیں اور مختلف ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے سائنسی زاویے سے 'کیسے' کا جواب تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن 'کیوں' کا کبھی کوئی قطعی جواب نہیں مل پاتا۔ اس کے علاوہ اہم بات یہ کہ عقل و تجربات سے حاصل ہونے والے حقائق کوئی تربیتی ہدایت نہیں ہوتے ہیں بلکہ اپنے آپ میں بس ایک معلومات اور دریافت ہوتے ہیں، جبکہ وہ انسان جسے ایک معاشرہ ترتیب دینا ہے عائلی نظام منظم کرنا ہے اسے تربیاتی ہدایت کی زیادہ ضرورت ہے دریافت شدہ معلومات کے بنسبت۔ سائنس ایٹم کو تقسیم کرنا تو سکھا دے گی (معلومات فراہم کر دے گی) لیکن یہ فیصلہ نہیں کر سکے گی کہ اس علم کو دوا بنانے کے لیے استعمال کیا جائے یا بم بنانے کے لیے، یعنی تربیتی ہدایت نہیں دے سکے گی۔

ان سب کے علاوہ وحی کی ضرورت کی سب سے بڑی وجہ انسان کی اپنی فطری تلاش ہے، چونکہ انسان دیگر خلائقِ عالم سے مختلف نوع کی مخلوق ہے، اپنی عقل میں بھی اور فطرت میں بھی اسی لیے عموماً ایک عام انسان جب اس کائنات کو دیکھتا ہے تو سب سے پہلے اس کے سامنے "وجود" کا سوال آتا ہے، مثلاً یہ دنیا کیوں ہے؟ کچھ بھی نہ ہونے کے بجائے کچھ موجود کیوں ہے؟ سورج، چاند، ستارے، زمین، زندگی، شعور، عقل، محبت، حسن اور اخلاق احساسات کہاں سے آئے؟ الغرض سوچ اور وجدان ایک معنیٰ اور اعلیٰ حقیقت کو ڈھونڈنے لگتے ہیں اپنی مقصدیت کی جستجو ہونے لگتی ہے۔

یہ دعویٰ محض مذہبی روایت کا نہیں بلکہ فلسفہ، نفسیات، بشریات (Anthropology) میں بھی ایک نہایت سنجیدہ موضوع رہا ہے۔ بیشتر ماہرین یہ کہتے ہیں کہ انسان میں معنیٰ (meaning)، مقصد (purpose) اور ماورائے خود کسی حقیقت (transcendence) کی تلاش ایک گہرا اور تقریباً آفاقی رجحان ہے۔

مثال کے طور پر Viktor Frankl، جو بیسویں صدی کا مشہور ماہرِ نفسیات تھا اور نازی کیمپوں سے زندہ نکلا، اپنی مشہور کتاب "Man's Search for Meaning" میں کہتا ہے:

> "Life is not primarily a quest for pleasure, as Freud believed, or a quest for power, as Alfred Adler taught, but a quest for meaning."

> "انسان کی بنیادی نفسیاتی ضرورت محض لذت نہیں جیسا کہ فرائیڈ نامی مفکر کا ماننا ہے اور طاقت بھی نہیں جیسا کہ ایڈلر کا کہنا ہے بلکہ معنیٰ کی تلاش ہے۔"

اسی طرح مشہور ماہرِ نفسیات Carl Jung نے اپنی طویل نفسیاتی پریکٹس کے بعد اپنی کتاب "Modern Man in Search of a Soul" ایک دلچسپ مشاہدہ بیان کیا کہ:

> "Among all my patients in the second half of life that is to say, over thirty five there has not been one whose problem in the last resort was not that of finding a religious outlook on life. It is safe to say that every one of them fell ill because he had lost what the living religions of every age have given to their followers, and none of them has been really healed who did not regain his religious outlook."

> "عمر کے دوسرے حصے (یعنی پینتیس سال سے اوپر) کے میرے تمام مریضوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کا اصل اور آخری مسئلہ زندگی کے بارے میں ایک 'مذہبی / روحانی نقطۂ نظر' تلاش کرنا نہ ہو، یہ

کہنا بالکل بجا ہو گا کہ ان میں سے ہر ایک شخص اس لیے بیمار (نفسیاتی مسائل کا شکار) ہوا کیونکہ اس نے وہ چیز کھو دی تھی جو ہر دور کے زندہ مذاہب اپنے ماننے والوں کو دیتے ہیں (یعنی مقصد اور اعلیٰ حقیقت سے تعلق) اور ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک سچے معنوں میں شفایاب نہیں ہوا جب تک اس نے اپنا وہ روحانی یا مذہبی نقطہ نظر دوبارہ حاصل نہیں کر لیا۔"

امریکی ماہر نفسیات William James نے اپنی مشہور کتاب "The Varieties of Religious Experience" میں مختلف مذہبی اور روحانی تجربات کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مذہبی رجحان انسانی تجربے کا ایک انتہائی حقیقی اور وسیع پہلو ہے، جسے محض وہم یا بیماری کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بشریات (Anthropology) کے میدان میں بھی ایک دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے۔ دنیا کی ہزاروں تہذیبوں اور قبائل کا مطالعہ کرنے والے محققین نے دیکھا کہ تقریباً ہر انسانی معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں عبادت، مقدس حقیقت، روحانی دنیا، دیوتاؤں، خدا یا مابعد الطبعیاتی عقائد کا وجود ملتا ہے۔ شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، مگر "ماورائی حقیقت" کی تلاش تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے بشریات مذہب کو "human universal" کے قریب ترین مظاہر میں شمار کرتے ہیں۔

فلسفے میں بلیز پاسکل (Blaise Pascal)[1] نے انسان کے دل میں موجود ایک "خلا" (void) کا ذکر کیا جو ان کے بقول صرف خدا سے پُر ہو سکتا ہے، اگرچہ یہ ایک فلسفیانہ استدلال ہے، تجرباتی سائنس نہیں، لیکن مغربی فکری روایت میں اس کا بہت اثر رہا ہے۔

جدید دور میں پیٹر برجر (Peter Berger) اور چارلس ٹیلر (Charles Taylor)، جو بیسویں اور اکیسویں صدی کے وہ دو بڑے نام ہیں، نے روایتی "سیکولرائزیشن تھیوری" (Secularization Theory)، جو یہ دعویٰ کرتی تھی کہ جیسے جیسے دنیا جدید ہو گی، مذہب اور ماورائیت کا خاتمہ ہو جائے گا، کو علمی سطح پر چیلنج کیا۔

پیٹر برجر نے اپنی کتاب "A Rumor of Angels: Modern Society and the Rediscovery of the Supernatural" (۱۹۶۹ء) میں یہ ثابت کیا کہ سیکولر دور میں بھی انسانی جبلت سے ماورائیت (Transcendence) کی پیاس ختم نہیں ہوئی۔ وہ انہیں "Signals of Transcendence" (ماورائیت کے اشارے) کہتا ہے، جو عام انسانی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ اپنی ایک اور اہم کتاب "The Desecularization of the World" (۱۹۹۹ء) میں وہ روایتی نظریے کو مسترد کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"The assumption that we live in a secularized world is false. The world today is as furiously religious as it ever was, and in some places more so than ever. This means that a whole body of literature by historians and sociologists, loosely labeled 'secularization theory,' was essentially mistaken."

"یہ مفروضہ کہ ہم ایک سیکولرائزڈ (مذہب سے آزاد) دنیا میں رہ رہے ہیں، بالکل غلط ہے۔ آج کی دنیا اتنی ہی شدت سے مذہبی ہے جتنی وہ ہمیشہ سے تھی، بلکہ کچھ مقامات پر تو پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ دانوں اور ماہرین سماجیات کا وہ تمام لٹریچر، جسے 'سیکولرائزیشن تھیوری' کا نام دیا جاتا ہے، بنیادی طور پر غلط تھا۔"

کینیڈین فلسفی چارلس ٹیلر نے اپنی ضخیم اور شاہکار کتاب "A Secular Age" (۲۰۰۷ء) میں سیکولر دور کا گہرا فلسفیانہ تجزیہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جدید دور میں انسان نے خود کو ایک مادی خول میں بند کر لیا ہے جسے وہ "Buffered Self" کہتا ہے، لیکن اس خول کے اندر بند ہونے کے باوجود انسان مستقل ایک باطنی بے چینی (Spiritual Malaise) اور خلا محسوس کرتا ہے۔ وہ اس کیفیت کو "The Immanent Frame" کہتا ہے، جہاں انسان خدا کے بغیر جینے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن اس مادی فریم کے اندر رہتے ہوئے بھی وہ ماورائیت (Transcendence) کے لیے تڑپتا ہے۔

چارلس ٹیلر لکھتا ہے:

"We feel a certain malaise in the immanent frame. Many people, even those who do not believe in God, feel a sense of emptiness, a lack of meaning, or a longing for something 'beyond' that the purely materialistic world cannot satisfy. The sense of transcendence remains an open question and a haunting presence"

"ہم مادی اور دنیاوی فریم کے اندر ایک خاص قسم کی بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ، یہاں تک کہ وہ بھی جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، ایک خالی پن، معنی کا فقدان، یا کسی ایسی چیز کی تڑپ محسوس کرتے ہیں جو 'اس مادی دنیا سے پرے' (Beyond) ہو، جسے خالص مادی دنیا مطمئن نہیں کر سکتی۔ ماورائیت کا یہ احساس (جدید دور میں بھی) ایک کھلا سوال اور ایک ایسی حقیقت بھی ہے جو مسلسل اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہے۔"

---

[1] بلیز پاسکل (Blaise Pascal) (۱۶۲۳–۱۶۶۲) فرانس کا مشہور ریاضی دان، طبعیات دان، موجد اور فلسفی تھا اسے جدید احتمال (Probability Theory) کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس نے ریاضی، طبعیات اور فلسفے میں اہم کارنامے انجام دیے، فلسفہ اور مذہب کے میدان میں اپنی کتاب Pensées کی وجہ سے معروف ہے۔

ان غیر اسلامی ماہرین و مفکرین کے تجزیوں اور تبصروں سے اس بات کو بتانا پیش نظر ہے کہ انسان کے اندر ایک فطری پکار ہے مقصدیت اور معنویت (میں کون ہوں، میرے وجود کی حقیقت کیا ہے؟ کون مجھے وجود دینے والا ہے، میں دنیا میں کیوں آیا ہوں وغیرہ سوالات) کی طبعی جستجو ہے۔ یہ صرف اسلام کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک آفاقی حقیقت ہے جس پر غیر اسلامی ماہرین بھی متفق ہیں چاہے Sigmund Freud اور Rechard Dawkins جیسے بعض ملحد مفکرین وجود خدا اور حقیقت مذاہب کو افسانہ جانتے ہوں۔

اس کے باوجود ایک بات تقریباً غیر متنازع ہے کہ انسان بار بار اپنے ضمیر سے یہ بنیادی سوالات ضرور پوچھتا ہے:

- میں کہاں سے آیا ہوں؟
- میں کیوں آیا ہوں؟
- میں کہاں جا رہا ہوں؟

یہ سوالات تاریخ، جغرافیہ، نسل اور تہذیب کی حدود سے ماورا نظر آتے ہیں۔

تو بس یہی نکتہ اسلامی فکر میں ''فطرت'' کے تصور سے جڑتا ہے۔ صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے......'' (صحیح بخاری)

اسلامی علماء، خصوصاً امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہا اللہ نے اس فطرت کو انسان کے اندر موجود خدا شناسی اور حق کی طرف میلان کے طور پر سمجھا ہے ان کے نزدیک الحاد ایک فطری کیفیت نہیں بلکہ بعد میں پیدا ہونے والے فکری یا معاشرتی عوامل کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

کلی طور پر شاید یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہر انسان خدا کو تلاشتا ہے، لیکن اگر کوئی پوچھے کہ ''کیا مقصد، معنی، اخلاق اور کسی اعلیٰ حقیقت کی تلاش انسانی فطرت کا ایک بہت وسیع اور تقریباً آفاقی رجحان ہے؟'' تو فلسفہ، نفسیات، بشریات اور مذہبی تاریخ کا بڑا حصہ اس کے حق میں شواہد فراہم کرتا ہے۔

چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی استدلال کہتا ہے: اگر پیاس موجود ہے تو پانی کا وجود بھی معنی رکھتا ہے اگر انسان کے اندر مقصد اور خالق کی جستجو اتنی گہری اور مسلسل ہے تو یہ خود اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے کہ شاید یہ جستجو محض ایک حادثہ نہیں، بلکہ انسانی فطرت کے اندر رکھا گیا ایک اشارہ (sign post) ہے جو اسے اپنے اصل کی طرف بلاتا ہے۔

الغرض ضرورت وحی ایک فطری پکار ہے ایک اندرونی جستجو ہے اور روحانی تقاضا ہے۔

ضرورت وحی اور وجود باری کا تلازم

اب جب ضرورت وحی کا احساس جاگتا ہے تو اس کی کمالِ طلب یہ ہوتی ہے کہ فطرتِ انسان کسی باشعور ذات، باکمال خالق، باقدرت الٰہ کا تقاضا کرے جو انسانوں کی دھڑک اور پھڑک سے لے کر کائنات کے ہر گوشے، کہکشاؤں کے ہر گوشے کے حوالے سے علیم و خبیر ہو ورنہ (ایسے وجود کی تشنگی نہ محسوس ہو تو) وہ وحی کی ضرورت کا یہ احساس محض اس کی نظریاتی تمنا بن کر رہ جائے گا گویا کہ راہ درکار ہے لیکن رہبر نہیں ہے یا ماننا نہیں، پھر ایسے لوگ (جو ضرورتِ وحی کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن وجود خدا کو تسلیم کرنا بار یا غیر معقول سمجھتے ہیں) ایسے ہی حسرتوں اور گمراہیوں میں بھٹکتے بھٹکتے ختم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک وہ طبقہ ہے جو وجود خدا کو تو مانتا ہے لیکن ضرورت وحی کا احساس نہیں کرتا وہ لوگ بھی بھٹکتے رہ جاتے ہیں، اس غلط فہمی میں پڑے رہ جاتے ہیں کہ جس طرح دیگر جانوروں کو خدا نے پیدا کیا ہم بھی جانور ہیں ہمیں بھی ویسے ہی پیدا کیا اور ہماری زندگی بھی بس کھانا پینا لذت حاصل کرنا اور آخر میں مر جانا اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس اعتبار سے پھر خدا کے ماننے والے اور نہ ماننے والے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ کمال فطرت تو یہ کہتی ہے کہ اس باشعور اور باقدرت ذات نے ایسے ہی پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا اتنی اعلیٰ سطح کی عقل انسانی کو آوارہ نہیں رکھا۔

تو ایک فکرِ کامل اگر وجود باری کی قائل ہوتی ہے تو لازماً اس کی جانب سے ہدایت و وحی کی خواہاں ہوتی ہے ضرورت محسوس کرتی ہے اور اگر پہلے ضرورت وحی کا احساس کرتی ہے تو وجود باری کو لازم گردانتی ہے، چنانچہ ضرورت وحی اور وجود باری میں لازم ملزوم کا تعلق ہے۔

وجود باری پر کچھ عقلی و منطقی دلائل

ویسے تو یہ نکتہ کہ، عموماً ہر انسان نفسیاتی طور پر مقصدیت و معنویت کی فطری تلاش رکھتا ہے جو اسے غیبی راہنمائی کا خواہاں بناتی ہے پھر غیبی راہنمائی کی چاہت اسے اس راہنمائی کرنے والی غیبی ذات کے وجود کی جانب کھینچتی ہے، کافی ہے وجود باری کو باور کرانے میں۔ یہ ایک ایسا سادہ نکتہ ہے جو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو خدا و وحی کی حقیقت سمجھنے میں بہت زیادہ کلامی و فلسفی بحثوں کی ضرورت پیش نہیں آتی، لیکن پھر بھی مستقل طور پر مختصراً ان دلائل کا استحضار مناسب اور مفید لگتا ہے۔

راقم الحروف کے خیال میں وجود باری پر چار دلائل ایسے ہیں جو منکرین و ملحدین کے اعتراضات کا واقعی ٹھوس جواب ہیں اور حق کے متلاشیوں کے لیے چراغِ راہ ہیں۔

۱. وجود خلق دلیل ہے وجود خالق پر

یہ ایک سادہ مگر سنجیدہ حقیقت و دلیل ہے وجود باری پر۔ لاکھ سائنسی تھیوریز پیدا ہو جائیں، لاکھ جدید انکشافات رونما ہو جائیں اس آسان اور بنیادی دلیل کو قطعاً جھٹلا نہیں سکتے بلکہ جوں

جوں قانونِ طبیعیات (law of physics) کا مطالعہ وانکشاف ہوتا ہے تو یہ سوال مزید حیرانی کے ساتھ ابھر آتا ہے کہ یہ ساری کائنات کا خود بخود اتنا perfect میزان میں بن جانا، یہ آسمانوں پر کئی سارے غلافوں (ozone layers) وغیرہ کا جڑ جانا جس سے براہ راست سورج کی تباہ کن تابناکی سے زمین کی حفاظت ہو جاتی ہے، ایک چھوٹی سی مخلوق چیونٹی کو دیکھ لیں جو دیوار پر چڑھ کر بیسیوں مرتبہ گرتی ہے اس کا بغیر ہڈی کے تخلیق ہو جانا، گوشت خوری کی فطرت رکھنے والے جانوروں کا نوکیلے دانت والا ہونا اور سبزی خور جانوروں کا پست دانتوں والا ہونا، پھر ہر انسان کے جسم میں موجود ۹۶ ہزار کلو میٹر کے بقدر لمبی خون کی وریدوں (blood vessels) کا منظم انداز میں فٹ ہو جانا اور سمٹ جانا، یہ سب اور پھر سارے قوانین طبیعیات و فطرت کا متوازن انداز میں چلنا یہ سارے امور محض ارتقا (evolution) کے طور پر کیسے ہو سکتے ہیں کہ سب خود بخود تیار ہو جائیں، پھر بن جانے سے زیادہ پیچیدہ اور سنجیدہ سوال سارے نظام کے ہزاروں لاکھوں سالوں سے طے شدہ رفتار و میزان میں چلنے کو لے کر ہوتا ہے۔ سائنسی اصطلاح میں اسے ”فائن ٹیوننگ“ (Fine-Tuning) کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ کائنات کے تمام بنیادی قوانین اور قوتیں انتہائی باریک بینی اور توازن کے ساتھ سیٹ کی گئی ہیں۔

اب گریویٹی کو ہی دیکھ لیں، اگر کائنات میں گریویٹی (کششِ ثقل) کی قوت میں معمولی سی کمی یا بیشی بھی ہو جائے تو یہ کائنات مکمل طور پر فنا ہو سکتی ہے۔

اگر کائنات میں کششِ ثقل موجودہ طاقت سے تھوڑی سی بھی کمزور ہو جائے تو ستارے اور کہکشائیں نہیں بنیں گی، بگ بینگ کے بعد مادہ (Matter) خلا میں اس طرح پھیل جاتا کہ گریویٹی اسے اکٹھا کر کے ستارے، سیارے اور کہکشائیں نہ بنا پاتی، پھر گریویٹی کم ہونے سے سورج سیکنڈوں میں پھٹ جائے گا کیونکہ سورج جیسے ستاروں کے مرکز میں نیوکلیئر فیوژن کا بیرونی دباؤ اور گریویٹی کا اندرونی دباؤ ایک دوسرے کو متوازن رکھتے ہیں۔

اسی طرح اگر بڑھ جائے تو ایک اثر یہ ہو کہ انسانوں، جانوروں اور عمارتوں کا وزن اتنا بڑھ جائے گا کہ ہڈیاں اور ڈھانچے اپنے ہی بوجھ سے ٹوٹ جائیں گے۔ زمین کا اندرونی حصہ شدید دباؤ کے باعث پھٹ پڑے گا جس سے قیامت خیز زلزلے اور آتش فشاں آئیں گے۔

ایسے امور عقل کے دریچے کھٹکھٹاتے ہیں اور وجود باری کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اسی نکتے کو قرآن بار بار انسان کی روح سے مخاطب ہو کر بیان کرتا ہے:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ۝ (سورۃ الطور: ۳۵)

”کیا یہ لوگ بغیر کسی کے آپ سے آپ پیدا ہو گئے، یا یہ خود (اپنے) خالق ہیں؟“

یہ تو ایک گریوٹی پر بات ہوئی باقی اور نہ جانے ایسے کتنے باریک قوانین طبیعیات ہیں جن کی پیچیدگیاں ملحدین و منکرین کو بھی اس اقرار پر مجبور کر رہی ہے کہ کوئی عظیم تر توانائی (Supreme Energy) ہے جو اس نظام کو چلا رہی ہے۔[۲]

۲. دلیل فطرت

دلیل فطرت کا ایک پہلو تو وہ ہے جس کے حوالے سے اوپر گفتگو ہوئی کہ ضرورت وحی کا احساس خود وجود خدا کی سوچ کا تقاضا کرتا ہے، اس کے علاوہ طبعی طور پر انسان پر زندگی میں کئی بار ایسے مواقع آتے ہیں جو اسے ایک غیبی ذات کی طرف متوجہ کرتے ہیں اس کی نگاہوں کو آسمان کی طرف بلند کر دیتے ہیں۔ بطور مثال مصیبت کا لمحہ جس کی قرآن کریم بھی منظر کشی کرتا ہے کہ سمندر میں چلتی کشتی جب بھور میں پھنس جاتی ہے اور کنارہ نظر

---

۲. کئی مغربی سائنسدان و مفکرین ملحد یا لاادری (agnostic) پس منظر رکھتے تھے، لیکن کائنات کے نظم، قوانینِ فطرت اور "Fine-Tuning" کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نتیجے کے قریب پہنچے کہ کائنات کے پیچھے کوئی عظیم ذہانت (Super Intelligence) یا فوق الطبعی نظم کارفرما معلوم ہوتی ہے، تو ان میں چند نام بہت نمایاں ہیں، جیسے:

- Fred Hoyle برطانوی ماہرِ فلکیات اور ماہرِ کونیات بیسویں صدی کے بڑے سائنس دانوں میں شمار ہوتا ہے، وہ ابتدا میں الحاد اور مادیت کی طرف مائل تھے، لیکن کائنات میں کاربن (Carbon) کی تشکیل اور طبیعیاتی مستقلات (Physical Constants) کے حیرت انگیز توازن پر غور کرتے ہوئے انہوں نے مشہور جملہ کہا:

  "A commonsense interpretation of the facts suggests that a super intellect has monkeyed with physics, as well as with chemistry and biology, and that there are no blind forces worth speaking about in nature."

  "حقائق کی سادہ فہم تعبیر یہ بتاتی ہے کہ کسی عظیم فوق العادہ عقل (Super intellect) نے طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات میں مداخلت کی ہے، اور فطرت میں ایسی کوئی اندھی قوت دکھائی نہیں دیتی جسے قابلِ ذکر کہا جا سکے۔“ (The Intelligent Universe)

- اسی طرح Paul Davies موجودہ دور کا معروف طبیعیات دان اور ماہرِ کونیات ہے وہ روایتی مذہبی مفکر نہیں، لیکن کائنات کے نظم اور قوانین پر اس کی تحریریں بہت مشہور ہیں۔

  اس نے لکھا:

  "Scientists are slowly waking up to an inconvenient truth — the universe looks suspiciously like a fix."

  ”سائنس دان آہستہ آہستہ ایک ناگوار حقیقت کی طرف بیدار ہو رہے ہیں کہ کائنات مشتبہ حد تک ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے اسے جان بوجھ کر ترتیب دیا گیا ہو۔“ (The Mind of God)

- اور انتہائی اہم حوالہ Antony Flew کا ہے جو بیسویں صدی کے مشہور ترین ملحد فلسفیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے تقریباً پچاس برس الحاد کا دفاع کیا، لیکن عمر کے آخری حصے میں حیاتیات اور DNA کی پیچیدگی پر غور کرتے ہوئے کہا:

  "I now believe that the universe was brought into existence by an Infinite Intelligence"

  ”اب میں یقین رکھتا ہوں کہ کائنات کو ایک لامحدود عقل نے وجود میں لایا ہے۔“

  اس نے اپنی کتاب There Is a God میں اس تبدیلی کی تفصیل بیان کی ہے۔ (There Is a God)

سے روپوش رہتا ہے تو بجز خدا کے اور کوئی ہستی کا استحضار نہیں آتا جیسا کہ ایک امریکی ملحد Cat Stevens کے ساتھ معاملہ پیش آیا تھا جو اس کے اسلام کا سبب بنا۔[33]

اور یہ دلیل صرف مصیبت تک محدود نہیں۔ محبت، حسن، حیرت، تنہائی، موت، بچے کی پیدائش، کسی عظیم منظر کا مشاہدہ، یہ سب بھی انسان کے اندر کسی ماورائی حقیقت کی طرف میلان پیدا کرتے ہیں۔ اسی لیے Blaise Pascal نے کہا تھا کہ انسان کے دل میں ایک ایسی گہرائی ہے جسے دنیا کی کوئی محدود چیز بھر نہیں سکتی۔ اور اسلامی زبان میں یہی ''فطرت'' ہے

تو بہر حال، ایسے کئی مواقع آتے ہیں جن میں فطرت خدا کو یاد کرتی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ خدا کون ہے کہاں ہے کیسا ہے، بس ایک دستک دل پر آتی ہے کہ کوئی تو ذات ہے جس کی طرف غیر اختیاری طور پر دل کی توجہ چلی جا رہی ہے۔

۳. دلیل امکان و وجوب اور اس پر قدرے علمی و تفصیلی نظر

وجودِ باری تعالیٰ پر قائم ہونے والی عقلی دلیلوں میں ''دلیلِ امکان و وجوب'' (Argument from Contingency / Necessary Being Argument) کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ بہت سے اہلِ فلسفہ، متکلمین اور مفکرین نے اسے وجودِ خدا کے قوی ترین عقلی دلائل میں شمار کیا ہے، اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہ دلیل کسی خاص مذہب، کسی مخصوص صحیفے یا کسی سائنسی نظریے پر موقوف نہیں، بلکہ خود ''وجود'' (Being) کی حقیقت سے اپنا استدلال اخذ کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی جڑیں قدیم فلسفے میں بھی ملتی ہیں، اسلامی فلسفے میں بھی، اور جدید فلسفۂ مذہب میں بھی۔ اس دلیل کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ایک نہایت سادہ سوال پر غور کیجیے:

یہ چیزیں جو ہمارے ارد گرد موجود ہیں، کیا ان کا وجود لازمی تھا یا ممکن تھا؟

مثلاً آپ، میں، زمین، سورج، درخت، پہاڑ، سمندر، حتیٰ کہ پوری کائنات کیا یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کا وجود ضروری تھا؟ یا یہ بھی ممکن تھا کہ یہ نہ ہوتیں؟

عقل فوراً جواب دیتی ہے کہ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو ہو سکتی تھیں اور نہ بھی ہو سکتی تھیں۔ آپ کی پیدائش ایک خاص وقت میں ہوئی، اگر بعض حالات مختلف ہوتے تو آپ پیدا نہ ہوتے ایک درخت اگتا ہے اور پھر سوکھ جاتا ہے۔ ایک ستارہ بنتا ہے اور پھر فنا ہو جاتا ہے۔ کائنات میں موجود ہر چیز تغیر، امکان اور احتیاج کی حامل ہے۔

فلسفیانہ زبان میں ایسی چیز کو ''ممکن الوجود'' (Contingent Being) کہا جاتا ہے۔ ممکن الوجود کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وجود اور عدم دونوں کا امکان ہو اور وہ بذاتِ خود اپنے وجود کا تقاضا نہیں کرتی، اس کا وجود کسی اور چیز پر موقوف ہوتا ہے۔

یہاں سے اصل استدلال شروع ہوتا ہے۔ اگر ہر موجود چیز ممکن الوجود ہے، تو پھر سوال پیدا ہو گا کہ ان سب کے وجود کی آخری توجیہ کیا ہے؟ اگر ہر چیز کسی دوسری چیز پر منحصر ہے، تو یہ انحصار آخر کہاں جا کر رکے گا؟

فرض کیجیے آپ ایک کتاب دیکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں: یہ کہاں سے آئی؟ جواب ملتا ہے: فلاں شخص نے دی۔ آپ پوچھتے ہیں: اسے کہاں سے ملی؟ جواب آتا ہے: کسی اور نے دی۔ پھر آپ پوچھتے ہیں: اسے کس نے دی؟

اگر یہی سلسلہ لامتناہی چلتا رہے اور کہیں بھی کوئی اصل مالک یا اصل مصدر نہ ہو، تو کتاب کی موجودگی کی معقول توجیہ حاصل نہیں ہو گی۔

اسی طرح اگر پوری کائنات میں ہر چیز صرف دوسری محتاج چیزوں پر کھڑی ہو، اور کہیں بھی کوئی غیر محتاج حقیقت موجود نہ ہو، تو وجود کی آخری توضیح کبھی حاصل نہیں ہو گی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں عقل ایک ایسے وجود کا تقاضا کرتی ہے جو خود کسی اور کا محتاج نہ ہو، جو اپنا وجود کسی اور سے حاصل نہ کرتا ہو، جو ممکن نہیں بلکہ واجب ہو۔ اسلامی فلسفے کی اصطلاح میں اسے ''واجب الوجود'' کہا جاتا ہے۔ واجب الوجود وہ ہے جس کے بارے میں عدم کا تصور ممکن نہ ہو اور وہ کسی سبب سے پیدا نہ ہوا ہو، بلکہ باقی تمام اسباب اور موجودات بالآخر اسی پر قائم ہوں۔ یہ استدلال اسلامی فلسفے میں اپنی نہایت ترقی یافتہ شکل میں ابن سینا کے ہاں ملتا ہے۔ ابن سینا نے وجود کو دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا:

۱. ممکن الوجود
۲. واجب الوجود

---

[33]. مشہور برطانوی گلوکار یوسف اسلام (سابق Cat Stevens) کی قبولِ اسلام کی داستان دلیل فطرت کے شواہد میں سے ایک ہے۔ Cat Stevens بیسویں صدی کے مقبول ترین موسیقاروں میں شمار ہوتے تھے، شہرت، دولت، عزت اور دنیاوی کامیابی ان کے قدموں میں تھی، لیکن اس سب کے باوجود ان کے اندر ایک فکری اور روحانی خلا موجود تھا۔ ان کی اپنی بیان کردہ روداد کے مطابق ۱۹۷۵ء میں وہ کیلی فورنیا کے کسی سمندر میں تیراکی کر رہے تھے کہ اس دوران شدید لہروں میں پھنس گئے اور ڈوبنے کے قریب پہنچ گئے، اس نازک لمحے میں، جب ظاہری اسباب تقریباً ختم ہو چکے تھے، ان کے دل سے بے ساختہ خدا کی طرف رجوع پیدا ہوا، بعد میں انہوں نے بیان کیا کہ انہوں نے خدا سے مدد مانگی اور عہد کیا کہ اگر وہ بچ گئے تو اپنی زندگی کو حقیقت کی تلاش کے لیے وقف کر دیں گے۔

یہ واقعہ بذاتِ خود خدا کے وجود کا منطقی برہان نہیں، لیکن انسانی فطرت کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔ انسان جب اپنی بے بسی کا حقیقی تجربہ کرتا ہے تو اس کے اندر سے ایک فطری رجحان ابھرتا ہے جو کسی اعلیٰ اور قادر ہستی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اسلامی روایت ''فطرت'' کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد ان کے بھائی نے انہیں قرآنِ مجید کا ایک نسخہ تحفے میں دیا، انہوں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا اور محسوس کیا کہ وہ سوالات جن کے جواب وہ مختلف فلسفوں، روحانی تحریکوں اور زندگی کے تجربات میں تلاش کر رہے تھے، قرآن انہیں ایک مربوط اور معقول شکل میں پیش کر رہا ہے، بالآخر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام یوسف اسلام رکھ لیا۔
(Encyclopaedia Britannica, Cat Stevens, Yusuf Islam)

ان کے مطابق اگر تمام موجودات ممکن الوجود ہوں تو ان کے مجموعے کو بھی کسی علت کی ضرورت ہوگی اور چونکہ تسلسلِ علل (Infinite Regress)[4] آخری توضیح فراہم نہیں کرتا، اس لیے بالآخر ایک واجب الوجود کا ہونا ضروری ہے۔ ابن سینا کی یہ دلیل اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ بعد میں اسلامی، یہودی اور مسیحی فلسفیوں نے بھی اس سے استفادہ کیا۔

البتہ اسلامی روایت میں سب اہلِ علم نے اسے ایک ہی انداز میں قبول نہیں کیا۔ امام غزالی نے فلسفیوں سے متعدد مقامات پر اختلاف کیا، لیکن وہ بھی اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ کائنات خود اپنی وضاحت نہیں کر سکتی۔ ”الاقتصاد فی الاعتقاد“ اور ”القسطاس المستقیم“ جیسے مباحث میں غزالی بار بار اس نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ممکنات کی دنیا کسی ایسی حقیقت پر قائم ہونی چاہیے جو خود محتاج نہ ہو۔

البتہ امام غزالی کی توجہ زیادہ تر ”حدوثِ عالم“ (Temporal Origination of the Universe) کی طرف تھی۔ ان کے نزدیک تغیر اور حدوث اس بات کی دلیل ہیں کہ کائنات ازلی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اسے ایک محدث (Creator) کی ضرورت ہے۔

دوسری طرف ابن رشد نے استدلال کا ایک مختلف زاویہ اختیار کیا۔ ابن رشد کے نزدیک قرآن خود انسان کو کائنات کے نظم، غایت اور حکمت میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کے ہاں دلیلِ عنایت (Providence) اور دلیلِ اختراع (Design) زیادہ نمایاں ہیں، لیکن وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ محتاج اور متغیر موجودات خود اپنی آخری توجیہ نہیں بن سکتے۔

پھر ہم امام ابن تیمیہ کی طرف آتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے فلسفیانہ اصطلاحات پر بعض تنقیدات کیں، خصوصاً اس وقت جب وہ غیر ضروری تجرید (abstraction) اختیار کر لیتی تھیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بھی اس بنیادی حقیقت کو مانتے ہیں کہ ممکنات اور حادثات کا سلسلہ خود بخود قائم نہیں رہ سکتا۔ ان کے نزدیک انسان کی فطرت، عقل اور مشاہدہ تینوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ کائنات کا ایک خالق اور مدبر موجود ہے۔

امام ابن تیمیہ کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ خدا کا علم صرف پیچیدہ فلسفیانہ قیاسات پر منحصر نہیں۔ عام انسان بھی اپنی فطرت اور عقلِ سلیم کے ذریعے اپنے رب کو پہچان سکتا ہے۔ ان کے نزدیک وجودِ باری کی معرفت انسانی فطرت میں رچی بسی ہے، فلسفیانہ دلائل اس کی توضیح اور تقویت کرتے ہیں بس۔

اب اگر جدید فلسفے کی طرف آئیں تو حیرت انگیز طور پر یہی بحث آج بھی زندہ ہے۔ مشہور معاصر فلسفی Alexander Pruss اور Robert Koons جیسے مفکرین نے Contingency Argument کو جدید صورتوں میں پیش کیا ہے۔ ان کا بنیادی سوال آج بھی وہی ہے:

> "Why is there something rather than nothing?"

> ”کچھ ہے کیوں؟ کچھ بھی نہ ہونے کے بجائے کچھ موجود کیوں ہے؟“

یہ سوال بظاہر سادہ ہے، لیکن فلسفے کی تاریخ کے عظیم ترین سوالات میں شمار ہوتا ہے۔

اگر کائنات موجود ہے تو اس کی کوئی توجیہ ہونی چاہیے۔ اگر ہر چیز contingent ہے تو آخر کار کسی non-contingent reality تک پہنچنا ہو گا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں Necessary Being کا تصور سامنے آتا ہے۔

مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ جدید طبیعیات (physics) جتنی ترقی کرتی جا رہی ہے، اتنا ہی یہ واضح ہو رہا ہے کہ طبیعی قوانین کائنات کے اندر ہونے والے واقعات کی وضاحت تو کرتے ہیں، مگر خود کائنات کے وجود کی آخری فلسفیانہ توضیح فراہم نہیں کرتے۔

طبیعیات یہ بتا سکتی ہیں کہ کائنات کیسے ارتقا پذیر ہوئی، لیکن یہ سوال کہ ”قوانینِ فطرت خود کیوں موجود ہیں؟“ یا ”وجود سرے سے کیوں موجود ہے؟“ بدستور فلسفیانہ سوال رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دلیلِ امکان و وجوب محض ایک مذہبی دلیل نہیں بلکہ وجود (Being) کے بارے میں عقل کے بنیادی سوال کا جواب ہے۔

اس دلیل کا خلاصہ چند سطروں میں یوں کیا جا سکتا ہے:

ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہر چیز محتاج، متغیر اور ممکن ہے، ممکنات کی یہ پوری دنیا اپنی آخری توضیح خود نہیں بن سکتی۔ اگر ہر چیز کسی اور پر منحصر ہو تو بالآخر ایک ایسی حقیقت کا ہونا ضروری ہے جو خود کسی اور پر منحصر نہ ہو، وہی حقیقت واجب الوجود ہے۔ وہی ازلی ہے، وہی غیر محتاج ہے، وہی تمام موجودات کی بنیاد ہے، اسلامی زبان میں اسی کو اللہ تعالیٰ کہا جاتا ہے۔

اور شاید اس دلیل کی سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ یہ ہمیں کائنات کے کسی ایک گوشے سے نہیں بلکہ خود ”وجود“ کے راز سے اٹھا کر اس ذات کی طرف لے جاتی ہے جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

> هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (سورۃ الحدید: ۳)

---

[4] اصطلاح Infinite Regress کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی وجہ پوچھتے پوچھتے ہم ہمیشہ ایک اور وجہ کی طرف چلے جائیں، لیکن کبھی کسی آخری اور بنیادی وجہ تک نہ پہنچ سکیں۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ کائنات کو ایک چیز نے پیدا کیا، پھر اس چیز کو دوسری نے، دوسری کو تیسری نے، اور یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہو، تو اسے Infinite Regress کہتے ہیں۔ فلاسفہ کا کہنا ہے کہ اگر ہر چیز کسی دوسری چیز کی محتاج ہو اور سلسلہ کبھی کسی غیر محتاج حقیقت پر نہ رکے، تو پھر موجودہ چیزوں کا وجود بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے آخر کار ایک ایسی ہستی کا ہونا ضروری ہے جو خود کسی کی محتاج نہ ہو، بلکہ باقی سب کے وجود کی بنیاد ہو۔ اسلامی فلسفے میں اسے واجب الوجود کہا جاتا ہے۔

”وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی اور چھپا ہوا بھی۔“

گویا تمام ممکنات کے پیچھے، تمام محتاجیوں کے پیچھے، اور تمام وجود کے پیچھے آخر کار ایک ہی غیر محتاج حقیقت کھڑی ہے، اور اسی حقیقت کو اہلِ ایمان ”اللہ رب العالمین“ کے نام سے جانتے ہیں۔

درج بالا تین دلائل کے توڑ میں ملحدین و منکرین کے پاس اصولی طور پر کوئی خاص مضبوط عقلی دلیل نہیں رہتی۔ جذباتی دلائل یا جزوی معاملوں کو لے کر اعتراضات ہوتے ہیں جن سے مذکورہ دلائل کا توڑ نہیں بن پاتا۔ ظاہر ہے عقلی دلائل کا توڑ جذباتی سوالات نہیں ہوتے، مثلاً قبولیت دعا کو لے کر جذباتی سوال کہ خدا ہے تو میری سنتا کیوں نہیں؟ میرا فلاں مسئلہ حل ہوتا کیوں نہیں؟ تو واضح بات ہے کہ کسی کی دعا میں قبولیت ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ پوری کائنات خود بن گئی اور اس کا پورا پیچیدہ باریک نظام خود چل رہا ہے قوانین فطرت خود کام کر رہے ہیں۔

یا تو وہ تسلسل آلہ کے ذریعے وہ اعتراض کریں گے، یعنی سب کچھ خدا نے بنایا تو خدا کو کس نے بنایا؟ ظاہر ہے اس سے عدمیتِ خدا ثابت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی یہ اعتراض اوپر ذکر کردہ ”دلیل امکان و وجود“ کے ذریعے ٹوٹ جاتا ہے کہ کسی ایک نکتے پر آکر کسی ذات کے وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا منطقی طور، ورنہ کوئی چیز موجود نہیں ہوگی۔

پھر یا تو وہ بحث پیش کرتے ہیں ”وجود شر / باطل“ (Problem of Evil) کی یعنی اگر خدا ہے اور قدرت والا ہے اور علم بھی رکھتا ہے تو ظلم و باطل کیوں موجود ہے دنیا بھر میں؟ جو کہ ایک جذباتی اعتراض ہے کیونکہ اس اعتراض سے بھی وجود خدا کی نفی نہیں لازم آتی۔ لیکن پھر بھی من جملہ اس کے کئی جوابوں کے ایک سیدھا سادہ بنیادی جواب یہ ہے کہ خدا با قدرت اور باعلم ہونے کے ساتھ ساتھ باحکمت بھی ہے۔ اس کے ظلم و شر کو ختم کرنے یا چھوڑے رکھنے میں بیش بہا حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جن میں سے ایک وہ ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہے:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝ (سورۃ فاطر: ۴۵)

”اور اگر اللہ لوگوں کے ہر کرتوت پر ان کی پکڑ کرنے لگتا تو اس زمین کی پشت پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتا، لیکن وہ ایک معین مدت تک کے لیے ان کو مہلت دے رہا ہے۔ پھر جب ان کا مقررہ وقت آجائے گا تو اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھ لے گا۔“

اور سورہ کہف میں مزید الگ و عجیب انداز سے فرمایا:

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝ (سورۃ الکھف: ۵۸،۵۹)

”اور تمہارا پروردگار بہت بخشنے والا، بڑا رحمت والا ہے۔ جو کمائی انہوں نے کی ہے، اگر وہ اس کی وجہ سے انہیں پکڑنے پر آتا تو ان کو جلد ہی عذاب دے دیتا، لیکن ان کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جس سے بچنے کے لیے انہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔ یہ ساری بستیاں (تمہارے سامنے) ہیں، جب انہوں نے ظلم کی روش اپنائی تو ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا، اور ان کی ہلاکت کے لیے (بھی) ہم نے ایک وقت مقرر کیا ہوا تھا۔“

خلاصہ یہ کہ ظلم و برائی بالکل فوراً ختم ہو جائے تو کوئی زمین پر باقی ہی نہ رہ پائے۔ ہر انسان چونکہ کسی نہ کسی درجے میں ظلم کرنے والا ہوتا ہے خواہ وہ ظلم حق خالق سے متعلق ہو یا حق مخلوق سے۔ البتہ ہر ظلم اور برائی اپنے وقت پر ختم ہوتی ہے، اسے مہلت دینا اسی کی حکمت کا بلکہ سورہ کہف میں مذکور آیت کے مطابق رحمت کا تقاضا ہے اور تاریخ میں اس کی بہت مثالیں موجود ہیں کہ کوئی بھی ظلم و شر کبھی ہمیشہ نہیں ٹکا۔ اس کی سب سے واضح مثال فرعون ہے جس کے تاریخی مظالم اور سوئے عاقبت کا اعتراف تقریباً ہر مذہبی و غیر مذہبی مؤرخ کرتا ہے اور خدا نے اس کے جسم کو آج تک عجوبے کی شکل میں برقرار رکھ کر مزید اس حقیقت کو مہر زدہ کر دیا (ان شاء اللہ آئندہ قسط میں اس پر کچھ عرض کیا جائے گا)۔

تاہم، یہ بات بھی واضح رہے کہ اسلامی نکتہ نظر سے کئی مرتبہ کسی فرد یا قوم پر ظلم و شر کا غلبہ اور تسلط اسی فرد / قوم کے ماضی میں کیے گئے کرتوتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (سورۃ الانعام: ۱۲۹)

”اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے کمائے ہوئے اعمال کی وجہ سے ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔“

پھر وہ ظلم و شر اگر پوری قوم کے کرتوتوں کا وبال ہوتا ہے تو پوری یا ایک بڑی جمعیت و اکثریتِ قوم کے راہ راست پر آنے سے زائل ہوتا ہے محض چند اشخاص کے درست ہو جانے سے نہیں۔

اس کے علاوہ یا تو ملحدین Quantum Mechanics اور Multiverse جیسے غیر معقول دلائل کے ذریعے وجود باری کا بطلان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ جدید دور کی نہایت اہم بحث ہے، لیکن اس میں ایک بنیادی غلط فہمی اکثر پائی جاتی ہے کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ Quantum Mechanics یا Multiverse نے خدا کی

ضرورت ختم کر دی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریات اگر درست بھی مان لیے جائیں تو زیادہ سے زیادہ کچھ مخصوص استدلالات کی شکل بدلتے ہیں، خدا کے وجود کے سوال کو ختم نہیں کرتے۔

پہلے دونوں نظریات کو مختصراً سمجھ لیتے ہیں۔

Quantum Mechanics دراصل طبیعیات (Physics) کا وہ شعبہ ہے جو ایٹوں اور ذیلی ذرّات (Subatomic Particles) کے رویّے کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس دنیا میں بعض واقعات ہمیں احتمالی نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر الیکٹران کی درست پوزیشن اور رفتار کو ایک ساتھ قطعی طور پر معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ بعض Quantum واقعات ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے وہ کسی خاص ظاہری سبب کے بغیر رونما ہو رہے ہوں۔

تو یہیں سے بعض ملحد مفکرین نے یہ استدلال کیا:

> "اگر Quantum سطح پر بعض چیزیں بظاہر بغیر کسی سبب کے واقع ہو سکتی ہیں، تو پھر کائنات بھی بغیر خالق کے وجود میں آسکتی ہے۔"

لیکن یہاں ایک اہم مغالطہ موجود ہے۔ کہ Quantum Mechanics یہ نہیں کہتی کہ "کچھ بھی مطلق عدم (Absolute Nothingness) سے پیدا ہو جاتا ہے"۔ Quantum events ہمیشہ ایک موجود Quantum Reality، موجود قوانینِ فطرت، موجود Quantum Fields اور موجود ریاضیاتی ڈھانچے کے اندر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یعنی "کچھ" پہلے سے موجود ہوتا ہے۔

لہٰذا فلسفیانہ بلکہ وہ فطری سوال بدستور باقی رہتا ہے کہ اس طرح کے Quantum Fields کہاں سے آئے؟ قوانینِ فطرت کہاں سے آئے؟ ریاضیاتی نظم کیوں موجود ہے؟ وجود سرے سے کیوں موجود ہے؟

دوسرے الفاظ میں Quantum Mechanics سببیت (Causality) کی بعض سادہ تصورات کو پیچیدہ بناتی ہے، لیکن "وجود کیوں ہے؟" کے سوال کا جواب نہیں دیتی اور سب سے بڑی بات Quantum ایک احتمالی صورت پر تجزیہ جو حتمیت کو توڑ نہیں سکتی، وجود باری ایک ایسی ٹھوس حقیقت جسے چیلنج کرنے کے لیے یہ احتمالی دلائل بالکل بے حیثیت ہیں۔

اب Multiverse کی طرف آتے ہیں۔

Multiverse کا بنیادی تصور یہ ہے کہ شاید ہماری کائنات واحد کائنات نہیں بلکہ بے شمار کائناتوں میں سے ایک ہے۔ بعض کائناتوں میں قوانینِ فطرت مختلف ہو سکتے ہیں، بعض میں زندگی ممکن نہ ہو، اور بعض میں ہمارے جیسی Fine-Tuning موجود ہو۔

اس نظریے کو بعض مفکرین Fine-Tuning Argument کے جواب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ استدلال کچھ یوں ہوتا ہے:

> "اگر اربوں یا کھربوں کائناتیں موجود ہوں تو ان میں سے کسی ایک کا زندگی کے لیے موزوں نکل آنا حیرت کی بات نہیں، لہٰذا خدا کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ دلیل پہلی نظر میں دلچسپ لگتی ہے، لیکن اس پر کئی اہم اعتراضات ہیں۔

سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ Multiverse خود ابھی ایک فلسفیانہ سائنسی مفروضہ (Hypothesis) ہے، کوئی مشاہدہ شدہ حقیقت نہیں۔ ابھی تک دوسری universes کا براہِ راست تجرباتی ثبوت موجود نہیں۔

دوسرا اور زیادہ اہم اعتراض یہ ہے کہ فرض کریں Multiverse واقعی موجود ہے، تب بھی سوال باقی رہتا ہے کہ یہ Multiverse کیوں موجود ہے؟ وہ قوانین کہاں سے آئے جو Multiverse پیدا کرتے ہیں؟ وہ بنیادی حقیقت کیا ہے جس سے یہ تمام universes وجود میں آئے؟

یہاں پھر وہی دلیلِ امکان و وجوب سامنے آجاتی ہے۔ اگر ایک universe محتاج ہے تو اس کی توضیح درکار ہے۔ اگر ایک کھرب universes ہیں تو ان سب کی توضیح بھی درکار ہے۔ صفر کو ایک کھرب مرتبہ جمع کرنے سے "واجب الوجود" پیدا نہیں ہو جاتا۔ ممکن الوجود خواہ ایک ہو یا ایک کھرب، وہ پھر بھی ممکن الوجود ہی رہے گا۔

یہ ممکن ہے کہ وہ کائنات کی ساخت کے بارے میں کچھ وضاحت پیش کرے، مگر وہ وجود کی آخری توضیح (Ultimate Explanation) نہیں بنتا۔

تو Multiverse بھی خدا کے وجود کو باطل ثابت نہیں کرتا وہ زیادہ سے زیادہ Fine-Tuning کی ایک متبادل طبیعیاتی توضیح پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن وجودِ باری کے گہرے فلسفیانہ دلائل خصوصاً دلیلِ امکان و وجوب، دلیلِ فطرت، دلیلِ شعور، اور دلیلِ وحی ان نظریات کے بعد بھی اپنی اصل قوت کے ساتھ قائم رہتے ہیں، کیونکہ ان کا موضوع خود وجود، معنی، عقل، مقصد اور حقیقت کی آخری بنیاد ہے، نہ کہ صرف ایک کائنات کی طبعی ساخت۔

تو یہ لے دے کر کچھ مناقضات پیش کیے جاتے ہیں وجود باری کے تصور کو چیلنج کرنے کے لیے جو دیکھے جا سکتے ہیں کہ کیسے بوگس اور کھوکھلے ہیں۔

الحمد للہ آج تک کوئی ملحد و منکر وجود باری کے انکار پر کوئی ایسی ٹھوس بحث (Definitive Argument) پیش نہیں کر پایا جو عقیدۂ وجود باری کی بنیاد کو ہلا سکے اور ان شاء اللہ قیامت تک کوئی نہیں پیش کر سکے گا۔

اب یہاں ایک مزید سوال رہ جاتا ہے کہ اگر خدا کا وجود معقول ہے، وحی کی ضرورت بھی معقول ہے، اور مذہبی میلان انسانی فطرت میں بھی پایا جاتا ہے، تو پھر جدید انسان خدا سے دور کیوں ہوا؟

یہ سوال ہمیں Enlightenment، Secularization، جدید تعلیم، میڈیا، اور جدید Epistemology کی پوری تاریخ تک لے جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب سمجھے بغیر جدید الحاد، سیکولرزم اور مذہبی بے زاری کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے ایک غلط فہمی دور کرنی ہو گی۔ عام طور پر یہ تصور پیش کیا جاتا ہے کہ انسان ہزاروں سال تک مذہبی جہالت میں مبتلا رہا، پھر سائنس آئی، عقل آئی، اور انسان نے مذہب کو چھوڑ دیا لیکن جب تاریخ کا سنجیدہ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں جدید سیکولر ذہنیت کا ظہور براہِ راست خدا کے خلاف بغاوت سے نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مخصوص تاریخی تجربے کے نتیجے میں ہوا۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں کلیسا صرف مذہبی ادارہ نہیں تھا بلکہ سیاسی، معاشی اور علمی اقتدار کا بھی مرکز تھا۔ جب بعض سائنسی دریافتیں اور نئے فکری رجحانات سامنے آئے تو کلیسا کے بعض نمائندوں نے ان کی سخت مخالفت کی۔ نتیجتاً بہت سے اہلِ فکر کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوا کہ مذہب اور عقل ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

یہاں سے ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی، پہلے سوال یہ ہوا کرتا تھا کہ ”خدا نے کیا کہا ہے؟“ پھر سوال یہ بن گیا کہ ”انسانی عقل کیا کہتی ہے؟“ پھر آہستہ آہستہ سوال یہ بن گیا کہ ”کیا ہمیں خدا کی ضرورت بھی ہے؟“ اور آخر کار بعض حلقوں میں سوال یہ بن گیا کہ ”کیا خدا کا تصور محض ایک انسانی تخلیق تو نہیں؟“ جس نے بعد کی نسل کے فطری چراغ کو گویا بجھانے کا کام کر دیا۔

یہ پورا سفر چند سالوں میں نہیں بلکہ کئی صدیوں میں طے ہوا، مگر اہم بات یہ ہے کہ جدید انسان نے خدا کو چھوڑ کر بھی خدا کی جگہ خالی نہیں چھوڑی۔ انسان فطرتاً کسی نہ کسی ”مرکز“ کا محتاج ہے، جب خدا کو مرکز سے ہٹایا گیا تو اس کی جگہ مختلف چیزیں آتی گئیں۔

کبھی ”عقل“ خدا بن گئی، کبھی ”سائنس“ خدا بن گئی، کبھی ”ریاست“ خدا بن گئی، کبھی ”قومیت“ خدا بن گئی۔ اور آج کے دور میں بعض اوقات ”خواہشِ نفس“ خدا بن جاتی ہے۔

قرآن نے شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا:

اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ (سورۃ الجاثیۃ: ۲۳)

”کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا؟“

ممکن ہے کہ انسان تصور خدا کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے، لیکن کسی ”مطلق مرکز“ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر حقیقی خدا کو چھوڑ دے تو کوئی اور چیز اس خلا کو پُر کرنے لگتی ہے۔

اسی لیے جدید دور کا ایک عجیب تضاد سامنے آتا ہے۔ ایک طرف مذہبی وابستگی کم ہوئی، دوسری طرف نئی قسم کی ”عقیدتیں“ پیدا ہو گئیں۔ لوگ نظریات، قومیتوں، سیاسی تحریکوں، شخصیات، برانڈز، مشہور شخصیات، اور حتیٰ کہ ٹیکنالوجی کے ساتھ بھی بعض اوقات ایسا تعلق قائم کر لیتے ہیں جو ماضی میں مذہب کے ساتھ قائم کیا جاتا تھا۔

یہاں ایک اور گہرا نکتہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جدید سیکولر انسان نے خدا کو اس لیے نہیں چھوڑا کہ اسے تمام جوابات مل گئے تھے، بلکہ اکثر اس لیے کہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ بعض سوالات پوچھنے ہی نہیں ہیں۔ مثلاً:

- زندگی کا آخری مقصد کیا ہے؟
- موت کے بعد کیا ہو گا؟
- خیر اور شر کا حتمی معیار کیا ہے؟
- انسانی وقار کی بنیاد کیا ہے؟

جدید فکر نے اکثر ان سوالات کو Metaphysical قرار دے کر ایک طرف رکھ دیا، لیکن سوالات ختم نہیں ہوئے وہ انسان کے دل میں باقی رہے۔

اسی لیے ہم ایک عجیب منظر دیکھتے ہیں۔ تاریخ میں شاید کبھی انسان کے پاس اتنی معلومات نہیں تھیں جتنی آج ہیں، مگر ساتھ ہی Anxiety، Depression، Loneliness اور Existential Emptiness جیسے نفسیاتی امراض بھی غیر معمولی سطح پر موجود ہیں اور شاید اتنے کبھی نہ ہوئے ہو۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر نفسیاتی مسئلے کی وجہ مذہب سے دوری ہے، لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ جدید انسان نے بہت کچھ حاصل کیا ہے مگر ”معنیٰ“ (Meaning) کا سوال ابھی تک حل نہیں کیا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں بہت سے جدید مفکرین دوبارہ اس سوال کی طرف لوٹ رہے ہیں کہ:

- کیا انسان صرف حیاتیاتی مشین ہے؟
- کیا شعور محض کیمیائی تعاملات کا نتیجہ ہے؟
- کیا اخلاق صرف ارتقائی فائدے کا نام ہے؟
- کیا مقصد صرف ایک نفسیاتی فریب ہے؟

اور جتنا یہ سوالات گہرے ہوتے جاتے ہیں، اتنا ہی انسان دوبارہ فلسفے، مذہب اور ماورائے طبیعیات کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۴۴ پر)

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر اعتراضات کا مختصر جائزہ

مولوی عبد الرب بلوچ

برصغیر میں دعوت و اصلاح اور جہاد کی بیک وقت جامع تحریکات میں اولین تحریک سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین تھی۔ ظاہری ناکامی کے باوجود اس تحریک کے اثرات برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش تک پہنچے اور سید صاحبؒ کے روحانی فرزندوں نے آپؒ کے بعد آج تک کسی نہ کسی صورت میں آپ کی وراثت کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تحریک مجاہدین چونکہ برصغیر میں مسلمانوں کے زوال اور انگریزی استعمار کے ابتدائی زمانے میں برپا ہوئی تھی، اس لیے استعمار اور اس کے گماشتوں نے اس دور سے ہی تحریک مجاہدین کے بارے میں افواہوں اور پروپیگنڈے کا بازار گرم کیا۔ بدقسمتی سے انگریزی استعمار کے قدیم پروپیگنڈہ کی جگالی، آج تک نہ صرف آپؒ کے روحانی وارثین بلکہ خود سید صاحبؒ کی ذات مبارکہ تک کے بارے میں، مختلف افراد مختلف صورتوں میں کر کے خود کو تاریخ کے غلط رخ پر رکھنے کی کوشش میں ہیں، جس کا ظاہر ہے سوائے ان کی ذات کے کسی کو نقصان نہیں۔

ایسا ہی بر اپروپیگنڈہ کر کے اور سید صاحبؒ اور آپؒ کے رفقاء کے بارے میں زبان کی بدنصیبی آج کل کے ایک مشہور سوشل میڈیائی "دانشور" محمد دین جوہر اور جناب کے دو چار ہمراہیوں کے مقدر میں آئی ہے[1]۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس گروہ نے بھی استعمار، اس کے گماشتوں اور مسلکی تعصب کا شکار بعض علماء اور گدی نشینوں کی ہی عبارات کی جگالی کرنے کو اپنی کُل متاع سمجھا۔ اس گروہ کی اس حرکت پر مناسب معلوم ہوا کہ ہم بھی ان اعتراضات کے مناسب تاریخی رد کے ساتھ موجودہ دور میں جہادی تحریکات پر وارد اعتراضات سے ان کی حیرت انگیز مماثلت بھی واضح کر دیں۔

تحریک مجاہدین پر اعتراضات کا جائزہ لیا جائے تو حسبِ سابق ان میں تحریک پر کیے گئے قدیم اعتراضات کی جگالی کے سوا قطعاً کوئی نئی بات نہیں۔ البتہ کسی حد تک کچھ نیا ہے تو شاہ اسماعیل شہیدؒ کی مایہ ناز تصنیف "منصبِ امامت" پر بعض بُودے اعتراضات کا اضافہ ہے۔ ان تمام اعتراضات کی علمی حیثیت اور فرداً فرداً سب کے جواب تو اس مختصر سے مضمون میں دینا ممکن نہیں، البتہ اس ضمن میں چند عمومی اشکالات کے بارے میں معروضات پیش کرنے کی کوشش ضرور کی جاسکتی ہے۔

جوہر صاحب اور ہمنواؤں کی جانب سے تحریک مجاہدین پر وارد کیے جانے والے اعتراضات کو درج ذیل چند نکات میں سمویا جاسکتا ہے:

۱. تحریک مجاہدین نے انگریزوں کی بجائے سکھوں کے خلاف ہی کیوں جہاد کیا؟ حالانکہ انگریز سکھ کی بنسبت زیادہ بڑا دشمن تھا۔
۲. تحریک مجاہدین کو سکھوں کے خلاف جنگ میں انگریزوں کی حمایت حاصل تھی۔
۳. تحریک مجاہدین نے پشتون قبائلی مسلمانوں کے خلاف قتال کیا۔
۴. تحریک مجاہدین "وہابی تحریک" سے متاثر تھی۔
۵. تشریعی الہام اور خارجیت کا الزام۔

انگریزوں کی بجائے سکھوں سے جہاد کی ابتدا پر اعتراض

تحریک مجاہدین کی تاریخ سے ادنیٰ سی مناسبت رکھنے والا بھی ان اعتراضات کی حیثیت جانتا ہے کہ ایسے

اعتراضات در حقیقت تاریخ کے ایک مخصوص جانبدارانہ (اور متعصب) فہم کی پیداوار ہیں۔ اس لیے کہ سید صاحبؒ کا مطمح نظر فقط سکھوں کی مخالفت یا محض اپنی امارت قائم کرنا نہیں تھا (جیسا کہ بعض معترضین کہتے ہیں) بلکہ شمالی ہند کا میدان منتخب کر کے سکھوں کے خلاف وہ اس جہاد کا آغاز کرنا چاہتے تھے کہ جس کی وجہ سے بالآخر مکمل ہندوستان سے مشرکین و نصاریٰ (یعنی انگریزوں) کا زور ٹوٹ جائے، جیسا کہ آپؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

> "ایک تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصے پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم و بیداد شروع کر دی ہے، کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے، اور شعائر اسلام اٹھ گئے، یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا، ہجرت کا شوق دامن گیر ہوا، دل میں غیرت ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش و خروش ہے۔"[2]

اپنے اسی مقصد کی صراحت ایک اور مکتوب میں اس طرح فرماتے ہیں:

> "جس وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا، حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے، جن کو ان کی طلب ہو گی اور ان (ملکی) حکام و اہل حکومت کی شوکت و قوت کی بنیاد مستحکم ہو گی، ہم

[1] واقفان حال جانتے ہیں کہ جوہر صاحب اور ان کے لائق شاگردوں نے محض "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مصداق اپنی خجالت مٹانے کے واسطے بزرگان دین کی پگڑیاں اچھالنا مناسب سمجھا۔ بحث تاریخی و علمی حدود تک ہی رہتی تو بھی شاید قرین قیاس تھا، لیکن جوہر صاحب کے بعضے 'لائق' شاگردوں نے ان بزرگان اور ان کی طرف سے مدافعت کرنے والے حضرات کے بارے ایک طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا ہے۔

[2] سیرت سید احمد شہید، از مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ، ص: ۴۰۹

کمزوروں کو والیانِ حکومت، اور بڑے بڑے سرداروں سے صرف اسی بات کی خواہش ہے کہ جان و دل سے اسلام کی خدمت کریں اور اپنی مسند حکومت پر برقرار رہیں۔''[3]

اسی مقصد میں اعانت کے لیے آپؒ والیِ گوالیار کو ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''اس صورت میں ان بڑے سرداروں کے لیے مناسب یہی ہے جو سالہاسال سے اپنی مسند ریاست پر متمکن چلے آرہے ہیں کہ اس وقت ان کمزوروں کی ہر طرح امداد کریں اور اس بات کو اپنی حکومت کے استحکام کا باعث سمجھیں۔''[4]

سید احمد شہیدؒ نے جہاد کی ابتدا سکھوں کے خلاف جہاد سے کچھ مخصوص وجوہات کی بنا پر کی تھی۔ بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ اس زمانے میں سکھ حکومت مسلمانوں پر مظالم اور شعائرِ اسلامی کی بے حرمتی میں انگریزی حکومت سے کہیں زیادہ سختی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ پنجاب میں مساجد کو اصطبل بنانا، نمازوں اور اذان سے روکنا وغیرہ جیسے مظالم عام ہو چکے تھے۔ دوسرا انگریزی قوت کو توڑنے کے لیے جو افرادی قوت اور حالات چاہیے تھے وہ شمالی ہند میں میسر نہ تھے جبکہ سرحد کے علاقوں پر سکھوں کی حکومت تھی۔ سید صاحبؒ بوجوہ (جن کا ذکر اگلی سطور میں آئے گا) سرحد ہی سے تحریکِ جہاد کی ابتدا کرنا چاہتے تھے۔

شمالی ہند (یعنی دلی، لکھنؤ و نواح کے علاقے، جہاں سے سید صاحب اور خانوادہ ولی اللہی کا تعلق تھا) کے باشندوں میں فنون سپہ گری کی کمی تھی جس کی وجہ سے ان علاقوں سے ایسے جنگجو طبیعت کے افراد کا ملنا مشکل تھا کہ جو ایک جہادی تحریک کو ایندھن فراہم کر سکتے۔ دوسری وجہ جغرافیہ تھا، شمالی ہند کے علاقے زیادہ تر میدانی علاقے تھے جہاں سے سید صاحب کی مجوزہ گوریلا کارروائیاں کرنا تزویراتی طور پر سہل نہ تھا، بالخصوص جب کے مقامی باشندے فنون سپہ گری سے ناواقف اور مقامی حمایت ملنا اس قدر آسان نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سید صاحب نے اپنی تحریک کی ابتدا سرحدی قبائلی علاقوں سے کی جہاں انہیں افرادی قوت اور مناسب تزویراتی ماحول ملنے کی توقع تھی۔ اسی امر کی وضاحت سید صاحبؒ کے پنجتار کے ایک خطاب سے ہوتی ہے جس میں آپؒ نے فرمایا:

''میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی مامون ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے کر جاؤں اور جہاد کی تدبیر کروں، باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کردہ (کوس) میں ملک ہند واقع ہوا ہے، کوئی جگہ ہجرت کے لائق خیال میں نہ آئی، کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک میں جہاد کرو جو کچھ مال، خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہو ہم دیں گے، مگر مجھ کو منظور نہ ہوا، اس لیے کہ جہاد سنت کے موافق چاہیے، بلوہ کرنا منظور نہیں، تمہارے ملک کے ولایتی بھائی حاضر تھے، انہوں نے کہا کہ ہمارا ملک اس کے واسطے بہت خوب ہے۔ اگر وہاں چل کر کسی ملک میں قیام اختیار کریں تو وہاں کے لاکھوں مسلمان جان و مال سے آپ کے شریک ہوں گے، خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو نہایت تنگ کر رکھا ہے، طرح طرح کی ایذا پہنچاتا ہے اور مسلمانوں کی بے آبروئی کرتا ہے۔ جب اس کی فوج کے لوگ اس ملک میں آتے ہیں، مسجدوں کو جلا دیتے ہیں، کھیتیاں تباہ کرتے ہیں، مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں، بلکہ عورتوں اور بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں، اور اپنے ملک پنجاب میں لے جا کر بیچ ڈالتے ہیں۔ پنجاب میں وہ مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے، مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں، گاؤکشی کا تو کیا ذکر، جہاں سنتے ہیں کہ کسی مسلمان نے گائے ذبح کی تو اس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ یہ سن کر میرے خیال میں آیا کہ یہ سچ کہتے ہیں، اور یہی مناسب ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں اور ان کے ظلم سے مسلمانوں کو چھڑائیں۔''[5]

یہ وہ چند بنیادی وجوہات تھیں جن کی بنا پر سید صاحب نے تحریک جہاد کی ابتدا سکھوں کے خلاف جہاد سے کی۔

انگریزوں کی امداد حاصل ہونا

تحریک مجاہدین پر دوسرا اہم اعتراض یہ تھا کہ تحریک کو انگریزی حکومت کی درپردہ حمایت حاصل تھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جتنا واویلا مخالفین اس الزام کا مچاتے ہیں اس کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ایک بھی ٹھوس ثبوت آج تک نہیں دیا جا سکا۔ یہ الزام سید صاحبؒ کی حیات مبارکہ میں ہی متعدد مرتبہ آپؒ کے مخالفین نے آپؒ پر لگایا جیسا کہ خوانین پشاور کی مخالفت کی وجہ جب سید صاحبؒ نے ان سے دریافت کی تو انہوں نے ہندوستانی علماء و مشائخ کا ایک محضر نامہ پیش کر دیا جس کے مضمون کا خلاصہ کچھ یوں تھا:

''تم سرداروں اور خوانین کو اطلاعاً لکھا جاتا ہے کہ سید احمد نامی ایک آدمی چند علمائے ہند کو متفق کر کے اس قدر جمعیت کے ساتھ تمہارے ملک میں گئے ہیں، وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ صرف ان کا مکر و فریب ہے، وہ ہمارے اور تمہارے دین و مذہب کے مخالف ہیں، انہوں نے ایک نیا دین و مذہب نکالا ہے۔ وہ کسی ولی بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو برا کہتے ہیں۔ وہ انگریزوں کے بھیجے ہوئے

---

[3] ایضاً ص ۴۰۷

[4] ایضاً

[5] سیرت سید احمد شہید: ۱۵-۴۱۶

تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے گئے ہیں، تم کسی طرح ان کے وعظ و نصیحت کے دام میں نہ آنا۔ عجب نہیں کہ تمہارا ملک چھنوا دیں جس طرح تم سے ہو سکے، ان کو تباہ کرو اور اپنے ملک میں جگہ نہ دو۔ اگر اس معاملے میں سستی اور غفلت سے کام لو گے، تو پچھتانا پڑے گا اور ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔"[6]

مسلمانوں کے خلاف قتال اور 'وہابیت' کا الزام

سید صاحب پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی بیعت نہ کرنے والے قبائلی مسلمانوں کی تکفیر کی اور محض اس وجہ سے مسلمانوں کے خلاف قتال کیا۔ یہ بھی نرے اعتراض کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے کہ سید صاحب نے امارت کے قیام کے بعد کسی کو بیعت پر مجبور نہیں کیا، نہ ہی بیعت نہ کرنے والوں کی معاذ اللہ تکفیر کی، نہ ہی ان کے خلاف قتال کیا۔ ہاں جن قبائلی خوانین اور سرداروں نے آپ کی بیعت کے بعد آپ ہی کے خلاف ریشہ دوانیوں سے کام لیا ان کے خلاف ضرور تادیبی کارروائیاں کی گئیں جو کہ کسی بھی حکومت کے استحکام اور بقا کے لیے ضروری ہے جس میں کوئی دو رائے نہیں۔ جبکہ سید صاحب تو ایک امارت شرعیہ کے امیر تھے جس کی مدد و نصرت کرنا اور اس کے استحکام کی کوشش کرنا ان کے زیر انتظام علاقوں کے افراد کے لیے ضروری تھا۔ اگر کوئی مدد نہ بھی کرے تو بھی حکومت شرعیہ کے خلاف ریشہ دوانیوں کی اجازت تو کسی قیمت نہیں دی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کے مکتوبات یا ان کے رفقاء کی بعض تحاریر میں اگر کسی کی تکفیر کی گئی یا سخت زبان استعمال کی گئی تو وہ ٹھوس شرعی وجوہات اور دلائل پر مبنی تھی۔

تحریکِ مجاہدین کی مخالفت کرنے والے ان پر سب سے زیادہ 'وہابیت' سے متاثر ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ برصغیر بالخصوص اور امت مسلمہ بالعموم کے تناظر میں 'وہابیت' کا الزام ایک حساس مسلکی نوعیت کا حامل مسئلہ ہے لیکن اس الزام کا ازالہ کیا جانا بھی از حد ضروری ہے اس لیے ذیل کی چند سطور میں اس بارے میں اختصار سے چند معروضات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تحریک وہابیت دراصل تو شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کی تحریک کو کہا جاتا ہے۔ اس زمانے کے مخصوص حالات اور بعد ازاں ان کی تحریک کے افراد کی جانب سے بعض شدت پسندانہ اقدامات کی وجہ سے اس زمانے میں حجاز اور عرب میں تحریکِ وہابیت کے بارے میں عمومی تاثر کچھ اچھا نہیں تھا۔ انہی حالات کی وجہ سے برصغیر میں بھی وہابیت کے بارے میں منفی تاثر نے جنم لیا۔ وہابیت کے بارے میں اسی منفی تاثر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے "Divide and rule" (تقسیم کرو اور حکومت کرو) کی پالیسی پر عمل پیرا فرنگی حکومت نے بھی سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو 'وہابی' مشہور کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ تحریکِ وہابیت اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے افکار و نظریات اور طریقۂ کار، الغرض ہر لحاظ سے بُعد المشرقین تھا۔ موضوع کی حساسیت کے پیشِ نظر محض یہی کہنا مناسب ہے کہ عرب کی وہابی تحریک کی اصلاح پسندی سے مشابہت پر تحریکِ مجاہدین پر 'وہابیت' کا الزام قطعی طور پر غلط ہے۔

[شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید برصغیر کی علمی روایت کے ہی امین تھے جس میں فقہ، حکمت الٰہیہ اور تصوف و سلوک برابر اہمیت کے حامل تھے۔ برطانوی استعمار نے تحریکِ مجاہدین پر 'وہابی' لیبل چسپاں کر کے کافی مفادات حاصل کیے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لٹریچر میں مسلسل 'وہابی' کا لقب ان نفوسِ قدسیہ کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب[7]، جو سید احمد شہید کی تحریک سے کوئی متعصبانہ تعلق نہیں رکھتے، کا کہنا ہے کہ سید احمد بریلوی کے پیروکاروں کو وہابی قرار دے کر انگریزی سرکار ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھی، ایک طرف حکومت کے اعلیٰ حلقوں میں تحریکِ مجاہدین کو باغی ثابت کرنا اور دوسری طرف عام مسلمانوں کی نظر میں انہیں "انتہا پسند" اور "مزاروں کا مخالف" ظاہر کرنا تھا۔ چنانچہ یہ لقب بعد ازاں برصغیر میں مذہبی و سیاسی بدنامی کا آلہ بن گیا۔ انیسویں صدی میں برطانوی ہند کے نوآبادیاتی حکام نے 'وہابی' کا لقب ہر ایسی اسلامی اصلاحی تحریک کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا جسے وہ اپنے لیے سیاسی خطرہ سمجھتے تھے اور سید احمد شہید کی تحریک اس میں پہلے نمبر تھی۔

سب سے پہلے ۱۸۳۲ء میں Journal of the Asiatic Society of Bengal نے سید احمد شہید کی تحریک کو وہابی تحریک قرار دیا تھا۔ اس لیے تحریکِ مجاہدین کے لیے 'وہابی' کا لقب جوہر صاحب کی تازہ 'تحقیق' نہیں بلکہ یہ دراصل اسی برطانوی پراپیگنڈہ کی جگالی ہے۔ اس جرنل میں J.R. Colvin کا مقالہ بھی شائع ہوا تھا، جس میں تحریکِ مجاہدین پر عرب وہابیوں کی ہندوستانی نقل کا طعن کیا گیا۔ مذکورہ مقالہ کا عنوان تھا "Notice of the Peculiar Tenets Held by the Followers of Syed Ahmed, Taken Chiefly from the Sirat-ul-Mustaqim."

اسی طرح ۱۸۶۷ء میں Colonel Adye نے اپنی کتاب "Sitana: A Mountain Campaign on the Borders of Afghanistan" میں تحریک کے ستھانہ میں موجود بیس کیمپ کو نشانہ بنانے کا تذکرہ کیا اور تحریک کو 'وہابی دہشت گرد' قرار دیا۔ مذکورہ کتاب برطانوی فوجی نقطہ نظر سے لکھی گئی ایک روداد ہے، جس میں ۱۸۶۳ء کی مشہورِ زمانہ "امبیلہ مہم" (Ambela Campaign) اور ستھانہ میں موجود مجاہدین کے خلاف فوجی کارروائی کا احوال بیان کیا گیا ہے، چنانچہ تحریکِ مجاہدین کو اکثر برطانوی حکام ہندوستانی جنونی (Hindustani Fanatics) قرار دیتے رہے۔][8]

---

[6] سیرت سید احمد شہید؛ ۳۳۱-۳۲

[7] ڈاکٹر صاحب تحریک مجاہدین کے بارے میں ایک اہم انگریزی کتاب "Wahabi Movement In India" کے مصنف ہیں۔

[8] چوکور قوسین کی عبارت ڈاکٹر محمد مسلم صاحب کی فیس بک تحریر سے مع تغیر یسیر نقل شدہ ہے۔

خارجیت اور تشریعی الہام کا الزام

جوہر صاحب و ہمنواؤں کی ایک اور قبیح حرکت مسلسل تحریک مجاہدین پر خارجیت کا الزام ہے۔ تحریک مجاہدین اور خوارج کی فکر میں بعد المشرقین ہے ہی، لیکن قارئین کے لیے مختصراً اتنی وضاحت کر دیتے ہیں کہ خوارج عہد صحابہ ہی میں حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ کے مابین اختلافات کے دوران پیدا ہونے والا فرقہ تھا جس میں بعد ازاں مختلف فرقے بنتے گئے۔ امام عادل (یعنی حضرت علی و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم دونوں ہی کے خلاف خروج کیا تھا) کے خلاف خروج کرنے کی وجہ سے انہیں خوارج کہا گیا۔ ان کے متفرق عقائد ہیں لیکن ایک سب سے اہم عقیدہ جو اہل السنۃ والجماعۃ سے انہیں جدا کرتا ہے وہ ”مرتکب کبائر“ کی تکفیر ہے۔ خوارج کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے جبکہ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ مرتکب کبیرہ کو گناہ گار لیکن مسلمان اور دائرہ اسلام میں داخل سمجھتے ہیں اور اس کی تکفیر ناجائز سمجھتے ہیں۔ تحریک مجاہدین نہ تو 'امام عادل' کے خلاف خروج کرنے والے تھے (جوہر صاحب رنجیت سنگھ یا انگریزی سرکار کو امام عادل سمجھتے ہوں تو الگ بات ہے) نہ ہی مرتکب کبیرہ کے کفر کے قائل تھے۔ یہ الزام جوہر صاحب بار بار دہراتے رہتے ہیں لیکن اس کو ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس حسب سابق کچھ نہیں۔

دوسرا بنیا الزام شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تصنیف ”منصب امامت“ کو لے کر جوہر صاحب کا الزام ہے کہ شاہ صاحبؒ الہام کی بنیاد پر امامت کے قائل اور شریعت میں تبدیلی وغیرہ تک کے قائل ہیں۔ شاہ اسماعیلؒ کے ”تصورِ امامت“ کے بارے میں جوہر صاحب طعنہ زن ہوتے ہیں کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ:

۱. ایسے امام کے قائل ہیں جو کمالاتِ انبیاء کا حامل ہو،
۲. اپنے الہام کو تشریعی سمجھتا ہو،
۳. اپنے الہام کو سیاسی و عسکری طاقت سے معاشرے پر نافذ کرنے کا مجاز ہو۔

ان تینوں نکات کا نتیجہ وہ نکالتے ہیں کہ اس عمل میں وہ شریعتِ مطہرہ کو قطعی مسترد کر دیتے ہیں۔ ہمیں ان الزامات پر قطعی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ شاہ اسماعیل شہید کی طرف ایسی ایسی باتیں منسوب کر رہے ہیں کہ عدالت و دیانت سر پیٹ کر رہ جائے۔ بہر حال ہم ان تینوں طعنوں کا جائزہ شاہ اسماعیل شہید کی کتب سے پیش کرتے ہیں۔ چونکہ وہ امام و خلافت کے مختلف درجات قائم کرتے ہیں اس لیے ہر طبقے کے لیے شریعت کا دستور ہونے کا حوالہ دے دیتے ہیں۔

پہلا طعن یہ کہ وہ ایسے امام کے قائل ہیں جو کمالاتِ انبیاء کا حامل ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ امامت کے مراتب قائم کرتے ہیں اور جس قدر کوئی امام خصائص نبوت سے خود کو ہم آہنگ کرتا ہے اسی قدر اس کا مرتبہ بلند شمار کرتے ہیں۔ وہ علوِ مرتبہ کمالاتِ انبیاء کی پیروی اور ان کے رنگ میں رنگنے کی وجہ سے ہے۔ جب احادیث میں اللہ کے رنگ میں رنگنے اور اللہ کے اخلاق کے مطابق اپنے اخلاق کو ڈھالنے، اللہ کے دوست اور اولیاء جیسی باتیں قابلِ قبول ہیں تو یہاں کیا شبہ ہے؟ جہاں ویسے ہی نبی علیہ السلام کی کی اطاعت ہر مومن کے لیے لازمی ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ جوہر صاحب انبیاء علیہم السلام کے خصائص کو بیان کرنے پر بھی معترض ہیں حالانکہ یہ سیاستِ ایمانی کے لیے اگر انبیاء کی سیرت بیان نہ ہو گی تو کیا چیز بیان ہو گی؟ یہاں بھی وہ لکھتے ہیں:

> ”انبیاء علیہم السلام کے درجات و کمالات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار و احاطہ مجھ جیسے امتی سے مشکل بلکہ ناممکن ہے لیکن میں ان کمالات کا بیان کروں گا جو حقیقتِ امامت سے تعلق رکھتے ہیں۔“[۹]

جب شاہ اسماعیل شہید انبیاء کے کمالات کے شمار کو بھی عام انسانوں کے لیے ناممکن قرار دیتے ہیں تو یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے امام کے قائل ہوں گے جو کمالاتِ انبیاء کا کلی طور پر حامل ہو، البتہ ہر شخص کے منصب کے مطابق بعض کمالات کا حصول تسلیم کرتے ہیں وہ بھی تفاوتِ درجات کے ساتھ۔ اس کے لیے انہوں نے میٹھے پانی اور کھاری پانی اور ان کی باہم ملاوٹ کے درجات کی مثال دی ہے جو درحقیقت فرق مراتب کو ہی ظاہر کرتی ہے۔ شاہ شہید، خلفائے راشدین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”پس دین کے احکام کے اصول منزل کتاب سے بدلیل ثابت ہیں اور ان کے فروع کا مفہوم مسلسل حدیث سے ہوتا ہے پس کتاب اللہ و سنت بین کے مجموعے کا نام دین و شریعت ہے۔ ایسے ہی بہت سے احکام ہیں جو اختلافِ زمانہ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں......“[۱۰]

واضح رہے کہ وہ اختلافِ زمانہ سے بدلنے والے احکامات میں خلیفہ راشد کی اطاعت کو واجب قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد سلطانِ کامل کے بارے میں بھی لکھتے ہیں:

> ”سلطانِ کامل، حکمی خلیفہ راشد ہے یعنی اگرچہ خلافتِ راشدہ تک نہیں پہنچا لیکن خلافتِ راشدہ کے عمدہ آثار بعض ظواہرِ شریعت کی خدمت صدق و اخلاص سے اس سے صادر ہوں۔“[۱۱]

حتیٰ کہ سلطان جابر کے بارے میں بھی لکھتے ہیں:

> ”نفس کی فرمانبرداری میں نہ تو شرع کا لحاظ رکھتا ہے اور نہ عوام ہی کی پاسداری کا خیال۔ نفسِ امارہ جو بھی اس سے کہے بلا تکلف بجا لاتا ہے اس بات کی پروا نہیں رکھتا کہ شریعت کی مخالفت ہے یا موافقت بلکہ

---

[۹] منصب امامت، ص ۹

[۱۰] ایضاً ص ۱۲۷

[۱۱] ص ۱۴۷

اپنی لذاتِ نفسانیہ کے پورا کرنے کو اپنے سلطنت کا ثمرہ سمجھتا ہے ہم اسے سلطنتِ جابرہ کہتے ہیں۔''[12]

ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا نفاذ اور اس کے مطابق احکامات کو نافذ کرنا ہی خلفاء کا اصل مقصد ہے۔ آج کے دور میں اسے ہم رٹ آف دا گورنمنٹ کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں تو احکامِ الٰہیہ تو اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان کو نافذ کیا جائے۔

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (سورۃ الصف:۹)

''تاکہ اللہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔''

تو ان حالات میں ان کا یہ کہنا کہ ''مولانا شاہ صاحب شریعتِ مطہرہ کو قطعی مسترد کر دیتے ہیں''، کس حد تک مبنی بر انصاف ہے؟ اور قطعی الفاظ کا استعمال کس حد تک تحقیقی مزاج کا پتا دیتا ہے؟ جب شریعت ہی بالا دست ہوئی تو اپنے الہام کو مطلقاً تشریعی سمجھنے کا طعن کس حد تک قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے؟

جہاں تک دوسرے طعن کا ذکر ہے تو واضح رہے کہ انبیاء کے الہام کو وحی اور انبیاء کے علاوہ کے الہام کو وہ تحدیث کا نام دیتے ہیں[13]۔ وہ تو نام میں بھی فرق کر رہے ہیں البتہ یہ تسلیم کرتے ہیں وحی اور الہام دونوں کا مصدر ایک ہے وہ ذات باری تعالیٰ ہے۔ لیکن مراتب اور صحت میں فرق کو لازم سمجھتے ہیں۔ وہ اولیاء کے تیسری قسم کے الہام کو (جس میں خود بخود صاحبِ الہام کے دل میں کوئی بات جوش مارتی ہے تو وہ اسے زبان پر لاتا ہے) اگر انبیاء سے ہو تو نفث الروع کہتے ہیں اور اگر یہ اولیاء کا الہام ہو تو اس کو نطق سکینہ کہتے ہیں۔ اسی طرح الہام بذریعہ خواب جیسے حدیث میں مبشرات کہا گیا ہے۔ یقیناً الہام کے وجود پر اور غیر انبیاء کے لیے اس کے ثبوت پر جوہر صاحب کو اعتراض نہ ہوگا کیونکہ اہل سنت سب اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جوہر صاحب یہ طعن کرتے ہیں کہ شاہ شہید نے اسے شریعت پر حکم بنا دیا ہے جبکہ شاہ شہید نے ایسا کہیں نہیں کہا۔ اس کی بجائے وہ اسے حکمتِ اولیاء کی قبیل میں رکھتے ہیں[14]۔ اس پر لقمان علیہ السلام کی حکمت اور حضرت علیؓ کی قوتِ فیصلہ، ابن عباسؓ کی حکمت، ابن مسعودؓ کے تفقہ جیسی چیزوں کو اس پر دلیل بناتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک الہام ہر شخص کی ذمہ داری اور اس کی صلاحیتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک حکیمانہ اسلوب میں مسائل حل کرنے کا ملکہ پیدا ہو جانا بھی الہام کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''الہام مومن اور کسی قدر توکل بھی لوازمِ ایمان سے ہے جس سے انسان اسبابِ شرک اور محرمات شرعیہ کی طرف راغب نہیں ہوتا۔''[15]

البتہ کشف و اسرار کا اظہار کرنا عام اولیاء کے لیے سلب وزوال کا موجب ہو سکتا ہے لیکن امام کے لیے اس کا اظہار ترقی و کمال کا باعث ہے۔ اس کی دلیل وہ فخر کے کلمات جو آئمہ ہدیٰ سے صادر ہوئے بناتے ہیں جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے کہ:

''میں صدیقِ اکبر ہوں میرے بعد یہ لفظ سوائے کذاب کے کوئی نہ کہے گا اور میں قرآن ناطق ہوں۔''[16]

وہ تو واضح طور پر الہام کا دائرہ کار یہ متعین کرتے ہیں کہ وہ شریعت پر کاربند رکھنے کے لیے ایک آلہ ہے۔ اس طرح ایک امام جو صفت ولایت سے بھی متصف ہو اس کا الہام اس میں وہ صلاحیت پیدا کرے گا جس سے وہ امورِ سلطنت کو شریعت کے مطابق اور بہتر طریقے سے سرانجام دینے کے قابل بنائے گا نہ کہ اسے شریعت سے انحراف کی طرف لے کر جائے گا۔ ہاں البتہ وہ اپنے نورِ ولایت سے باہم متعارض نصوص میں ترجیح قائم کر سکتا ہے اور غیر منصوص امور میں اپنی بصیرتِ ملہمہ سے فیصلہ جاری کر سکتا ہے جس کی اطاعت لازم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ نائب رسول ہوتا ہے۔ یہ بصیرت جب فقہاء میں پیدا ہوتی ہے تو وہ انہیں انبیاء کے مقصود کے قریب ترین اجتہاد تک رہنمائی کرتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''چونکہ احکام کی نسبت اوائل امت میں کشف و الہام کی طرف عرف نہ تھا پس اس فن میں انبیاء کے ساتھ مشابہ مجتہدین مقبولین ہیں سو ان کو آئمہ فن سے جاننا چاہیے جیسا کہ آئمہ اربعہ۔''[17]

حالانکہ آئمہ اربعہ نے کبھی الہام کا دعویٰ نہیں کیا لیکن ان کی فقہی بصیرت معروف امر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شہید کے نزدیک الہام کئی قسم کا ہے اور کسی امر کی اہلیت و صلاحیت کا پیدا ہو جانا جو اسے صحیح فیصلہ تک پہنچا دے بھی الہام کی ایک قسم ہے۔ ایسی صلاحیت حکمرانوں کے لیے بھی درکار ہوتی ہے اور جس قدر ان کی شریعت اور قرآن و سنت سے (شریعت سے) نسبت قوی ہوگی اور ذکر و فکر سے نسبتِ نبوت قوی ہوگی اسی قدر وہ منصب امامت سے زیادہ انصاف کر سکیں گے۔ اس کی مثال میں وہ خلفائے راشدین کو سب سے بلند مقام پر رکھتے ہیں۔ کمالاتِ انبیاء کو جب مومنین کے لیے (امام اور خلیفہ بھی اس میں شامل ہے بلکہ بدرجہ اولیٰ شامل ہے) ثابت کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

''تفاوتِ ایمان کے اعتبار سے ان کمالات کے مراتب میں بھی تفاوت ہوتا ہے یہاں تک کہ مرتبہ نبوت تک ان کی انتہا ہے، کیونکہ ہر کمال

[12] ص ۱۵۱
[13] ص ۵۸
[14] ص ۶۳
[15] ص ۷۹
[16] ص ۱۰۵
[17] ص ۸۴

مقامِ نبوت میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ ...... میں ہر گز انبیاء کے کمال کے مراتب کو دوسروں کے مراتب کے سلسلے میں شمار نہیں کرتا۔ کیونکہ انبیاء کرام اور ہیں اور دوسرے عوام اور۔ لہٰذا اس مرتبہ کمال کو جو انبیاء کے مرتبہ کمال کے متصل ہے مذکورہ کمالات کے سلسلے کا انتہائی نچلا درجہ تصور کریں۔ یعنی انبیاء کے کمال کو درجہ اول میں رکھیں اور اس مرتبہ کو دوسرے درجہ میں۔''[18]

اب خود فیصلہ کر لیجیے کہ جوہر صاحب کا نتیجہ درست ثابت ہوتا ہے یا اس کے خلاف نتیجہ درست ثابت ہوتا ہے؟ نہ جانے انہوں نے یہ کہاں سے اخذ کر لیا ہے کہ ان کا الہام شریعت کی جگہ لے لیتا ہے؟ شاہ شہید شریعت کو مسترد نہیں کرتے بلکہ امام کو شریعت کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں انبیاء کا حقیقی جانشین بنانا چاہتے ہیں۔

حقیقت اور ظاہریت کا طعن

اس کے بعد جوہر صاحب شاہ اسماعیل شہید کی طرف اپنی دانست میں ایک نہایت ''شنیع'' عقیدہ منسوب کرتے ہیں اور اپنی دانست میں اسے ایک بڑا اعتراض سمجھتے ہیں جبکہ یہ بھی ان کی فہم کا مسئلہ ہے۔ وہ منصبِ امامت ص ۸۷ کے حوالہ سے لکھتے ہیں ''اکثر احکام شرعیہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک ظاہریت''[19]۔ یہاں مزید رنگ آمیزی کرنے کے لیے وہ اکثر کے لفظ کو بطورِ خاص واضح کرتے ہیں اور اپنے زعم میں حکم شرعی میں ظاہر و باطن کے طے کرنے کے اختیارات فردِ خاص (امام) کو منتقل کرنے کو نشانہ تنقید بناتے ہیں اور اس کو حسبِ روایت متشددانہ انداز میں شریعت کو رد کرنے اور اپنے سیاسی عمل کو الہام تشریعی کے تابع کرنے کا طعن کرتے ہیں۔

وہ شریعت کو کتنی اہمیت دیتے ہیں؟ یہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں۔ یہ بھی اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے نزدیک الہام شریعت کا تابع ہوتا ہے نہ کہ شریعت الہام کے تابع ہوتی ہے۔ یہاں اصل مسئلہ حقیقت اور ظاہریت کا طعن ہے۔ جسے انہوں نے اسے اسماعیلیہ کی طرح شریعت کے ظاہر و باطن کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی اس طرح مکتبِ تشیع میں تصور امام سے شاہ اسماعیل شہید کے تصور امام کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ فقط امامت اور ظاہر و حقیقت جیسے الفاظ سے ایسا ثابت نہیں ہوتا۔ ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے شاہ شہید نے اس حوالہ سے کیا وضاحت دی ہے؟ چنانچہ اسی صفحہ پر لکھتے ہیں:

''لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اصل مقصود ایک نہایت نازک اور باریک نکتہ ہوتا ہے کہ اکثر آدمیوں کے ذہن اس تک نہیں پہنچ سکتے، اور اگر پہنچ بھی جائیں تو وہ لطیف نکتہ دوسرے امور کے ساتھ جو اس کی جنس سے نہیں ان کے ذہن میں مشتبہ ہو جاتا ہے اور غیر مقصود سے مقصود کی تمیز ان کے لیے مشکل ہو جاتی ہے اسی واسطے بعض ظاہری امور کو اس سر خفی کی جگہ رکھ دیتے ہیں اور صورت کو معنی کا حکم دے دیتے ہیں اور اسی ظاہری حکم کا اجرا کرتے ہیں اور اسی ظل کو قائم مقام اصل کے بنا دیتے ہیں۔''[20]

یہاں واضح رہے کہ اسماعیلیہ باطنیہ کے آئمہ باطنی معنی کی آڑ میں ظاہری معنی کو معطل کرنے کا کام کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں مطعون کیا جاتا رہا ہے جبکہ شاہ اسماعیل شہید ظاہری معنی کو معطل کرنے کی بات نہیں کر رہے بلکہ وہ ظاہری حکم کی پوشیدہ حکمتوں اور علل کو دریافت کرنے کی طرف متوجہ کر رہے ہیں اور احکام میں مضمر مصالح کے حصول کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ اس کی بہت سے مثالیں شریعت سے مل جاتی ہیں۔ خود امام ابو حنیفہ کو اہل الرائے اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ وہ ظاہر الفاظِ نصوص کی بجائے احکام کی علل و حکمتوں پر غور کر کے وہ فقہی مسائل حل کر لیتے ہیں جو عام فقہاء کی نظر سے او جھل رہتے ہیں۔ یہاں جوہر صاحب جو ''اکثر احکام'' کے لفظ پر حاشیہ آرائی کی کوشش کر رہے ہیں ان کی اطلاع میں عرض ہے کہ احکامِ شریعت میں سے کوئی بھی حکمت سے خالی نہیں، اور حکمت احکام میں پوشیدہ ہوتی ہے جسے شاہ شہید احکام کی حقیقت کا نام دیتے ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ اکثر احکام کی حکمت ہمارے ذہن میں غور و فکر سے آجاتی ہے لیکن بعض احکام کی حکمت ہماری فہم سے ماورا ہوتی ہے تو اس صورت میں بھی اس حکم کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ حکمت کی تلاش میں غور و فکر کیا جاتا ہے اور غیر مشروط اطاعتِ شریعت تب بھی جاری رہتی ہے۔ جیسے نماز کی رکعتوں اور سجدے کی ایک رکعت میں دو ہونے اور رکوع کے ایک ہونے جیسے امور کہ ان کی حکمت کے بارے میں ہم واضح طور پر کچھ نہیں جان سکتے کیونکہ شارع نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا اور ہماری رائے اس حوالے سے غور و فکر کے نتیجے میں جو بھی بنے وہ بہر حال غلط ہونے کے امکان کے ساتھ ہمارے فہم میں اضافہ کرے گی اور جو شخص شریعت (قرآن و سنت) سے اور انبیاء علیہم السلام کی نسبتوں سے جتنا زیادہ نسبت رکھے گا اتنی زیادہ عمدہ طریقہ سے اس کی حقیقت تک رسائی کر لے گا۔

یہاں انہوں نے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے چند ظاہر و حقیقت کے فرق کو جاننے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ نماز کی حقیقت حضورِ قلب جبکہ ظاہر اس کی ظاہری ہیئت کا قیام ہے، زکوٰۃ کی حقیقت سخاوت اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی سعی ہے، ظاہر مقررہ مقدار میں رقم صدقہ کرنا ہے۔ حج میں حقیقت عشق و محبت سے طواف و سعی کرنا ہے جبکہ ظاہر ارکان کی ادائیگی ہے۔ جہاد کا ایک ظاہر ہے کہ دشمن کے خلاف تلوار چلانا اور مال غنیمت کے حصول کی سعی کرنا ایک اس کی حقیقت ہے کہ غیرت ایمانی کا اظہار ہو، جمیعتِ

---

[18] ص ۸۰

[19] یہاں حقیقت سے مراد صوفیاء کے نزدیک احکام کی حقیقت ہے جو حکم کے ظاہر کے ساتھ اس کے باطنی اثرات کے مجموعے کا مرکب سمجھی جاسکتی ہے۔ (ناقل)

[20] ص ۸۷-۸۸

اسلامی کی خواہش ہو وغیرہ کی طرف شاہ شہید نے اشارہ کیا ہے۔ ان میں سے کسی عمل کو بھی کبھی بھی معطل نہیں کیا جاتا لیکن ظاہر سے حقیقت تک پہنچنے کی سعی کرنا ضروری ہے تاکہ شریعت کے ظاہر کے ساتھ اس کے باطنی فیوض و برکات تک رسائی ہو۔ مزید وہ مثال دیتے ہیں کہ احکام کے ظاہر کی مثال جسمِ انسانی ہے اور باطن کی مثال روحِ انسانی ہے۔ دونوں ضروری ہیں لیکن روح کی تہذیب زیادہ جسم سے بھی بڑھ کر ہے۔"[۲۱]

اسی طرح مومن و منافق کے ایمان کی مثال دیتے ہیں کہ منافق کے باطن میں کفر لیکن ظاہر میں ایمان ہے اس کے باوجود اس کو مومن حکمی قرار دے کر دنیا میں اس سے مومنین کی طرح سلوک کیا جاتا ہے، لیکن آخرت میں اسے سزا و عقاب ہو گا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مصدق مومن مومنِ حقیقی ہے جسے دنیا کے ساتھ آخرت کی نعمتیں بھی ملیں گی۔ اسی طرح ریاکار نمازی دنیا میں تعزیر سے بچ جائے گا لیکن آخرت میں اسے کوئی اس کا اجر نہ ملے گا، لیکن خالص حقیقی نمازی قربِ خدا کے ساتھ نزول رحمت و برکت کے ساتھ جنت اور اس کی نعمتوں کے حصول کا سبب بھی بنے گا۔"[۲۲]

یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شہید چاہتے ہیں کہ اہل ایمان اعمالِ شرعیہ کے ظاہر تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ اس کے باطن میں موجود اس کی حقیقت تک پہنچیں تاکہ دنیا و آخرت میں شریعت پر عمل کے ثمرات حاصل کر سکیں، لیکن جوہر صاحب یہ بدگمانی پالے بیٹھے ہیں کہ وہ حقیقت یا باطن کے نام پر باطنیہ کی طرح شریعت کو معطل کر کے اپنی شریعت چلانا چاہتے ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انہوں نے یہ مفہوم کیسے اخذ کیا؟ جس مقام کا انہوں نے حوالہ دیا اسی جگہ سے میں نے مثالیں پیش کی ہیں۔ وہ خود ہی ایک طعن گھڑتے ہیں اور خود ہی نیت پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

منصبِ امامت شاہ اسماعیلؒ شہید کی نامکمل کتاب ہے جو سیاست، تصوف و کلام کی جامع ہے جسے سمجھنے کے لیے بھی ان علوم اور ان کی اصطلاحات سے واقفیت بنیادی شرط ہے۔ جوہر صاحب اور ان کے حلقے کے متعلق تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ ان سب علوم میں ایسی مہارت کے حامل قطعاً نہیں جو انہیں شاہ صاحبؒ کی عبارات پر حَکم تسلیم کیا جائے۔

ہماری دانست میں ان حضرات کا مدعا محض ان علوم سے قطعی جاہل عوام الناس کو مغالطے در مغالطے میں مبتلا کر کے دراصل تحریکِ مجاہدین اور اس کے اکابر کو متنازع کرنا اور ان حضرات سے واسطے اور تعلق کے سبب برصغیر کی پوری علمی روایت یعنی علمائے دیوبند اور اہل حدیث، ہر دو مکتبِ فکر پر شب خون مارنا ہے۔ ان حضرات کی بابت ہماری یہ رائے محض رائے نہیں بلکہ ان کی دیگر کارستانیوں اور متنازع نظریات کی بدولت ہی قائم ہے جن کا تذکرہ طوالت کے پیش نظر یہاں ممکن نہیں۔

☆☆☆☆☆

مجھے ملا عمر سے فی اللہ محبت ہے!

"امیر المومنین کے بعض نادر کلمات یاد رکھے جانے کے قابل ہیں! یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان پر حق بات جاری کروا دی اور آپ کو نہایت فصاحت کے ساتھ کلمۂ حق کہنے کا ملکہ عطا کیا۔ اللہ نے آپ کو ایسا ایمانی نور، ایسا گہرا فہم اور ایسی عجیب بصیرت عطا کی جس کو الفاظ میں بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ جس طرح شیخ اسامہ کی وہ مشہور 'قسم' ہمارے سینوں میں ایمان و یقین کی بجلیاں بھر دیتی ہے کہ:

'اس ذات کی قسم جس نے آسمانوں کو بلا ستون بلند کیا! امریکہ اور اس میں رہنے والے خواب میں بھی امن نہیں دیکھ پائیں گے جب تک ہمارے بھائیوں کو فلسطین میں حقیقی امن میسر نہ آ جائے اور جب تک تمام کافر افواج محمد عربی ﷺ کی سرزمین سے نکل نہ جائیں!'

بالکل اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ ایمان و یقین امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد حفظہ اللہ کے یہ تاریخی کلمات ہمارے سینوں میں بھر دیتے ہیں کہ:

'میرے سامنے دو وعدے ہیں، اللہ نے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے اور بش نے شکست و ہزیمت کا۔ میں اللہ کے وعدے کو تھامے کھڑا ہوں اور عنقریب سب دیکھ لیں گے کہ دونوں میں سے کس کا وعدہ سچا تھا!'

اسی طرح آپ کا یہ بلیغ جملہ بھی آج تک کانوں میں گونجتا ہے اور آپ کی ایمانی بصیرت کا پتہ دیتا ہے کہ:

'بلا شبہ امریکہ ایک بڑا ملک ہے، لیکن اس کی عقل چھوٹی ہے اور وہ حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے دھوکے میں مبتلا ہے۔'

میں اللہ عزوجل کو اور اللہ کی تمام مخلوقات کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد سے بہت محبت کرتا ہوں، اگرچہ مجھے ان کے دیدار کا شرف نصیب نہیں ہوا! اور یقیناً تمام معاملات اللہ ہی کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹتے ہیں! میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ امیر المومنین کو راہِ حق پر ثابت قدم رکھیں اور ہمیں اور انہیں حسنِ خاتمہ نصیب فرمائیں، آمین!

اے اللہ! جیسے تیرے اس بندے نے تیرے دین کی نصرت کی، تو اس کی نصرت فرما!"

شیخ عطیۃ اللہ اللیبی شہید رحمۃ اللہ علیہ

[۲۱] ص ۸۸-۸۹

[۲۲] ص ۹۰

کفار کا معاشی بائیکاٹ

اسلامی بائیکاٹ جدید جنگ کے تناظر میں

اسلام کے خلاف جاری عالمی صہیونی جنگ کے تناظر میں اسلامی مقاطعہ کو سمجھنا، نافذ کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا

محمد ابراہیم لَڈوِک

محمد ابراہیم لَڈوِک (زید مجدہ) ایک نو مسلم عالمِ دین ہیں جنھوں نے عالَمِ عرب کی کئی جامعات میں علمِ دین حاصل کیا۔ موصوف نے کفر کے نظام اور اس کی چالوں کو خود اسی کفری معاشرے اور نظام میں رہتے ہوئے دیکھا اور اسے باطل جانا، ثم ایمان سے مشرف ہوئے اور علمِ دین حاصل کیا اور حق کو علی وجہ البصیرۃ جانا، سمجھا اور قبول کیا، پھر اسی حق کے داعی بن گئے اور عالَمِ کفر سے نبرد آزما مجاہدین کے حامی اور بھرپور دفاع کرنے والے بھی بن گئے (نحسبه كذلك والله حسيبه ولا نزكي على الله أحدا)۔ انہی کے الفاظ میں: 'میرا نام محمد ابراہیم لَڈوِک ہے (پیدائشی طور پر الیگزانڈر نیکولئی لڈوک)۔ میں امریکہ میں پیدا ہوا اور میں نے علومِ تاریخ، تنقیدی ادب، علمِ تہذیب، تقابلِ ادیان، فلسفۂ سیاست، فلسفۂ بعد از نو آبادیاتی نظام، اقتصادیات، اور سیاسی اقتصادیات امریکہ اور جرمنی میں پڑھے۔ یہ علوم پڑھنے کے دوران میں نے ان اقتصادی اور معاشرتی مسائل پر تحقیق کی جو دنیا کو متاثر کیے ہوئے ہیں اور اسی دوران اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام ایک سیاسی اور اقتصادی نظام ہے جو حقیقتاً اور بہترین انداز سے ان مسائل کا حل لیے ہوئے ہے اور یوں میں رمضان ۱۴۳۳ھ میں مسلمان ہو گیا'، اللہ پاک ہمیں اور ہمارے بھائی محمد ابراہیم لڈوک کو استقامت علی الحق عطا فرمائے، آمین۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام، سیکولرازم، جمہوریت، اقامتِ دین و خلافت کی اہمیت و فرضیت اور دیگر موضوعات پر آپ کی تحریرات لائقِ استفادہ ہیں۔ مجلہ 'نوائے غزوۂ ہند' شیخ محمد ابراہیم لَڈوِک (حفظہ اللہ) کی انگریزی تالیف 'Islamic Boycotts in the Context of Modern War' کا اردو ترجمہ پیش کر رہا ہے۔ (ادارہ)

احتیاطی نکات (۲)

مصرف (Consumption)

بائیکاٹ ہدف کفر اور اللہ کے دشمنوں کو کمزور کرنا اور اسلام اور مسلمانوں کو قوی کرنا ہے۔ یہ اصول ذہن نشین کر لیں:

درء المفسدة مقدة على جلب المصلحة[1]

"مفسدے کو دور کرنا مصلحت کے حصول پر مقدم ہے۔"

شیطان صرف ہمیں حرام کی طرف دھکیلنے کی ہی کوشش نہیں کرتا، بلکہ اس کی ایک چال یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے بندے کو زیادہ مفید اعمال سے ہٹا کر کم مفید اعمال میں مشغول کر دے۔ اگر بائیکاٹ کرتے ہوئے ہم زیادہ نفع بخش کاموں کو چھوڑ دیں، اور دشمن کو کم نقصان پہنچانے کے لیے خود کو زیادہ نقصان میں مبتلا کر لیں، تو بائیکاٹ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

عام استعمال کی اشیاء کے بائیکاٹ میں وقت اور پیسہ صرف ہو سکتا ہے۔ بڑی کمپنیوں سے خوراک خریدنے سے گریز کرنا بعض اوقات زیادہ مہنگا اور غیر سہل ثابت ہو سکتا ہے۔ ریڈی میڈ کپڑے خریدنے کی بجائے خود کپڑے تیار کرنا زیادہ مہنگا اور وقت طلب کام ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صفائی اور گھریلو استعمال کی مصنوعات خود بنانا سیکھنے اور مختلف ترکیبیں آزمانے کے لیے وقت درکار ہو سکتا ہے۔

بائیکاٹ میں یقیناً فائدہ ہے، لیکن اگر آپ مختلف کمپنیوں اور برانڈز کے پس منظر کی تحقیق میں گھنٹوں صرف کر دیں، تو ممکن ہے کہ عبادت کے کہیں زیادہ عظیم مواقع اور زیادہ مؤثر عملی اقدامات آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی عالمِ دین آپ کے علاقے میں چند ہی دنوں کے لیے آیا ہوا ہو، تو یہ بہتر ہو سکتا ہے کہ آپ ایسی کمپنی کا ڈٹرجنٹ خرید لیں جس کا بائیکاٹ ہونا چاہیے، بجائے اس کے کہ ڈٹرجنٹ بنانے کی تراکیب آزمانے میں لگ کر ایک مفید درس سے محروم رہ جائیں۔ دشمن کو معمولی سی رقم سے محروم کرنے کے لیے قیمتی علم حاصل کرنے کا موقع گنوانا دانش مندی نہیں۔ آپ بعد میں، جب کوئی زیادہ اہم فائدہ میسر نہ ہو، ڈٹرجنٹ بنانے کی ترکیبوں پر کام کر سکتے ہیں۔

تاہم، بائیکاٹ سے متعلق بعض فیصلوں کے طویل المدت فوائد بھی ہو سکتے ہیں۔ صہیونی حامی کارپوریشن سے صابن یا ڈٹرجنٹ خریدنے کے بجائے اسے خود تیار کرنا اگرچہ وقت اور محنت کا تقاضا کرتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ آپ کو ان کمپنیوں کے ساتھ تعاون کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اگر آپ اسے دوسرے مسلمانوں کو فروخت کریں یا تحفے میں دیں تو یہ آپ کے لیے آمدنی یا برکت کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے، جبکہ اس طرح کافروں کے منافع میں مزید کمی آئے گی۔ آپ یہ مہارت اپنے خاندان اور دوستوں تک بھی منتقل کر سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں اللہ کے دشمنوں کو مزید معاشی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ علم مسلمانوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ بھی کر سکتا ہے، لہٰذا مختصر مدت میں جو زحمت آپ اٹھائیں گے، وہ طویل مدت کے بے شمار فوائد کے مقابلے میں متوازن ہو جائے گی۔

بائیکاٹ سے متعلق فیصلے کرتے وقت درج ذیل سوالات پر غور کریں:

- اگر میں یہ چیز نہ خریدوں تو دشمن کو کتنا نقصان ہوگا؟
- متبادل تلاش کرنے میں مجھے کتنا وقت اور کتنا خرچ آئے گا؟
- کیا متبادل تلاش کرنے میں صرف ہونے والی محنت کوئی اور طویل المدت فائدہ بھی فراہم کرے گی؟
- کیا متبادل کی تلاش میں وقت اور پیسہ صرف کرنے کی وجہ سے میں کسی اور اہم فائدے سے محروم تو نہیں ہو جاؤں گا؟

---

[1] مراقي السعود

فوائد کی ترجیح

نقصانات اور فوائد کا موازنہ کرتے ہوئے، اور خریداری یا پیشہ ورانہ مواقع سے متعلق فیصلے کرتے وقت، سب سے پہلے اپنی ایمانی سلامتی کو مقدم رکھنا چاہیے۔ اگر کسی معاشی یا سیاسی فائدے کے حصول کی قیمت فتنہ میں مبتلا ہونا یا اپنے عقیدے پر سمجھوتا کرنا ہو، تو ایسے فائدے کے حصول بے معنی ہے۔

اگر آپ کو دو ملازمتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے، ایک ایسی ملازمت جس میں نیک اور مسلمان ساتھی ہوں، اور دوسری ایسی جس میں فاسق اور بدکردار ساتھی ہوں، تو بہتر یہ ہو سکتا ہے کہ آپ وہ ملازمت اختیار کریں جس میں صالح رفاقت میسر ہو، خواہ اس کے نتیجے میں صہیونی حامی قوتوں کو نسبتاً زیادہ معاشی فائدہ پہنچتا ہو۔ اسی طرح مختلف ممالک میں کاروبار یا سرمایہ کاری کے معاملے میں بھی، کسی ایسے ملک کا انتخاب بہتر ہو سکتا ہے جہاں دینی ماحول زیادہ سازگار ہو، اگرچہ اس کی حکومت صہیونی قوتوں کے زیادہ قریب سمجھی جاتی ہو، کیونکہ وہاں کام کرنا آپ کے ایمان اور عبادت پر اثر انداز ہوگا۔ بائیکاٹ کو کبھی بھی ان ذمہ داریوں میں خلل کا سبب نہیں بننا چاہیے جو اس سے زیادہ اہم ہیں۔ اس میں اپنے اہلِ خانہ کی کفالت، علم کا حصول، اور جہاد فی سبیل اللہ کے دیگر اہم پہلو شامل ہیں۔

اگر جہاد کے کسی زیادہ اہم تقاضے کو پورا کرنے کے لیے بائیکاٹ کو عارضی طور پر ترک کرنا ضروری ہو، تو ضرورت کی حد تک اسے ترک کیا جا سکتا ہے۔ جہاد کے زیادہ اہم پہلوؤں میں براہِ راست قتال، جس میں قتل کرنا اور قتل ہونا شامل ہے، مجاہدین کو اسلحہ اور رسد فراہم کرنا، دشمن کی نقل و حرکت اور اس کی پوزیشنوں سے متعلق معلومات حاصل کرنا، دشمن کو مسلمانوں کی نقل و حرکت اور پوزیشنوں سے آگاہ ہونے سے روکنا، دشمن کی رسد اور سپلائی کے نظام میں خلل ڈالنا، اور اسی نوعیت کے دیگر امور شامل ہیں۔ جب بھی بائیکاٹ پر عمل کرنے کی وجہ سے کوئی زیادہ بڑا فائدہ ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، تو اس بڑے فائدے کے حصول کے لیے بائیکاٹ کو معطل کر دینا چاہیے۔

نصیحت کرنے میں حکمت

جس طرح یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ پر اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے، اسی طرح دوسروں کو نصیحت کرتے وقت ان کے حالات اور استعداد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر آپ کسی شخص کو بائیکاٹ کی دعوت دیں، لیکن ابتدا ہی میں اس سے بہت زیادہ مطالبہ کر بیٹھیں، تو ممکن ہے کہ وہ اس خیال کو ہی مکمل طور پر رد کر دے۔ ہم سب زیادہ کچھ کر سکتے ہیں، لیکن بائیکاٹ کی بعض صورتیں دوسری صورتوں کے مقابلے میں زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَسَكِّنُوا وَلَا تُنَفِّرُوا[2]

"لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو، انہیں خوش خبری دو اور متنفر نہ کرو۔"

جس طرح دعوتِ دین کے ہر میدان میں اخلاق بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی پیغام پہنچانے کا طریقہ نہایت اہم ہے۔ مقصد اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور ان کی اصلاح ہے، نہ کہ انہیں نیچا دکھانا یا ان کی تحقیر کرنا۔ ضدی لوگوں یا ان افراد کے ساتھ الجھنے سے گریز کریں جو اس موضوع پر سنجیدہ گفتگو کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ بائیکاٹ کے حق میں دلائل پیش کر دیں، پھر انہیں قبول یا رد کرنے کا فیصلہ خود کرنے دیں۔

البتہ بعض حالات میں ایسے مسلمانوں پر دباؤ ڈالنا مناسب ہو سکتا ہے جو کسی شرعی تاویل یا اجتہادی رائے کی بنیاد پر نہیں، بلکہ محض سستی یا امت کے معاملات سے بے پروائی کے باعث بائیکاٹ سے گریز کرتے ہیں۔ بعض مواقع پر ایسے مسلمانوں کا معاشرتی بائیکاٹ بھی مناسب ہو سکتا ہے، جس طرح ہم کسی ایسے مسلمان کے ریسٹوران کا بائیکاٹ کر سکتے ہیں جو شراب فروخت کرتا ہو۔ دوسروں کو بائیکاٹ کی دعوت دینے اور اس کے دائرے کو وسیع کرنے کے معاملے میں مثبت اور منفی دونوں طریقے مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن ہر فرد کے ساتھ اس کی شخصیت، مزاج اور حالات کے مطابق رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

گمراہ لوگوں سے تعلقات استوار کرنے سے ہوشیار رہیں

مختلف پس منظر رکھنے والے مسلمان، بلکہ بہت سے غیر مسلم بھی، ان کمپنیوں کے بائیکاٹ میں سرگرم ہیں جو صہیونی قبضے اور اس کے جرائم کی حمایت کرتی ہیں۔ اگرچہ بائیکاٹ ایک مفید اقدام ہے، لیکن اس میں دلچسپی بعض اوقات ایسے لوگوں سے روابط کا سبب بن سکتی ہے جو انسان کے لیے منفی اثرات کا باعث بنیں۔

خصوصاً بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افراد، جن میں کمیونسٹ اور سوشلسٹ شامل ہیں، بائیکاٹ کی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح شیعہ، سیکولر عناصر اور دیگر گمراہ یا بدعتی گروہ بھی فلسطینی کاز کی حمایت کرتے ہیں اور بائیکاٹ کی مہمات میں حصہ لیتے ہیں۔

بعض اوقات زیادہ اہم امور پر توجہ مرکوز رکھنے کے لیے ایسے لوگوں کے ساتھ غیر ضروری تنازعات سے گریز کرنا دانش مندی ہو سکتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے ساتھ اتحاد قائم کیا جائے یا ان کے ساتھ برابری کی بنیاد پر اختلاط اور قربت اختیار کی جائے۔ برے اثرات کے خطرے کے علاوہ، گمراہ لوگوں کی تائید یا ان کے افکار پر رضامندی کا اظہار درحقیقت ان پر ظلم کے مترادف ہے، کیونکہ اس سے وہ اپنی غلطی پر مزید مضبوط ہو جاتے ہیں۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆

[2] صحیح بخاری

اخباری
کالموں کا جائزہ

شاہین صدیقی

انڈیا میں مساجد پر بڑھتے ہوئے حملے

انڈیا میں مساجد کے خلاف کاروایاں باقاعدہ ایک مہم کی صورت میں کی جا رہی ہیں۔ پچھلے ایک ماہ میں بی جے پی کے زیر انتظام علاقوں دہلی، مہاراشٹر، اتر پردیش، گجرات، راجھستان اور ہریانہ میں درجنوں مساجد کو بلڈوزر مافیا نے شہید کر دیا، اور اہم بات یہ ہے کہ اس معاملے پر ہندوؤں کی بڑی تعداد بی جے پی حکومت سے متفق ہے۔ کانگریس ہو یا دوسری پارٹیاں کوئی بھی اس حرکت کے خلاف آواز نہیں اٹھا رہا۔ وہاں کی مسلم کمیونٹی جگہ جگہ احتجاج کرتی ہے لیکن کمزور کی بات کی کوئی اہمیت نہیں، بات طاقت کے زور پر ہی سنی جاتی ہے وہ کہتے ہیں نا جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

Muslim Mirror کی ایک رپورٹ کے مطابق:

Over 23 Mosques, Madrasas, Eidgahs and Dargahs Demolished in 45 Days — All in BJP-Ruled States | Ayesha Afnan

”ہزار برس قدیم ایک تاریخی مسجد سے لے کر دو سو سالہ درگاہ تک، بی جے پی کے زیر اقتدار بھارت کی متعدد ریاستوں میں مسلم مذہبی مقامات کے انہدام کی حالیہ لہر نے شدید تشویش کو جنم دیا ہے۔

یہ انہدامی کارروائیاں محض چند الگ تھلگ واقعات معلوم نہیں ہوتیں۔ مئی سے اب تک کم از کم ۲۳ مسلم مذہبی مقامات، جن میں مساجد، درگاہیں، عیدگاہیں اور مدارس شامل ہیں، چھ ریاستوں میں منہدم کیے جا چکے ہیں۔ اسی سلسلے میں وارانسی (بنارس) کی ایک ہزار سالہ تاریخی مسجد گنج شہیداں بھی انہدام کی کارروائی کی زد میں ہے۔

اس نوعیت کی کارروائیوں کی اطلاعات دہلی، مہاراشٹر، اتر پردیش، گجرات، راجستھان اور ہریانہ سمیت متعدد بی جے پی حکومت والی ریاستوں سے موصول ہوئی ہیں۔ ان مسلسل انہدامی اقدامات نے یہ الزامات جنم دیے ہیں کہ مسلم مذہبی مقامات کو دانستہ اور امتیازی انداز میں نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

ان تمام واقعات میں قانونی تقاضوں کی پاسداری نہیں کی گئی۔ انہدامی کارروائی سے قبل کسی بھی مقام کو پیشگی نوٹس جاری نہیں کیا گیا۔ مزید بر آں، جہاں مسلم مذہبی عمارتوں کے خلاف کارروائی کی گئی، وہیں ان کے آس پاس موجود مبینہ طور پر غیر مجاز ہندو مذہبی انفراسٹرکچرز کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا۔“

[Muslim Mirror]

یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں، اس کے پیچھے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں دو دہائیوں سے ہونے والے اقدامات ہیں، جن میں مسلمانوں کی ماب لنچنگ، حجاب پر حملے، مسلمانوں کے نکاح اور وراثت کے شرعی قوانین کے خلاف اقدامات، وہاں موجود شہروں، محلوں اور درس گاہوں کے مسلمان حکمرانوں کے دور کے رکھے گئے ناموں کی ہندوؤں سے منسوب ناموں سے تبدیلی، تاریخی مساجد کو مندر بنانے کی ناپاک سازشیں، لو جہاد، معاشی جہاد کے نام پر مسلمانوں کا بائیکاٹ، غرض یہ کہ مسلمانوں سے منسوب پوری کی پوری تاریخ مٹانے اور انڈیا کو ہندو راشٹر بنانے کے لیے جس منظم انداز میں درجہ بدرجہ کام کیا جا رہا ہے، بالکل صیہونی ماڈل کا عکاس ہے۔ لہٰذا وہاں موجود مسلمانوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے اور متحد ہو کر اس کے خلاف عملی اقدام اٹھانے چاہیں۔

مساجد کے اس طرح شہید کیے جانے پر وہاں کے مسلمان بہت تکلیف دہ صورتحال کا شکار ہیں لیکن طاقت نہ ہونے کے سبب وہ اس متعلق اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے ہیں۔ اس متعلق وہاں کے مسلمان تجزیہ نگار کیا لکھتے ہیں وہاں کے کالموں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

چار دن میں تین مسجدیں شہید|معصوم مراد آبادی

”گزشتہ ہفتہ ملک میں مسجدوں پر بلڈوزر چلانے کے لیے یاد رکھا جائے گا، کیونکہ اس عرصے میں راجستھان اور اتر پردیش میں تین مسجدوں کو ناجائز قرار دے کر بے رحمی سے شہید کر دیا گیا۔ اتر پردیش کے بنارس اور سنبھل کے بعد راجستھان کے شہر جے پور میں جس انداز میں مسجدوں پر بلڈوزر چلے ہیں، ان سے کئی پریشان کن سوالات ایک ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں۔ یوں تو بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی ناجائز تعمیر کے بعد ہی سے ملک بھر میں مسجدوں، مدرسوں اور مزاروں پر حملے جاری ہیں اور متعدد جگہ پر انہیں غیر قانونی قرار دے کر منہدم کیا جا رہا ہے، لیکن حالیہ عرصے میں جس طرح ایک منظم سازش کے تحت

مسجدوں کو زمین بوس کرنے کی مہم شروع ہوئی ہے اسے کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس مہم کا مقصد محض ناجائز اور غیر قانونی تعمیرات کا انہدام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی زد میں وہ مندر بھی آتے جو بڑی تعداد میں سڑکوں اور سرکاری زمینوں پر ناجائز قبضہ کر کے بنائے گئے ہیں۔ محض مسجدوں کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دے کر منہدم کرنا دراصل مسلمانوں کی مذہبی شناخت کو مٹانے کی سازش کا حصہ ہے، جس کو سرکاری مشنری کی سرگرم حمایت حاصل ہے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں جس وقت رام جنم بھومی تحریک اپنے شباب پر تھی اور بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی تیاریاں چل رہی تھیں تو کچھ نام نہاد مسلم دانش وروں نے کہا تھا کہ 'اگر ایک مسجد کی دست برداری کے عوض امن حاصل کیا جاسکتا ہے تو یہ سودا برا نہیں ہے'۔ لیکن اس وقت بھی ہم جیسے سرپھروں نے یہی لکھا تھا کہ بابری مسجد پر رام مندر بنانے کی تحریک محض ایک مسجد کو مندر میں بدلنے کی تحریک تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے مسلمانوں کی مذہبی شناخت مٹانے کی منظم سازش کارفرما ہے۔ بابری مسجد کا انہدام محض ایک تاریخی مسجد کا انہدام نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے مسلمانوں کی مذہبی شناخت کو مٹانے کی سازش کارفرما تھی اور اس سازش میں کچھ 'گھر کے بھیدی' بھی شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگست ۲۰۱۹ء میں بابری مسجد پر سپریم کورٹ کے ظالمانہ فیصلے سے ایک روز قبل مسلمانوں میں موجود کچھ کالی بھیڑیں قومی سلامتی کے مشیر کی رہائش گاہ پر لذیذ کھانا کھانے جمع ہوئی تھیں اور باہر نکل کر انہوں نے اپنے مذہبی تشخص سے زیادہ اس کھانے کی تعریف کی تھی جو بے غیرتی کے خمیر سے تیار ہوا تھا۔ یہاں کسی کے کردار پر انگلی اٹھانا مقصود نہیں بلکہ ہم آپ کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جو بابری مسجد سے دستبردار ہو کر امن خریدنا چاہتے تھے وہ آج کہیں نظر نہیں آرہے، بلکہ نظر وہ عام مسلمان آرہے ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں بے بسی اور لاچاری کے ساتھ اپنی مسجدوں پر بلڈوزر چلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس سیکولر جمہوری ملک میں ان کے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں ہے جس کے ذریعے وہ اپنی مذہبی علامتوں کو مٹانے کے اس ظالمانہ سلسلے کو روک سکیں۔"

[روزنامہ اعتماد]

مسجدوں کو پوری طرح مٹانے کی مذموم مہم | ندیم عبد القدیر

"اس پوری صورتحال میں سب سے زیادہ تشویشناک پہلو ملک کے عدالتی اور قانونی نظام کا خاموش تماشائی بنے رہنا یا پھر کاروائیوں کو بالواسطہ شہ دینا ہے۔ قانون کی بالا دستی کا تقاضا تو یہ تھا کہ کسی بھی تاریخی یا مذہبی مقام کو منہدم کرنے سے پہلے فریقین کو صفائی کا پورا موقع دیا جاتا اور دستاویزات کی مکمل جانچ پڑتال ہوتی، لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ عدلیہ بھی 'بلڈوزر سیاست' کے آگے سربسجود ہو چکی ہے۔ سرکار کے فیصلوں اور اس کی پالیسی کے خلاف کاروائی کرنے کے بارے میں سوچنے سے بھی عدلیہ کے ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ عدالتوں کے حکم امتناعی (سٹے آرڈر) کے باوجود راتوں رات مساجد کو زمین بوس کر دیا جاتا ہے اور عدالت ان غیر قانونی کاروائیوں کے خلاف کچھ نہیں کرتی۔

مساجد پر ہونے والے ان پے در پے حملوں کو سنگھ پریوار اور گودی میڈیا کی جانب سے 'غیر قانونی تعمیرات پر کاروائی' نام کے پروپیگنڈے سے درست ٹھہرانے کی منظم کوشش کی جارہی ہے۔ میڈیا ہاوسز دن رات زہریلا پروپیگنڈا چلا کر اکثریتی آبادی کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا رہے ہیں کہ مسلمانوں نے ملک کی قیمتی زمینوں پر 'زمین جہاد' کے تحت ناجائز قبضے کر رکھے ہیں۔ اس زہریلی ذہن سازی کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ صدیوں پرانی تاریخی مساجد کے انہدام پر تمام ہندو شہری احتجاج کرنے کے بجائے جشن مناتے ہیں۔ نفرت کی یہ آگ اب صرف مٹی اور گارے کی دیواروں تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ ملک کے سیکولر تانے بانے کو بھی خاکستر کر رہی ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرنے والے ملک میں اقلیتوں کی عبادت گاہوں پر یہ منظم مظالم عالمی برادری اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے لیے بھی ایک بڑا لمحہ فکریہ ہیں۔ مسلمانوں کے لیے زمین تنگ ہو رہی ہے اور اس کا سب سے خوفناک پہلو یہ ہے کہ مستقبل قریب میں اس کے ختم ہونے کی امید بھی نہیں۔"

[روزنامہ اردو ٹائمز]

مسجد اقصیٰ خطرے میں

قبلۂ اول مسجد اقصیٰ مستقل صہیونی ناکہ بندی، صہیونی آبادکاروں کی بڑھتی ہوئی دراندازیوں اور بے حرمتی کا شکار بنی ہوئی ہے، اور اسرائیلی وزراء علی الاعلان مسجد اقصی کمپاؤنڈ میں یہودی عبادت کی اجازت اور مسجد اقصیٰ کو شہید کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے، پہلے سے جاری مسلسل ناکہ بندی، تلاشی کے نام پر ذہنی اذیت اور گرفتاریاں، نوجوانوں کے مسجد میں داخلے پر پابندی جبکہ یہودی تہواروں کے مواقع پر مسلمانوں کے داخلے پر پابندی اور اس طرح کے خود ساختہ قوانین جو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو مسجد میں داخلے سے روک سکیں، وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

حالیہ ایران اسرائیل امریکہ جنگ میں ساٹھ دن کے لیے مسجد اقصیٰ کو نمازوں تک کے لیے بند کر دیا گیا۔ جہاں غزہ، مغربی فلسطینی علاقوں اور مشرقی یروشلم میں فلسطینیوں کی املاک پر قبضہ کر کے انہیں ان کے اپنے علاقوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے، وہاں مسلمانوں کے قبلۂ اول پر قبضہ کو قانونی شکل دینے کی بھی سازشیں بُنی جا رہی ہیں۔

مڈل ایسٹ آئی کی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق امریکہ اور اسرائیل ایک ایسے منصوبے کو آگے بڑھا رہے ہیں جس کے مطابق حرم الشریف مسجد اقصیٰ کی نگرانی اردن کے محکمہ اوقاف سے چھین کر مکمل طور پر اسرائیل کے حوالے کر دی جائے گی اور اسرائیلی حکومت کے جانب سے ایک ادارہ قائم کیا جائے گا جس کے تحت مسجد اقصیٰ کو ایک سیاحتی مرکز اور Multi-Faith Center یا کثیر المذاہب مرکز بنا دیا جائے گا اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کو بھی یہاں مذہبی رسومات کی مکمل آزادی ہو گی۔ یہ نیا ادارہ اماموں کی تقرری، جمعہ کے خطبوں کے مواد سمیت الحرم الشریف کے تمام امور پر کنٹرول رکھے گا۔

فلسطین میں موجود قبلۂ اول سمیت مسلمانوں اور عیسائیوں کے اہم مذہبی مقامات ۱۹۶۷ء کے سٹیٹس کو قانون (Status Quo Law) کے تحت براہ راست اردن کے حکومت کی نگرانی میں اور اردن کے محکمہ اوقاف کے تحت آتے ہیں۔ اس قانون کے مطابق مسجد اقصیٰ کی اندرونی سکیورٹی، اماموں کی تقرری اور مسجد سے متعلق تمام امور اردن کا محکمہ اوقاف کی ذمہ داری ہیں جبکہ بیرونی سکیورٹی اسرائیل کے اختیار میں ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو پچھلے چند سالوں میں یہ اختیار نام کا ہی رہ گیا ہے اور اسرائیل عملاً مسجد اقصیٰ پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔ حال ہی میں ۷۳ سے زائد محافظوں اور ملازمین کو مسجد اقصیٰ میں ان کے کام کی جگہوں سے زبردستی بے دخل کیا گیا ہے، جبکہ یکم جون ۲۰۲۶ء سے مغربی کنارے سے تعلق رکھنے والے ۳۰ انتظامی ملازمین کے اجازت نامے منسوخ کر دیے گئے۔ وقتاً فوقتاً وقف کونسل کے ممبران اور ائمہ پر مسجد میں داخلے پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ جبکہ اس متعلق اردن خانہ پری کے لیے اقوام متحدہ میں اپنا رسمی زبانی احتجاج ریکارڈ کروا کر چپ بیٹھ رہتا ہے۔

چاہے نام کا ہی سہی، لیکن یہ قانون یہودیوں کے لیے مسجد اقصیٰ میں آزادی سے داخلے اور وہاں عبادت کرنے میں رکاوٹ ہے۔ مڈل ایسٹ آئی کی رپورٹ کے مطابق نیتن یاہو نے ایک دہائی قبل یہ منصوبہ ٹرمپ کو پیش کیا تھا اور اسرائیل میں امریکی سفیر مائیک ہکابی نے عہدہ سنبھالتے ہی ٹرمپ کے داماد جیرڈ کشنر اور مارکو روبیو کے ساتھ مل کر اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے کوششیں شروع کر دیں تھی جبکہ اس متعلق متحدہ عرب امارات، بحرین اور مراکش کو امریکہ پہلے ہی بریفنگ دے چکا ہے۔ اردن اور سعودی عرب اس منصوبے کی اس بنا پر مخالفت کر رہے ہیں کہ ایسی کوئی حرکت پورے خطے کے حالات خراب کر سکتی ہے۔ جبکہ متحدہ عرب امارات اور بحرین کی پوزیشن ابھی واضح نہیں ہے۔ چونکہ ان دونوں ممالک کے اسرائیل سے قریبی تعلقات ہیں تو کچھ بعید نہیں یہ دونوں ممالک اس منصوبے میں اسرائیل کا ساتھ دیں۔ اس معاملے کی حساسیت سمجھنے کے لیے ابراہیمی مسجد کے معاملے پر نظر ڈالتے ہیں۔

سانحہ ابراہیمی مسجد

فلسطینی شہر الخلیل (ہیبرون) میں واقع تاریخی ابراہیمی مسجد بھی اپنی اہمیت کے اعتبار سے مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے اہم مقدس مقام ہے، کیونکہ تاریخی روایات کے مطابق یہاں حضرت ابراہیم علیہ سلام، حضرت اسحٰق علیہ سلام اور حضرت یعقوب علیہ سلام کے مقبرے ہیں۔

۱۹۹۴ء میں ایک یہودی نے مسجد میں گھس کر فجر کی نماز میں انتیس نمازیوں کو شہید کر دیا جس کے بعد اسرائیلی حکومت نے مسجد کو ۹ ماہ کے لیے سیل کر دیا۔ جس کے بعد صہیونی حکومت نے ایک کمیشن بنایا جس نے مسجد کا دو تہائی حصہ یہودیوں اور ایک تہائی حصہ مسلمانوں کے لیے مختص کر دیا۔ اس کے بعد سے اب تک یہودی تہواروں میں یہودیوں کو عبادت کے لیے تمام سہولیات فراہم کی جاتی ہیں جبکہ مسلمانوں کے اہم مواقع (رمضان، عیدین) پر اتنی سختی کی جاتی ہے کہ مسلمان مسجد تک آزادانہ رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ اور اسی طرز پر اب یہ صہیونی ہمارے قبلۂ اول پر بھی قبضے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

اس رپورٹ کی روشنی میں مڈل ایسٹ آئی پر ہی ایک تجزیہ شائع ہوا ہے جس میں اس معاملے کی حساسیت اور نزاکت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

Al-Aqsa: The moment of peril is here. Will the Muslim world act? | Ismail Patel

> ”مسجدِ اقصیٰ میں کبھی جمعہ کی نماز کے لیے لاکھوں فرزندانِ اسلام جمع ہوتے تھے۔ آج اسرائیلی پابندیوں اور مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی منظم پالیسی کے باعث وہاں روزانہ کی نمازوں میں کبھی چند ہزار اور کبھی صرف چند سو نمازی ہی پہنچ پاتے ہیں۔
>
> اسرائیل پہلے ہی اس بات پر مکمل اختیار حاصل کر چکا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ میں کون داخل ہو سکتا ہے اور کون نہیں۔
>
> فلسطینی نمازیوں پر عائد کی جانے والی یہ پابندیاں کسی اتفاق یا وقتی فیصلے کا نتیجہ نہیں، بلکہ نو آبادیاتی حکمتِ عملی کا سوچا سمجھا اظہار ہیں، جس کا مقصد مسلسل دباؤ اور تدریجی کمزوری کے ذریعے فلسطینی وجود کو گھلا دینا ہے۔ صرف رواں سال کے دوران چھ سو سے زیادہ فلسطینیوں کو مسجدِ

اقصیٰ میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ اوقاف کے تیس ملازمین کے داخلے کے اجازت نامے منسوخ کر دیے گئے، جبکہ چھ ائمہ کو خاموش کرواکر خطبہ دینے سے بھی محروم کر دیا گیا۔

مسجدِ اقصیٰ کے سینئر امام، شیخ عکرمہ صبری، کے بقول یہ ’بے مثال اور غیر معمولی اقدامات‘ ہیں، جن کا مقصد غلبہ اور تسلط مسلط کرنا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم کہتے تھے کہ مسجدِ اقصیٰ خطرے میں ہے، مگر آج حقیقت یہ ہے کہ اسے ایک نہیں بلکہ بے شمار خطرات نے گھیر رکھا ہے، اور ہر نیا خطرہ پہلے سے موجود خطرات کو مزید سنگین بنا رہا ہے۔

اسلامی شناخت کا محور

گزشتہ ماہ اسرائیلی وزراء اور ارکانِ پارلیمان نے منظم انداز میں بڑی تعداد میں مسجدِ اقصیٰ پر دھاوا بولا۔

اسرائیلی پارلیمان کے ایک رکن نے برملا مطالبہ کیا کہ مسجدِ اقصیٰ کو منہدم کر کے اس کی جگہ یہودی ہیکل تعمیر کیا جائے۔ اس دوران مسجدِ اقصیٰ کے احاطے میں اسرائیلی پرچم بھی لہرائے گئے۔

میں یہ بات پوری صراحت سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت عالمِ اسلام کو درپیش سب سے بڑا خطرہ صرف اسرائیلی جارحیت نہیں، جو امریکی طاقت اور مالی سرپرستی کے بل بوتے پر جاری ہے، بلکہ اس سے بھی بڑا خطرہ اُن لوگوں کی بے حسی، باہمی تفرقے اور ادارہ جاتی مفلوجیت ہے جو مسجدِ اقصیٰ کو اپنا مقدس مقام قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے مسجدِ اقصیٰ کوئی ایسا تاریخی ورثہ نہیں جسے محض سفارتی بیانات کے ذریعے محفوظ رکھا جا سکے۔ یہ اسلام کا پہلا قبلہ ہے، معراجِ نبی ﷺ اور سفرِ اسراء کی مقدس سرزمین ہے، امت کی نہایت مقدس مسجد ہے، اور اسلامی شناخت و تہذیب کا زندہ محور ہے۔ اس کی بے حرمتی محض ایک جغرافیائی یا سیاسی اشتعال انگیزی نہیں، بلکہ دو ارب سے زائد مسلمانوں کی اجتماعی یادداشت، دینی تشخص اور وجود پر براہِ راست حملہ ہے۔

مگر اس کے باوجود عالمِ اسلام صرف مذمتی بیانات جاری کرتا ہے اور پھر خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ حکومتیں جو حقیقی معاشی اور سفارتی دباؤ ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اپنے مفادات کا حساب لگاتی ہیں اور نظریں چرا لیتی ہیں۔ وہ امت جو سڑکوں پر نکل کر تاریخ کا رخ موڑ سکتی تھی، اب محض اپنی موبائل اسکرینوں پر خبریں دیکھ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

خاموشی بھی جرم میں شراکت ہے

مسلم دنیا سے باہر کے لوگوں کے لیے بھی اس معاملے کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ جو کچھ آج ہو رہا ہے، وہ درحقیقت ایک ایسے مقدس مقام پر نوآبادیاتی حاکمیت کو باقاعدہ قانونی شکل دینے کی کوشش ہے، جسے دو ارب سے زیادہ انسان مقدس مانتے ہیں۔

اگر یہ عمل کامیاب ہو گیا تو ایک ایسی خطرناک مثال قائم ہو جائے گی جس کے مطابق کسی قوم کی شناخت کو بتدریج مٹانے کا عمل، اگر مؤثر پروپیگنڈے اور سامراجی سرپرستی کے ساتھ انجام دیا جائے، تو نہ صرف برداشت کر لیا جاتا ہے بلکہ بالآخر اس کا صلہ بھی دیا جاتا ہے۔

عرب تنظیم برائے انسانی حقوق نے ان خلاف ورزیوں کی منظم اور مسلسل نوعیت کو نہایت تفصیل سے دستاویزی شکل دی ہے۔ مگر عالمی برادری نے، مجموعی طور پر، خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اور یہ خاموشی غیر جانب داری نہیں، بلکہ ظلم میں عملی شراکت کے مترادف ہے۔

فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا ہے۔ عالمِ اسلام اور ہر وہ شخص جو نوآبادیاتی صفائے اور جبر کے خلاف کھڑا ہے، اسے فوری طور پر سفارتی، قانونی، معاشی اور اخلاقی، ہر ممکن ذریعے کو بروئے کار لانا ہوگا۔

اگر ہم نے اب بھی اپنے ضمیر اور اپنے عقیدے کی پوری قوت کے ساتھ اقدام نہ کیا، تو ”بقائے باہمی“ کی خوش نما زبان کو ایک ایسے صہیونی منصوبے کی تکمیل کے لیے استعمال کر لیا جائے گا، جس کی بنیاد کئی دہائیاں پہلے رکھی گئی تھی اور جس کا مقصد فلسطینیوں کو ان کی سرزمین سے محروم کرنا ہے۔“

[Middle East Eye]

غزہ اور مغربی کنارہ

بین الاقوامی میڈیا پر جہاں امریکہ ایران معاہدے، سیز فائر اور آبنائے ہرمز کو کھولنے پر تبادلہ خیال کیا جا رہا ہے، وہاں اسرائیل خاموشی کے ساتھ بچے کھچے فلسطینی علاقوں پر ایک ناسور کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے، چاہے وہ غزہ ہو یا مغربی کنارہ۔ جہاں غزہ میں خود ساختہ زرد لکیر (Yellow Line) کو صہیونی فوجی مغرب کی طرف توسیع دے کر اب ۶۴ فیصد غزہ پر قابض ہیں اور نیتن یاہو نے قابض فوج کو غزہ کے ستر فیصد حصے پر قبضہ کرنے کا گرین

سگنل دے دیا ہے وہیں مغربی کنارہ میں مسلسل بڑھتے ہوئے صہیونی آبادکاروں کے فلسطینی دیہی کمیونٹی پر حملے اور ان کی املاک و زمینوں کو جلانا اور ان پر قبضہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ خاص طور پر فلسطینی معاشرے کے اہم ستون یعنی مساجد، پانی، زرعی زمینیں اور زیتون کے درخت ان کے مسلسل نشانے پر ہیں۔

ابھی جون کے مہینے میں ہی جلجلیہ اور مزرع النوبانی میں مساجد کو آگ لگا کر شہید کر دیا گیا اور الخلیل کی الراس مسجد میں فجر کی نماز میں مسلمانوں پر حملہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ گرمی کی شدت بڑھتے ہی صہیونی آبادکاروں نے فلسطینی علاقوں میں پانی کی سپلائی لائن پر حملے شروع کر رکھے ہیں۔ شکر ہے کہ چند میڈیا ادارے فلسطین پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں اور دنیا کو حالات کی اصلیت سے آگاہ کر رہے ہیں کہ اس وقت دریائے اردن کے مغرب میں فلسطینی علاقے اور غزہ کن خطرات سے دوچار ہے۔

When the Iran War is Over: Why the West Bank May Be Netanyahu’s Next Front | Dr Ramzy Baroud

”اکتوبر میں جنگ بندی نافذ ہونے کے بعد بھی غزہ پر اسرائیلی فائرنگ تقریباً روزانہ جاری رہی۔ موسم بہار تک جنگ بندی کی دو ہزار سے زیادہ دستاویزی خلاف ورزیاں ریکارڈ کی جا چکی تھیں، جبکہ کم از کم ۹۸۱ فلسطینی شہید کیے جا چکے تھے، جن میں بڑی تعداد بچوں کی تھی۔ ان میں سے بہت سے صرف اس لیے گولیوں کا نشانہ بنے کہ وہ اس زرد لکیر کے قریب پہنچ گئے تھے جو خود مسلسل ان کی طرف سرکتی چلی آ رہی ہے۔

عمارتیں آج بھی منہدم ہو رہی ہیں۔ بچے آج بھی مارے جا رہے ہیں۔ نشانہ باز (سنائپر) آج بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ ڈرون آج بھی فضا میں منڈلا رہے ہیں۔ بلڈوزر آج بھی زمین ہموار کر رہے ہیں۔ اور اس سب کے باوجود ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ اسے ’جنگ بندی‘ کا نام دیں۔

خوراک کی قلت بھی ختم نہیں ہوئی۔ امداد کو ایک انسانی حق کے بجائے حساب کتاب کا معاملہ بنا دیا گیا ہے: کتنی کم امداد اندر آنے دی جائے، کتنی سست رفتاری سے اسے پہنچایا جائے، اور لوگوں کو کتنی دیر تک صرف اتنا زندہ رکھا جائے کہ وہ مر نہ جائیں، مگر جینے کے قابل بھی نہ رہیں۔

مارچ کے وسط میں، جب دنیا کی توجہ ایران کی طرف منتقل ہو چکی تھی، اسرائیلی فوج نے امدادی اداروں کو ایسے نقشے بھیجے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے جنگ بندی کے دوران مقرر کی گئی زرد لکیر سے مزید ۱۱ فیصد اندر تک پیش قدمی کر لی ہے، یعنی غزہ کے اُس ۵۳ فیصد حصے سے، جس پر جنگ بندی نے اسے قابض رہنے کی اجازت دی تھی، قبضہ بڑھا کر ۶۴ فیصد تک پہنچا دیا گیا۔

مئی کے آخر تک اسرائیلی وزیرِ اعظم بنیامین نیتن یاہو ایک آبادکاروں کی کانفرنس میں فخر سے بتا رہا تھا کہ فوج پہلے ہی غزہ کے ۶۰ فیصد علاقے پر قابض ہو چکی ہے، اور اس نے اسے ۷۰ فیصد تک قبضہ بڑھانے کا حکم دے دیا ہے۔ مجمع ’سو فیصد‘ کے نعرے لگا رہا تھا، اور نیتن یاہو انہیں یقین دلا رہا تھا کہ اسرائیل مرحلہ وار آگے بڑھ رہا ہے، پہلے ۷۰ فیصد، پھر باقی بھی۔

اب فلسطینی اپنے ہی وطن کے تقریباً دو تہائی حصے تک رسائی سے محروم ہو چکے ہیں، جن میں غزہ کی تقریباً تمام زرعی زمینیں بھی شامل ہیں، کیونکہ ان کا بیشتر حصہ اسی زرد لکیر کے مشرق میں واقع ہے۔ اب خود جغرافیہ فاقوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ بن چکا ہے۔

کسان اپنی زمینوں تک پہنچنے کی کوشش میں گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ ماہی گیر سمندر تک جانے کی پاداش میں قتل کر دیے جاتے ہیں۔ خاندان اپنے تباہ شدہ گھروں کے ملبے تک واپس لوٹنے کی کوشش کریں تو ان پر فائرنگ کی جاتی ہے۔ خوراک کی تلاش میں نکلنے والے بچے صرف اس لیے ہدف بن جاتے ہیں کہ وہ ان لکیروں کو عبور کر لیتے ہیں جو اسرائیل نے انہی کے محلّوں کے بیچ کھینچ رکھی ہیں۔

یہ نسل کشی ہے، مگر ایسی نسل کشی جو جغرافیے کے ذریعے نافذ کی جا رہی ہے۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جسے ایران کی کہانی پردۂ اخفا میں دھکیل دیتی ہے۔

جب غزہ کی سرحدی گزرگاہیں بند کی جاتی ہیں تو اسرائیل اسے ’سکیورٹی‘ قرار دیتا ہے۔ جب امداد روکی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ پورا خطہ خطرے میں ہے۔ جب فلسطینی قتل کیے جاتے ہیں تو ان کی ہلاکتوں کو ایران کے ساتھ جاری جنگ کا حصہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اور گولی چلنے کے بعد انہیں ’دہشت گرد‘، ’دہشت گردوں کا حامی‘ یا ’خطرہ‘ قرار دے دیا جاتا ہے۔ قتل کے بعد ان پر وابستگیوں کے لیبل چسپاں کیے جاتے ہیں، گویا اس سے بچوں کے سروں میں گولیاں مارنے کا جرم بھی جائز ہو جائے گا۔

یوں فلسطین ایک بار پھر کسی اور کہانی کے اندر گم ہو جاتا ہے۔ مرنے والے اب اس لیے مردہ نہیں سمجھے جاتے کہ اسرائیل نے انہیں قتل کیا، بلکہ اس لیے کہ خطہ غیر مستحکم ہے، ایران خطرناک ہے، اور اسرائیل اپنے بقول 'اپنا دفاع' کر رہا ہے۔ ہر فلسطینی لاش پر ایک ایسی توجیہ کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے جو اس چھینی گئی زندگی سے کہیں بڑی بنا کر پیش کی جاتی ہے۔

......ایران کے ساتھ ہونے والا کوئی بھی معاہدہ اس وقت تک خطے میں 'جنگ کے خاتمے' کی علامت نہیں ہو سکتا، جب تک فلسطینی سرزمین مسلسل ہتھیائی جا رہی ہو، غزہ کو بھوک کے عذاب میں مبتلا رکھا جا رہا ہو، اور مغربی کنارہ فوجیوں، آبادکاروں، چوکیوں اور خاردار تاروں کے ذریعے ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا رہا ہو۔

فلسطین کو کسی اور کے تنازعے کا محض ایک ضمنی اثر سمجھ لینے سے مشرقِ وسطیٰ میں کبھی استحکام پیدا نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہی فلسطین وہ مقام ہے جہاں یہ جنگ بار بار جنم لیتی ہے، جہاں جنگ بندی، تسلط کا دوسرا نام بن جاتی ہے، جہاں خوراک کی قلت ایک سرکاری پالیسی میں ڈھل جاتی ہے، اور جہاں چہرے پر گولی کھا کر شہید ہونے والا ایک شیر خوار بچہ بھی محض ایک حاشیہ بنا دیا جاتا ہے۔

سام ابو ہیکل[1] کو فلسطینی پرچم میں لپیٹ کر سپردِ خاک کیا گیا۔ اس کے والد اسے اپنی بانہوں میں اٹھائے ہوئے تھے، اور یوں اس کے ساتھ اس معصوم بچے کے سارے خواب بھی دفن ہو گئے۔

لیکن سام ہی دراصل اس پوری جنگ کی علامت تھا، وہ داستان جسے ہر نئی سرخی کسی اور کے میزائلوں کی خبر کے حاشیے میں دفن کر دیتی ہے۔ فراموشی، اور فراموش کر دیے جانے کا عمل، اسرائیل کا آخری اور شاید سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔"

[Aljazeera English]

لبنان پر اسرائیل کے بڑھتے ہوئے حملے اور ٹرمپ نیتن یاہو اختلافات

لبنان میں جاری اسرائیلی حملوں میں اب تک چار ہزار دو سو چونسٹھ لوگ جاں بحق ہو چکے ہیں اور بارہ ہزار سے زیادہ زخمی ہیں (سرکاری اعداد و شمار)، جبکہ جنوبی لبنان کے جن علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر کے بفر زون بنایا ہے وہاں سے اب تک دس لاکھ لوگ بے گھر ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود صہیونی قابض فوج کی پیش قدمی جاری ہے اور مزید کئی دیہاتوں کو وارننگ جاری کر دی گئی ہے کہ علاقہ خالی کر دیں۔

اسرائیل نے امریکہ کو ایران جنگ کی آگ میں جھونکا، جس وقت ٹرمپ اس جنگ سے شکست خوردہ ہو کر اپنی ساکھ تباہ کر کے مفاہمتی یادداشت (MoU) پر دستخط کر رہا تھا، جس میں ایک شق یہ بھی ہے کہ لبنان سمیت ہر محاذ پر مکمل اور غیر مشروط جنگ بندی ہو گی، اس وقت امریکہ کی بگڑی ہوئی ناجائز اولاد اسرائیل لبنان کے بے گناہ شہریوں پر مسلسل حملے جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ ٹرمپ اور نیتن یاہو کے اختلافات کھل کر سامنے آئے ہیں۔ جہاں ایک طرف اسرائیلی وزراء اور اسرائیلی میڈیا جو ٹرمپ کے گن گاتا تھا اب اس کی اسرائیل سے "غداری" پر اسے خوب تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں، تو وہیں جواب میں ٹرمپ اور نائب وزیر اعظم جے ڈی وینس نے بھی میڈیا پر اسرائیل کو آنکھیں دکھائی ہیں۔ چونکہ اسرائیل کی شیطانی حرکتیں خود امریکی عوام کے سامنے بھی کھل کر آ چکی ہیں اس لیے عوام ایران کے ساتھ معاہدے پر ٹرمپ کی سپورٹ میں ہیں اور اسرائیلی حمایت کے خلاف بول رہے ہیں۔

جب ٹرمپ نے نیتن یاہو سے مطالبہ کیا کہ لبنان میں جنگ بندی کرو اور اپنی فوجیں نکال لو تو جواب میں نیتن یاہو نے بھی کہہ دیا کہ: "اسرائیلی فوج شام، لبنان اور غزہ میں قائم اپنے سکیورٹی زونز میں جب تک ضرورت ہو گی موجود رہے گی اور اسرائیل اپنے خلاف حملے کے جواب میں کاروائی کا حق برقرار رکھے گا"۔

یہ اختلافات ایک ایسے اہم موقع پر سامنے آئے ہیں جب امریکہ اور اسرائیل کے مفادات ٹکرائے ہیں اس لیے تجزیہ نگاروں کے نزدیک یہ بہت ہی اہم اور نادر موقع ہے اور مستقبل کے حالات پر اس کا گہرا اثر ہو سکتا ہے۔ اس پر تجزیہ نگاروں میں سے دو مختلف رائے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں:

Vance's warning to Israel signals a new phase in US-Israeli relations | Abed Abou Shhadeh

"اسرائیلی حکام نے اس معاہدے پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ نیتن یاہو کے حامی ذرائع ابلاغ نے ٹرمپ کے مشیروں اسٹیو وٹکوف اور جیرڈ کشنر کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے، جبکہ کانگریس میں اسرائیل نواز ارکان اور امریکہ کے قدامت پسند میڈیا نے ایران کے ساتھ مذاکرات کی مخالفت میں باقاعدہ مہم شروع کر دی ہے۔

......آج جو چیز مختلف دکھائی دیتی ہے، وہ واشنگٹن کا ردِ عمل ہے۔ اپنی پوزیشن میں نرمی دکھانے کے بجائے، ٹرمپ انتظامیہ نے کھلے عام

---

[1] سام ابو ہیکل وہ سات ماہ کا معصوم بچہ ہے جسے قابض صہیونی نے الخلیل میں گاڑی پر فائرنگ کر کے شہید کیا جب وہ اپنی ماں کی گود میں تھا۔

اسرائیلی مؤقف کو چیلنج کیا ہے۔ جب جے ڈی وینس نے یہ کہا کہ اسرائیل کے دفاعی ہتھیاروں کا تقریباً دو تہائی حصہ امریکی سرمایہ اور امریکی صنعت کی پیداوار ہے، تو اس نے ایک ایسی حقیقت کی نشاندہی کی جس پر امریکی حکام نے شاذ ہی کبھی کھل کر بات کی ہے۔ اس بیان کا مفہوم بالکل واضح تھا: اگرچہ امریکہ اور اسرائیل کا اتحاد بدستور نہایت اہم ہے، لیکن اسرائیل کی سٹریٹیجک خود مختاری بڑی حد تک امریکی فوجی، مالی اور سفارتی پشت پناہی کی مرہونِ منت ہے۔

یہ بات ایک ایسے ریپبلکن نائب صدر کی زبان سے سننا، جو ایک ایسے صدر کا سیاسی جانشین سمجھا جاتا ہے جسے طویل عرصے تک اسرائیل کے مضبوط ترین حامیوں میں شمار کیا جاتا رہا ہے، غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی۔

اسی طرح، جب مذاکرات فیصلہ کن مرحلے کے قریب پہنچ رہے تھے، تو بیروت پر اسرائیلی حملوں پر وینس کی تنقید بھی کم اہم نہیں تھی۔ اس نے نشاندہی کی کہ ان حملوں میں ہلاک ہونے والوں کی بڑی تعداد عام شہریوں پر مشتمل تھی، اور خبردار کیا کہ ایسی کارروائیاں وسیع تر سفارتی کوششوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ یہ تنقید دراصل ٹرمپ انتظامیہ کے اندر بڑھتی ہوئی اس بے چینی کی عکاس تھی کہ بعض امریکی حکام کے نزدیک اسرائیل دانستہ ایسے اقدامات کر رہا ہے جو واشنگٹن کے لیے سٹریٹیجک اہمیت رکھنے والے اس سفارتی عمل کو پیچیدہ بنانے یا سبوتاژ کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔“

[Aljazeera English]

لبنان کو مقبوضہ مغربی کنارہ بنانے کی تیاری | وسعت اللہ خان

”ہم اسی پر خوش ہیں کہ ٹرمپ نے نیتن یاہو کو جنوبی لبنان میں جنگ تیز کرنے پر کئی بار ننگی ننگی سنائیں کیونکہ نیتن یاہو اس حرکت سے ایران امریکہ ممکنہ سمجھوتہ سبوتاژ کرنا چاہ رہا ہے۔ نیتن یاہو نے بظاہر ٹرمپ کی انا کی وقتی تسکین کے لیے جنوبی بیروت پر حملہ نہ کرنے کا ’احسان‘ کر دیا مگر اصل مقصد سے نیتن یاہو پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا یعنی جنوبی لبنان کو ’لبنانیوں سے پاک‘ بفر زون بنانا۔

حالانکہ امریکہ ایران مفاہمتی یادداشت میں واضح طور لبنان سمیت تمام محاذوں پر جامع اور مستقل جنگ بندی پر اتفاق کیا گیا ہے تاہم وہاں اسرائیلی فوج اسی طرح پنجے گاڑنا چاہتی ہے جس طرح ۱۹۶۷ء سے اب تک مغربی کنارے اور غزہ پر گاڑے ہیں۔ پھر اس بفر زون میں یہودی آبادکاری کی بنیاد ڈالی جائے گی اور جیسے جیسے دنیا ان حالات کی عادی ہوتی چلی جائے گی مغربی کنارے کی طرح جنوبی لبنان کو بھی غیر اعلانیہ ہڑپ کیا جائے گا۔

مغربی کنارہ مرحلہ وار ہتھیانے کے لیے پہلے پی ایل او کو دہشت گرد تنظیم قرار دیا گیا۔ پھر اسے لالی پاپ دیا گیا کہ مسلح جدوجہد ترک کرنے کی صورت میں ایک آزاد و خود مختار فلسطینی ریاست کے امکان پر غور ہو سکتا ہے۔ جب پی ایل او نے ہتھیاروں سے تائب ہونے کا فیصلہ کیا تو رفتہ رفتہ اسے اسرائیل نے بی ٹیم کے طور پر قبول کر لیا۔ آج مغربی کنارے پر تیز رفتار یہودی آبادکاری جاری ہے اور فلسطینی اتھارٹی علاوہ رسمی چیخ و پکار کچھ نہیں کر پا رہی۔

بالکل اسی فارمولے کے تحت غزہ میں ’دہشت گرد حماس‘ کے دانت نکالنے کی کوشش زوروں پر ہے اور بعینہ لبنان میں اسرائیل کو منہ دینے والی واحد تنظیم حزب اللہ سے ہتھیار رکھوانے کی بھرپور امریکی اسرائیلی کوشش ہو رہی ہے۔ لاچار لبنانی حکومت کو اسی طرح گھٹنوں کے بل بٹھا کر استعمال کیا جا رہا ہے جس طرح پی ایل او کو فلسطینی اتھارٹی کا باجا تھما کر دیگر مزاحمتی گروہوں کو نیوٹرل بنانے کے لیے استعمال کیا گیا۔

......اب تک جنوبی لبنان کے کم از کم چھ قصبات غزہ اسٹائل میں بلڈوزروں سے مٹا دیے گئے ہیں، دس ہزار سے زائد رہائشی و کاروباری املاک تباہ کر دی گئی ہیں، روزانہ چار چھ دیہاتوں کو خالی کرنے کا حکم جاری ہو رہا ہے، ساڑھے تین ہزار شہری ہلاک ہو چکے ہیں، طائر اور نباتیہ جیسے تاریخی شہروں کو مرحلہ وار برباد کیا جا رہا ہے۔ ہدف یہ ہے کہ ان علاقوں سے جو ایک ملین سے زائد لبنانی نکل چکے ہیں وہ واپس نہ آ سکیں۔ یوں خالی زمین نئی یہودی بستیوں کے تصرف میں آ سکے۔“

[روزنامہ ایکسپریس]

اس معاملے پر وسعت اللہ خان کا تجزیہ بہت اہم ہے۔ اسرائیل کے لبنان پر قبضے کا وہی پیٹرن ہے جو اس نے فلسطینی علاقوں کو ہتھیانے کے لیے اپنایا تھا۔ یہاں یہ بات بھی بحث طلب ہے کہ واشنگٹن اور تل ابیب کے درمیان اختلافات آگے جا کر کیا شکل اختیار کریں گے۔

جیسا کہ ٹرمپ نے خود تسلیم کیا کہ "There is no Israel without the U.S"۔ اسرائیل کی بنیاد سے لے کر اس کی بقا امریکہ کی ہی مرہونِ منت ہے۔ امریکہ کی جانب سے اسرائیل کو سالانہ آٹھ اعشاریہ تین (۸ء۳) بلین ڈالر کی دفاعی امداد باقاعدگی سے فراہم کی جاتی ہے جو امریکیوں کے ٹیکس کے پیسوں سے ادا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں نائب امریکی صدر جے ڈی وینس کی بات بھی قابلِ ذکر ہے جس میں اس نے کہا:

"اسرائیل میں کابینہ کے ان ارکان کو جو امریکہ کے صدر پر حملے کر رہے ہیں، میں کہوں گا کہ پچھلے تین مہینوں میں تمہارے وطن کی حفاظت کرنے والے دو تہائی ہتھیار امریکی ہاتھوں نے بنائے ہیں اور ان کی ادائیگی امریکی ٹیکس ڈالرز سے ہوتی ہے۔"

ایک اور بات جسے مدِ نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ میں کون حکومت میں آتا ہے اور کس کو حکومت سے فارغ کرنا ہے یہ کام وہاں موجود صہیونی لابی "ایپک" (American Israeli Public Affairs Committee) کرتی ہے، اور یہ لابی اتنی طاقتور ہے کہ پس پردہ ہر پالیسی اس کی مرضی سے ہی بنتی ہے۔ اس طرح یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگرچہ نیتن یاہو آدھے سے زیادہ غزہ پر بھی قبضہ کر کے بیٹھ گیا ہے، مغربی کنارے، لبنان اور شام میں بھی پیش قدمی کر رہا ہے، ایران سے بھی جنگ چھیڑ کر دیکھ لی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا رسوا کیا کہ اسے کہیں اپنے مطلوبہ اہداف حاصل نہ ہو سکے، اور لگتا ایسا ہے کہ نیتن یاہو کا سیاسی کیریئر اپنے انجام کے قریب ہے، اس کی جگہ کوئی اور لے گا جو شاید اس سے بھی بدتر ہو۔ دوسری طرف ٹرمپ نے، جس سے اسرائیلی لابی کو کافی امیدیں تھیں، جس طرح سوشل میڈیا پر اور علی الاعلان اسرائیل کو جھاڑ پلائی اور ایران کے ساتھ جنگ میں شکست خوردہ ہو کر امریکہ کی ساکھ تباہ کی، اس کا سیاسی کیریئر بھی تاریک نظر آ رہا ہے۔ البتہ امریکہ اسرائیل تعلق میں کوئی تبدیلی نہیں آنے والی۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ صہیونیوں کی ناپاک سازشیں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں، ان کے مقرر کردہ اہداف بھی عیاں ہیں، قبلۂ اول، غزہ، فلسطین اور پھر شام و لبنان سب ہی خطرے میں ہیں۔ ملاحم کا دور آیا ہی جاتا ہے، امتِ مسلمہ بالعموم اور مجاہدین بالخصوص آگے کی تیاری کریں۔ امریکہ و اسرائیل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور یہی اصل دشمن ہیں باقی مسلم حکمران تو صرف ان کی انگلیوں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ امت کے راہبروں کو درست اہداف مقرر کر کے دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنا کر کھڑا کر دے آمین۔

☆☆☆☆☆

بقیہ: موت ومابعد الموت

"ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿وَيُسْقٰى مِنْ مَّاۤءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ﴾ (سورۃ ابراہیم: ۱۶) کے بارے میں فرمایا: '(پیپ) اس کے منہ کے قریب کی جائے گی تو وہ اسے ناپسند کرے گا اور جب اسے اور قریب کیا جائے گا تو اس کا چہرہ بھن جائے گا اور اس کے سر کی کھال گر جائے گی اور جب وہ اسے پیے گا تو اس کی آنتیں کٹ جائیں گی، یہاں تک کہ اس کے سرین سے نکل جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَسُقُوْا مَاۤءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۤءَهُمْ﴾ (سورۃ محمد: ۱۵) "ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ ان کی آنتوں کو کاٹ دے گا" اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَاۤءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ﴾ (الکہف: ۲۹) "اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو تلچھٹ کی طرح ہو گا، چہرے کو بھون دے گا اور وہ نہایت برا مشروب ہے'۔"

جہنمی اس قدر پیاسے ہوں گے کہ جو چیز ان کی کھال تک کو گلا کر گرا دے گی، وہ پھر بھی اسے پئیں گے، اس سے اندازہ کریں کہ وہ پیاس ان کے لیے کس قدر تکلیف دہ ہو گی کہ وہ اسے ایسے اذیت ناک مشروب کے ذریعے بھی بجھانے کی کوشش کریں گے۔

اہلِ جہنم کے لباس

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ (سورۃ الحج: ۱۹)

"جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے، ان کے لیے آگ کے کپڑے تراشے جائیں گے۔"

ان کا لباس آگ ہو گا۔ نیز ایک اور آیت میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ ان کے لباس قطران، یعنی پگھلے ہوئے تانبے کے ہوں گے۔ تصور کریں کہ پگھلا ہوا گرم تانبا مستقل جسم کو بطور لباس ڈھانپے ہوئے ہو گا۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝ (سورۃ ابراہیم: ۴۹، ۵۰)

"اور تم دیکھو گے مجرموں کو اس روز کہ وہ جکڑے ہوئے ہوں گے باہم زنجیروں میں، ان کے کُرتے ہوں گے گندھک کے اور ڈھانپے ہوئے ہو گی ان کے چہروں کو آگ۔"

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی صحبہ وسلم

☆☆☆☆☆

کس کی جان گئی......

محترمہ عامرہ احسان صاحبہ

امریکہ، اسرائیل ایران جنگ کو سو دن سے زیادہ ہو چکے۔ نظامِ عالم امریکہ اسرائیل کی جنگجوئی کے ہاتھوں گزشتہ پونے تین سال سے درہم برہم ہے۔ غزہ، لاطینی امریکہ، ایران میں جنگ، دنیا بھر میں جابجا دھمکیاں، مفتی عزائم نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ جس آبنائے ہرمز سے ۱۰۰ جہاز روزانہ گزرتے تھے اب صرف ۷ گزر پاتے ہیں۔ سینکڑوں جہاز سمندر میں اٹکے پڑے ہیں۔ پٹرول کی قیمتوں پر ۱۴۶ ممالک اس بحران کی براہِ راست زد میں ہیں جو پوری ملکی معیشت پر نہ صرف ٹرانسپورٹ بلکہ صنعتی دائرے میں کئی مصنوعات پر ضرب لگاتی ہیں۔ غریب، کمزور ممالک سب شدت سہہ رہے ہیں۔ ان ممالک کی اشرافیہ، حکمران طبقہ، ذرائع وسائل مٹھی میں دبوچے سارا بوجھ عوام کی ٹوٹی کمر ہی پر منتقل کرتے ہیں۔ ان کے سیر سپاٹوں، اللوں تللوں پر آنچ نہیں آتی۔ اگرچہ امریکہ، اسرائیل خود قرضوں میں دب پس رہے ہیں۔ لیکن وہاں بھی وہ جنگ میں رتی بھر کمی نہیں آنے دیتے، عوام کی طبی، تعلیمی، سوشل سیکورٹی سے مزید ڈالر نچوڑ لیتے ہیں۔

ٹرمپ پوری شانِ بے نیازی سے کہتا ہے۔ 'ایران تنازعہ ایک جنگی مشق ہے۔' وہ اب بھی یہ وعدہ دینے کو تیار نہیں کہ آئندہ کوئی جنگ نہ ہو گی۔ خلیج فارس پر تباہ کن ڈرون، میزائل اڑتے پھرتے ہیں مگر یہ جنگ، ٹرمپ کے لیے ایک کھیل ہے چاند ماری کا۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ جنگ کے پس پردہ لبنان پر اسرائیل، ایران اپنے مقاصد اہداف پورے کرنے میں مقابلے پر لگے ہوئے ہیں۔ الجزیرہ، سیٹلائٹ تصاویر سے، لبنان کے سرسبز و شاداب علاقے، ۱۰۰ بلڈنگیں دکھاتا ہے جو اسرائیلی حملے نے تباہ و برباد، ہموار کر دیں۔ یہ مشرقِ وسطیٰ کی بربادی کی جنگ ہے بھرپور منصوبہ بندی سے۔ ایران کی آڑ میں لبنان میں تین ہزار پانچ سو ترانوے (۳۵۹۳) جاں بحق اور دس ہزار نو سو نوے (۱۰۹۹۰) زخمی ہو چکے، ۱۰ لاکھ دربدر۔ غزہ کے ۷۰ فی صد پر قبضے اور لبنان کا پانچواں حصہ اس جنگ میں زیر قبضہ۔

گزشتہ ۳ سالوں سے بین الاقوامی قانون، تمام متعلقہ ادارے، عدالتیں سکتے کی حالت میں ناکام رہیں۔ دم نہ کشیدم، عالم میں ہیں۔ کوئی اف نہیں کہہ سکتا۔ چھوٹے ممالک جی حضوری کے ریکارڈ توڑ رہے ہیں۔ اور ۹ ارب انسان بھینٹ چڑھے ہیں۔ اُدھر ٹرمپ خاندان (باقی حکمرانوں کے بھی!) کا رئیل اسٹیٹ کاروبار چل رہا ہے۔ دامادِ عالم کشنر اور بیٹی ایوینکا، البانیہ میں جزیرے پر عشرت گاہ بنانے کی تیاری میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ آنجہانی ایپسٹن کا تذکرہ ہو رہا ہے کشنر کے اس پلان پر، اس جزیرے کے حوالے سے: 'نیا ایپسٹن' کے عنوان سے۔ البانیہ کے عوام غم و غصے سے دیوانے مظاہرے کر رہے ہیں کہ یہ البانیہ پر 'نرم قبضے' کی کوشش ہے۔

کشنر کے چھان بین کے ضمن میں البانیہ میں ۴ ارب ڈالر کے اس پراجیکٹ پر بینک اکاؤنٹ منجمد کر دیے گئے۔ البانیہ سے اسرائیلی آبادکاروں کو بھی بے دخلی کا سامنا ہے۔ عوام دیگر مقامات سے بھی اسرائیلیوں کو نکالنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ برازیل میں بھی اسرائیلی سیاحوں کو ٹھڈے کھانے پڑ گئے عوام سے!

حالیہ جنگ میں ملحوظ رہے کہ یہ حملے مشرقِ وسطیٰ میں بالخصوص مسلم ممالک کے دفاعی نظام کو تباہ کن نقصان پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں۔ 'امریکی اڈوں' کے عنوان سے اس نظام کے خریدار عرب ممالک تھے۔ قبل از وقت انتباہ (وارننگ) کے بیش قیمت راڈار، قطر، امارات، سعودی عرب، بحرین، کویت میں نشانہ بنائے گئے۔ یہ پورا نظام باہم ان ممالک میں مربوط ہے۔ یہ نقصان صرف ایک ملک کا نہیں۔ مثلاً قطر کے نظام پر حملہ ہمسایہ ممالک کی بھی دشمن پر نظر رکھنے کی صلاحیت چھین کر علاقائی دفاع کو اندھا، نابینا کر دیتا ہے۔ ایران، یمن، خلیج فارس پر سے نگاہ چھین لی۔ اس کی قیمت ۱.۱ ارب ڈالر تھی۔ بحرین، کویت میں کئی Radome (گنبد میں محفوظ کئی راڈار) پر حملہ کر کے سیٹلائیٹ رابطوں کا نظام تباہ کیا۔ قبل از وقت اطلاعی دفاع سے محروم ہو گئے۔ سعودی عرب میں پرنس سلطان ایئربیس اور امارات میں دو اڈوں پر کئی ارب ڈالر 'تھاڈ' نظام (جو نہایت بلندی پر دفاعی بیٹریاں ہوتی ہیں) کو ناکارہ کر دیا۔ ان کے بغیر حملہ آور، بیلسٹک میزائلوں سے بروقت نمٹنا ممکن نہیں رہتا۔ شمال مشرقی سعودی عرب میں ایئرپورٹ پر لانگ رینج راڈار جو ۴۷۰ کلو میٹر تک نگرانی کا حفاظتی تحفظ دیتا ہے، تباہ کیا۔ اس سے اب کروز میزائل اور ڈرون کی بروقت اطلاع، خبرداری ممکن نہیں رہی۔ ان نقصانات کے بدلے امریکہ اپنے مہنگے ترین، فضا میں رہ کر اطلاع کام کرنے والے، 'ایواکس' جہاز، اردن، سعودی عرب اور عراق پر تعینات کر رہا ہے۔ اس کی ادائیگی مسلم ممالک کریں گے اور نفع امریکہ ہی کا ہے، مفت احسان نہیں! اڈوں کے میزبان کیونکہ مسلم ممالک ہیں، لہٰذا بر سرِ زمین تمام تر نقصانات، بنیادی ڈھانچے اور نظام کے، انہی کے سر ہیں۔ بڑے پیمانے پر ہنگامی دفاعی ضروریات کی خریداری بھی یہ امریکہ سے کریں گے، تحفے میں تو نہ ملے گا۔ ماسوایہ کہ امریکی ہوائی جہاز کی تباہی شاید وہ خود ادا کر لے! سو سستے ایرانی ڈرون کے عوض ان ممالک کی معاشی چٹنی بنا ڈالی۔ اس پر بغلیں کون بجائے گا۔ اگر ہم اب بھی اتنے کور چشم ہیں تو چپ ہی بھلی۔ سو تسلی رکھیے یہ جنگ جلد بند ہونے کی نہیں۔ آپس کا تھوڑا بہت نقصان یہ سہہ لیں گے۔ اس کے عوض دجالی منصوبے تکمیل پا رہے ہیں۔

رہے ہم تو آنکھیں ملکی حالات سے بند کیے آزاد کشمیر کو بھی اب شدید کشیدگی کی نذر ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ شام ۲۰۱۱ء تا ۲۰۲۴ء، عرب بہار میں جو مصری عوام اور اسلام پسندوں کے پسندے بنائے گئے، حالیہ تاریخ سے پڑھ لیجیے۔ ہم ریت میں سر دبائے نفسا نفسی، آپا دھاپی

میں رہے۔ نوجوانوں کو سنجیدگی، ملک وملت کا درد، دین کا فہم وشعور، اس سے بچا کر رکھنے کو کوئی کسر نہ چھوڑی۔ تعلیمی معیار ہولناک حد تک گر چکا ہے۔ بنگلہ دیش نوجوانوں کی تحریک جو ملک کی تقدیر بدل ڈالنے کو کافی تھی، وہ اگرچہ بھارتی پیسے اور بین الاقوامی اثرورسوخ تک انتخابی متوقع کامیابی تو نہ پا سکی، مگر ایک گہری تبدیلی بہر طور نوجوان تحریک اور جماعت اسلامی وطلباء نے ضرور بنگلہ دیش کو عطا کی۔ ایسی کسی صورت کا ہمارے ہاں دور دور امکان نہیں۔

اب بھارت میں دنیا کے گھاگ، شاطر، بدعنوان حکمرانوں میں سے ایک، مودی اور خونخوار بی جے پی پارٹی کے خلاف یکایک نوجوان تحریک نے لرزہ برپا کر دیا ہے۔ طنزاً اور مزاحاً جو کاکروچ جنتا پارٹی (CJP) آن لائن کی ہوائی چھوڑی تھی، وہ ایک طوفان بن گئی، ٹڈی دل کی طرح کچر کچر کرتا! لگتا ہے بی جے پی چٹ کر جائے گا۔ اس کے بانی ابھی جیت دیکھے، امریکہ سے بھارت آن پہنچے۔ اسم بامسمیٰ ہو گئے تو 'ابھی جیت' کر نہ دکھا دیں۔ ۱۲ سالہ اقتدار میں مودی کو پہلی مرتبہ فکر لاحق ہو گئی ہے۔ اگرچہ دیکھے اسے 'نوجوانوں کا سیاسی فرنٹ' ہی کہہ رہے ہیں، نوجوانوں کا، نوجوانوں کے ذریعے، نوجوانوں کے لیے! 'ہم حکومت سے احتساب کا تقاضا کرتے ہیں جس نے گزشتہ چند سالوں میں تعلیمی نظام تباہ کر دیا۔ مسلسل کئی سالوں سے امتحانی پرچے لیک ہونے (اور پرچے مارک ہونے میں اغلاط سے لاکھوں طلباء کا مستقبل تباہ ہوا) کا احتساب اور وزیر تعلیم کی برطرفی کا تقاضا کرتے ہیں۔ ہم یہ جنگ لڑیں گے۔' سات دن کی مہلت حکومت کو دی ہے۔ 'تحریک تیار ہے کہ یہ ایک دن کی ریلی (لاکھوں نوجوان چند دنوں میں حصہ بن گئے ہیں!) مکمل قومی ایجی ٹیشن میں ڈھل جائے گی۔'

غزہ میں عید پر بھی اسرائیل نے سفاک حملے نہ چھوڑے۔ اجڑے مہاجروں کی عید کی خوشیوں پر بم برسائے۔ خلیجی ممالک اپنے محبوب اسرائیل وامریکہ کی دوستی کا بھگتان اب دے رہے ہیں۔ غزہ پر حقیقی مدد ایران سمیت ۵۹ مسلم ممالک نے قطعاً بہم نہ پہنچائی اشک شوئی کے سوا۔ غزہ سے ابوعبیدہ کا بیان تازہ کر کے جاری کیا گیا ہے: 'ہم اپنی امت کو دوبارہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اختلافات پس پشت ڈالے۔ اپنی سمت درست کر لے۔ جو امت چند روز قبل ایک ہی میدان میں، (۹ ذی الحج) جبلِ عرفات پر جمع ہوئی، وہ اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ اپنے بیٹوں کی نصرت کے لیے بھی یک جا ہو کر بلند مقام حاصل کرے۔' اللہ کا حکم: 'اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے۔' (الاعلام العسکری)

نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

[یہ مضمون ایک معاصر روزنامے میں شائع ہو چکا ہے۔ مستعار مضامین مجلے کی ادارتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)]

☆☆☆☆☆

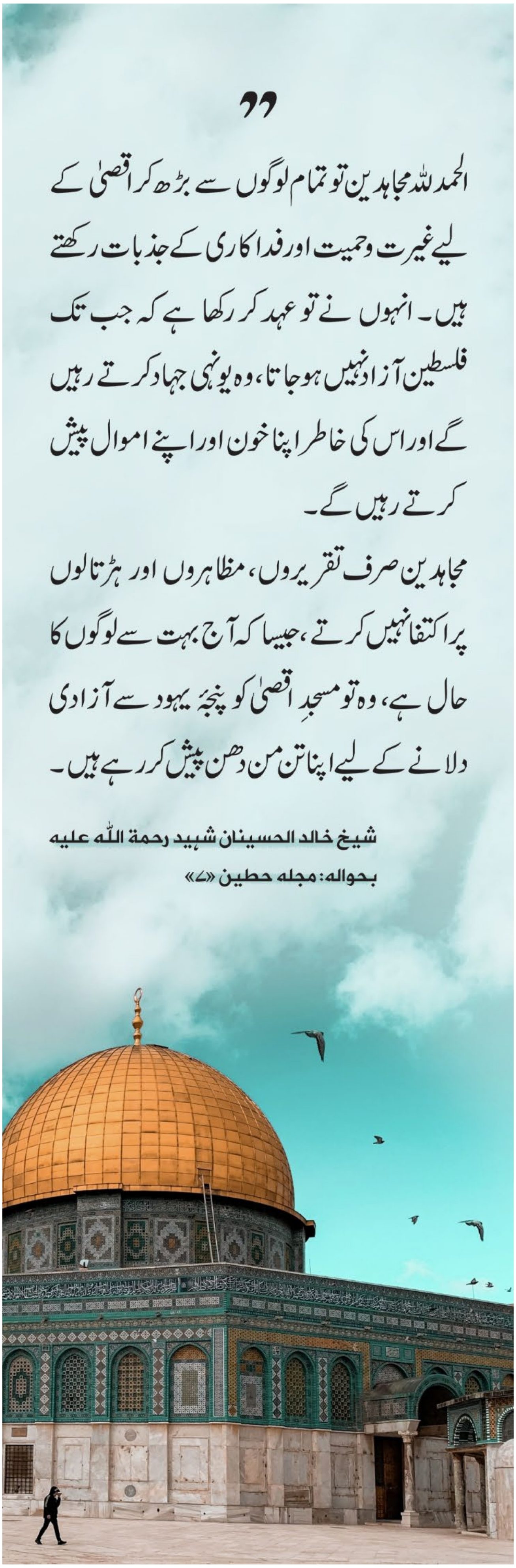

بائیکاٹ انکل اور امریکہ

سلیمان علی

ایمانی صدا، بائیکاٹ انکل

سوشل میڈیا پر ایک وڈیو ترکی ڈسکرپشن کے ساتھ گھومتی نظر آئی:

”تم نہیں خریدو گے تو نہیں مرو گے۔ لیکن اگر تم نے خریدا تو وہ مر جائیں گے۔“

ایک بوڑھے شخص بازار میں کھڑے ہو کر کچھ درد مند دل کے ساتھ صدائیں لگا رہے ہیں۔ گوگل کی مدد سے ترجمہ کیا تو معلوم ہوا کہ ”بائیکاٹ انکل“ کا عنوان لگا ہوا تھا۔ تفصیل سیکھی تو پتا چلا کہ ان کا نام ہے عبد الرزاق دمیر جان، وہ ترکی کے شہر عرفہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی عمر تقریباً ۶۳ سال بتائی گئی۔ طوفان الاقصیٰ کے بعد ۲۰۲۳ء سے وہ تقریباً دو سال سے اکیلے شہر کے بازاروں میں سڑکوں پر یہ صدا لگاتے ہیں۔ یہ ہے بائیکاٹ کی صدا۔ انہوں نے ایک خاص جیکٹ بنوائی ہے جس میں ترکی میں یہی جملہ لکھا ہے ”بائیکاٹ کرو، اگر نہیں خریدو گے تو نہیں مرو گے، اگر خریدو گے تو وہ مر جائیں گے“۔ وہ مرد قلندر ۱۰۰ سال سے سیکولرازم کے ایک گڑھ میں ایمانی عمل کے بروشر تقسیم کرتا ہے، لوگوں سے بات کرتا ہے اور اسرائیل کو فائدہ پہنچانے والی مصنوعات کے خلاف ہر بازار کوچے میں جا کر آواز اٹھاتا ہے۔ غزہ میں قابض اسرائیل کی طرف سے ہونے والی صورت حال کے تناظر میں وہ مستقل ایمانی تقاضے یاد دلاتے ہیں۔ لوگوں اور مقامی میڈیا نے اس بزرگ کو ”بائیکاٹ انکل“ کے نام سے مشہور کر دیا ہے۔ اس وڈیو میں وہ جو کچھ پکار رہے تھے وہ بھی انتہائی ایمانی جملے تھے۔ ”مسلمان مجھ سے پوچھتے ہیں، کیا تم ٹھیک ہو؟ وہ چاہتے ہیں کہ میں یہ دکھاوا کروں کہ میں ٹھیک ہوں۔ لیکن میں ٹھیک نہیں ہوں جب مسلمان بچوں کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ میں ٹھیک نہیں ہوں جب وہاں مسلمان خواتین کی عصمت دری ہو رہی ہے۔ میں ٹھیک نہیں ہوں“۔ عبد الرزاق کے جملے، ان کا عمل، اس وڈیو کو دیکھ کر مجھے شرمندہ کر گیا۔ ترکیہ میں تو قابض اسرائیل و امریکہ کی مصنوعات عام ہیں، ملک بھی سیکولر ہے لیکن سلام ہے عبد الرزاق پر، وہ کام جو ترکیہ میں کوئی اسلامی جماعت بھی نہیں کر پا رہی وہ اکیلا ڈٹا ہوا ہے۔ وہ لوگوں سے خطاب کرتا ہے، بروشرز تقسیم کرتا ہے اور ہاتھ کے اشاروں سے بائیکاٹ کی وضاحت کرتا ہے: بائیکاٹ کرو، یہ مصنوعات مت خریدو!، وہ تو اپنا کام کر رہا ہے۔ آپ بھی کوئی ہمت دکھایئے۔ آپ بھی اہل غزہ کے درد میں شامل ہو جایئے۔

شکریہ جے ڈی وینس!

کراچی میں کچھ دن قبل ایسے ہی امریکی و یہودی مصنوعات کے بائیکاٹ کے حوالے سے ایک تنازع اُبھرا۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ دونوں مذہبی طبقات تھے، حکمت تبلیغ کو درست طریقے سے نہ اپنانے کی وجہ سے معاملہ خراب ہوا۔ تھانے تک بات پہنچی مگر علمائے کرام نے افراد کی باہمی رنجش تو الحمد للہ ختم کرا دی مگر ”پیپسی“ کی پوزیشن نہیں بتائی جا سکی۔ پیپسی، کوک بے شک امریکی کمپنیاں ہیں مگر یہ صرف کمپنی نہیں ہیں، یہ تو ہم کہہ رہے ہیں، اہل حق کا اجماعی فہم ہے کہ یہ تمام استعماری کمپنیاں صرف سرمایہ دارانہ لوٹ مار ہی نہیں بلکہ لبرل اقدار کے فروغ، لبرل عالم گیریت کے ساتھ ساتھ براہ راست اس کے غلبے میں معاون و مددگار ہیں۔ جوزف نائل کی کتاب ”سافٹ پاور“ میں یہ ساری حقیقت لکھی ہوئی ہے کہ یہ کمپنیاں کیسے شیطانی غلبے کے لیے کام کرتی ہیں مگر کتاب پڑھتا کون ہے؟ ستم یہ ہے کہ بائیکاٹ نہ کرنے کے لیے ہر ”ایرے غیرے“ کے بونگے، جھوٹے، بے وزن دلائل قبول کر لیں گے مگر دشمن کی اعلانیہ لکھی گئی کتاب اور منصوبہ عمل کو پڑھنا بھی گوارانہ کریں گے۔ آج بھی پاکستان میں امریکی مصنوعات کے بائیکاٹ کرانے پر مختلف قسم کے شک شبہ اور تذبذب کا شکار افراد موجود ہیں، جنہیں لذتیں بہت پیاری ہیں۔

ایسے میں امریکی نائب صدر نے امریکہ میں اس ہفتے ایک قیمتی پریس کانفرنس کر کے یہ گتھی بھی اچھی طرح سلجھا دی۔ امریکی نائب صدر جے ڈی وینس نے قابض اسرائیل کو خوب تڑیاں لگائیں اور سمجھایا کہ تمہارے اصل ”ابو“ ہم ہی ہیں۔ قابض اسرائیل، امن معاہدے میں مستقل روڑے اٹکا رہا ہے اور منع کرنے کے باوجود لبنان پر حملے جاری رکھے ہوئے ہے۔ نائب صدر نے بہت کچھ کہا مگر یہ جملہ ہمارے موضوع کے لیے اہم ہے۔ اس نے صاف کہا کہ ”قابض اسرائیل کے دفاع کا ۶۶ فیصد (دو تہائی) اسلحہ امریکی ہاتھوں میں تیار ہو رہا ہے“، امریکی خزانے میں ٹیکس کی مد میں جمع ہونے والی رقم سے ہوتا ہے۔ دشمن کی اس واضح گواہی کے بعد اگر کسی کو یہ بتایا جائے کہ پیپسی کی کمپنی نے ٹیکس کی مد میں صرف گزشتہ سال ۱ا ارب ڈالر کے قریب امریکی خزانے میں جمع کرائے ہیں، کوک، کے ایف سی، مکڈونلڈ وغیرہ کو چھوڑ دیں، صرف امریکی نائب صدر کے مطابق امریکی خزانے میں آنے والے ایک ڈالر سے بھی کیا کام ہو رہا ہے اس کی تصدیق تو ہو رہی ہے۔ اس کے بعد کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ سوائے شکریہ جے ڈی وینس کہنے کے۔

پیپسی، کوک، کے ایف سی، میک ڈونلڈ سمیت دیگر مصنوعات اپنا برانڈ وجود بھی رکھتی ہیں، ان کی موجودگی امریکی موجودگی کے برابر کہلاتی ہے۔ امریکی موجودگی قابض اسرائیل کے سرپرست کی موجودگی کے برابر ہے، جس کے وجود کے ہم سب ایمانی طور پر انکاری ہیں۔ اس لیے ان تمام برانڈز کی اشیاء کا حتی الامکان بائیکاٹ ایمانی تقاضا ہے۔ ان اشیا کو خرید کر حاصل شدہ منافع قابض اسرائیل کے دفاع، اس کے اسلحے اور قبلہ اول کے مسلمانوں پر برس رہا ہے، یوں مسلمانوں کے قتل میں شمولیت ہوتی ہے۔

البانیہ بھی نکل آیا

شاندار اسلامی تاریخ رکھنے والے یورپی ملک البانیہ میں ”پرندے وقدرتی ماحول“ بچانے کی تحریک حکومت بدلنے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ سوشل میڈیا پر البانیہ کے دارالحکومت ترانہ میں احتجاجی مظاہروں، ریلیوں کی جو ڈیوز آ رہی ہیں وہ غیر معمولی توجہ لے چکی ہیں۔ معصوم پرندوں کی نسلیں بچانے کے لیے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے ایک سرمایہ دارانہ پروجیکٹ کے خلاف وہاں ہزاروں لوگ نکل آئے ہیں۔ اس احتجاج کو برطانوی اور عالمی میڈیا ”فلیمنگو ریوولیوشن“ (Flamingo Revolution) کا نام دے رہا ہے۔ مظاہرے گزشتہ ایک ماہ سے جاری ہیں جو اس ہفتے ایک غیر معمولی بڑی ریلی کی صورت نکل آئے، اس کے ساتھ ہی ٹرمپ کے داماد کے پروجیکٹ کی تنصیبات پر حملوں کی صورت بھی ردعمل وڈیوز میں سامنے آنا شروع ہو گیا ہے۔

مظاہرین ایک ماہ سے روزانہ شام کو ٹرمپ کی بیٹی ایوانکا اور داماد جیرڈ کشنر سے منسلک ہوٹل کمپلیکس کی تعمیر کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مظاہرین نے سرخ غبارے چھوڑے اور نعرے لگائے ”البانیہ فروخت کے لیے نہیں ہے“۔ ٹرمپ کے داماد جیرڈ کشنر کی کمپنی لگژری ریزورٹ البانیہ کے جنوبی ساحلی علاقے و تاریخی جزیرے سازان پر بنانا چاہتی ہے۔ یہ سارا علاقہ قانونی طور پر محفوظ قدرتی پارک (Nature Reserve) ہے۔ یہ نایاب پرندوں، خاص طور پر پینڈ فلیمنگوز (Pink Flamingos) اور سمندری کچھوؤں کا مسکن ہے۔ مظاہرین کا کہنا ہے کہ یہاں دس ہزار کمروں کا میگا ریزورٹ بننے سے یہ پورا قدرتی حسن اور جنگلی حیات ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے۔

ایوانکا ٹرمپ نے ایک انٹرویو میں سازان جزیرے کو ایک ”پرائیویٹ آئی لینڈ“ کہا تھا جسے انہوں نے ”دریافت“ کیا ہے۔ اس بات پر البانوی عوام شدید غصے میں ہیں کیوں کہ وہ جزیرہ البانیہ کی قومی اور دفاعی ملکیت ہے۔ عوام کا الزام ہے کہ حکومت چند ارب پتی غیر ملکیوں کی خاطر ملک کے اثاثے کوڑیوں کے دام بیچ رہی ہے۔ اس لیے البانیہ کے وزیر اعظم ایڈی راما پر بھی عوام کا غصہ شامل ہو گیا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ احتجاج جاری رکھیں گے جب تک وزیر اعظم استعفیٰ نہیں دیتے۔ البانیہ کی اپوزیشن اور مظاہرین کا کہنا ہے کہ وزیرِ اعظم ایڈی راما کی حکومت نے ٹرمپ فیملی کو نوازنے اور وائٹ ہاؤس سے تعلقات کا فائدہ اٹھانے کے لیے ماحولیاتی تحفظ کے قوانین میں راتوں رات تبدیلیاں کیں تاکہ کشنر کو تعمیرات کی اجازت مل سکے۔ مزید یہ کہ البانیہ کے اینٹی کرپشن پراسیکیوٹرز نے اس زمین کی خریداری کے لیے استعمال ہونے والے فنڈز اور جعلی پراپرٹی ٹائٹلز پر باقاعدہ تحقیقات شروع کر دی ہیں اور حال ہی میں اس سے منسلک فرم کے بینک اکاؤنٹس بھی منجمد کیے گئے ہیں۔ البانیہ یورپ کے غریب ترین ممالک میں سے ایک ہے۔ شہریوں کا کہنا ہے کہ اس سیاسی اشرافیہ کے گٹھ جوڑ سے جو اسکائی اسکریپرز اور ہوٹل بن رہے ہیں، وہ عام البانوی ووٹر کی پہنچ سے باہر ہیں۔

البانیہ میں آج بھی ۴۵ فیصد مسلم آبادی موجود ہے، مگر تاریخ کا ستم ہے کہ ۱۹۶۷ء میں البانیہ نے خود کو باقاعدہ طور پر دنیا کی پہلی سرکاری ملحد (Atheist) ریاست قرار دے دیا۔ ملک کی تمام مساجد اور خانقاہیں یا تو شہید کر دی گئیں یا انہیں اسپورٹس ہالز، گوداموں اور تھیٹروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ قرآن رکھنے، نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور بچوں کے اسلامی نام رکھنے پر سخت سزائیں اور جیلیں ہوتی تھیں۔ اس ۵۰ سالہ دور نے البانوی مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے دور کر دیا۔ ۱۹۹۱ء میں کیمونزم کے خاتمے اور جمہوریت کی آمد کے بعد البانیہ میں دوبارہ مذہبی آزادی قدرے بحال ہوئی۔ آج پھر سرمایہ دارانہ نظام اپنے سرمایہ کے بل پر قدرت کے مظاہر کا خاتمہ کر رہا ہے تو ردعمل کا سامنا کر رہا ہے۔

سیکولر برطانیہ

برطانیہ میں ۲۰۱۰ء سے سرمایہ دارانہ سیاسی و معاشی بحران کا سلسلہ جاری ہے۔ ۲۰۲۴ء کے الیکشن میں تاریخی کامیابی لے کر بننے والا برطانوی وزیر اعظم کیئر اسٹارمر بھی ۲ سال بعد اس ہفتے علانیہ استعفیٰ دے کر بھاگ گیا۔ اعداد و شمار کے مطابق مانچسٹر میں میئر رہنے والا برن ہیم، لیبر پارٹی کی قیادت سنبھال کر برطانیہ کا اگلا وزیر اعظم بنے گا۔ دس سال میں اب یہ ساتواں وزیر اعظم ہو گا۔ ایک شہر کی میئر شپ کا تجربہ رکھنے والا جب ۳ کھرب کے سودی قرض والے ملک کو سنبھالے گا تو دنیا بھی اس کے تجربے کو دیکھے گی۔ سوشل میڈیا پر اینڈی برن ہیم کے حلف بطور رکن پارلیمنٹ کی وڈیو وائرل تھی۔

سیکولرازم کی آسان تشریح سمجھنے کے لیے اگر آپ یہ حلف غور سے سنیں یا پڑھیں تو آپ کو واضح طور پر سمجھ آ جائے گی کہ کیسے خدا کا نام لے کر خدا کو ہی مکمل مائنس کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> "I swear by Almighty God that I will be faithful and bear true allegiance to His Majesty King Charles, his heirs and successors, according to law. So help me God."

> ”میں خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بادشاہ چارلس کا وفادار رہوں گا، قانون کے مطابق ان کے وارثوں اور جانشینوں کی سچی بیعت کروں گا۔ تو خدا میری مدد کریں۔“

یہ سیکولرازم سمجھنے کی ایک اچھی اور جامع شکل ہے۔

برطانیہ کا مجموعی عوامی قرضہ ۳ ٹریلین پاؤنڈز کے قریب پہنچ چکا ہے جو کہ ملک کی کُل جی ڈی پی کا تقریباً ۹۴ فیصد بنتا ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے (IMF) اور تجزیہ کاروں کے مطابق برطانیہ اس وقت قرضوں کے ایک ایسے جال میں پھنس رہا ہے جہاں حکومت کو صرف قرض کا سود ادا کرنے کے لیے سالانہ تقریباً ایک کھرب دس ارب پاؤنڈز خرچ کرنے پڑ رہے ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۲۸ پر)

غزہ کوئی استثناء نہیں!

اسرائیل نے نسل کشی کی منصوبہ بندی عشروں قبل کر لی تھی

جوناتھن کک

حقیقت رفتہ رفتہ آشکار ہو رہی ہے: غزہ میں اسرائیل کی جاری نسل کشی کوئی اچانک پیش آنے والا واقعہ نہیں، بلکہ اس کی منصوبہ بندی کئی دہائیاں پہلے کر لی گئی تھی۔

غزہ میں تعینات رہنے والے چار اسرائیلی فوجیوں کی شہادتیں سنیے:

پہلا فوجی:

”انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ تم کسی کو بھی قتل کر سکتے تھے، کوئی قانون نہیں تھا۔ کوئی تم سے ایک لفظ بھی نہیں پوچھتا تھا۔ لیکن یہ احساس اچھا نہیں ہوتا۔ دراصل اس عمل میں سب سے پہلے تمہاری اپنی انسانیت مر جاتی ہے۔“

دوسرا فوجی:

”شروع میں، میں ان عربوں کو قتل کرنے پر آمادہ نہیں تھا جو مزاحمت نہیں کر رہے تھے، یعنی عام شہری تھے۔ پھر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں انہیں مارنا ہی ہو گا۔ آہستہ آہستہ ہم نے انہیں انسان سمجھنا ہی چھوڑ دیا۔“

تیسرا فوجی:

”ہم لوگوں کو پکڑتے، قطار میں کھڑا کرتے اور پھر انہیں ختم کر دیتے۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ سب کھلا قتل معلوم ہوتا ہے۔“

چوتھا فوجی:

”ہم غزہ کے پناہ گزین کیمپوں میں گھومتے پھرتے اور تطہیری کارروائیاں کرتے تھے...... وہاں موجود ہر فوجی نے اپنا ایک ’حراستی کیمپ‘ قائم کر رکھا تھا، اور جو شخص ذرا سی بھی مزاحمت یا خلل پیدا کرتا، اسے مارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جاتی تھی۔“

یہ گواہیاں نئی نہیں ہیں۔ یہ فوجی موجودہ نسل کشی کے دوران غزہ میں تعینات نہیں تھے۔ یہ تقریباً ساٹھ برس پرانی شہادتیں ہیں، جنہیں گزشتہ ہفتے اسرائیلی اخبار ہآرٹز نے ”ہمیں قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا“ کے عنوان سے شائع کیا۔

۱۹۶۷ء کی جنگ، جسے عموماً چھ روزہ جنگ کہا جاتا ہے، کے فوراً بعد لیے گئے انٹرویوز میں اسرائیلی فوجیوں نے نہ صرف یہ اعتراف کیا کہ وہ خود اور ان کے ساتھی معمول کے مطابق جنگی جرائم کے مرتکب ہوتے رہے، بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ وہ یہ سب اپنے اعلیٰ فوجی افسروں کے احکامات پر کرتے تھے۔

ان بیانات کو "The Seventh Day: Soldiers Talk about the Six Day War" کے عنوان سے ایک کتاب میں جمع کیا گیا، جسے ابراہام شاپیرا نے مرتب کیا تھا۔ تاہم بہت سی شہادتیں اس لیے شامل نہیں کی گئیں کہ وہ اپنی ہولناکی کے باعث ناقابلِ اشاعت سمجھی گئیں۔

ان انکشافات کو محض تاریخ کا ایک باب سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ شہادتیں اس حقیقت کی واضح یاد دہانی ہیں کہ گزشتہ تقریباً تین برس سے غزہ میں اسرائیل جو کچھ کر رہا ہے، گھروں، ہسپتالوں، اسکولوں، یونیورسٹیوں، بیکریوں اور سرکاری عمارتوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دینا، دسیوں ہزار بلکہ غالب امکان کے مطابق لاکھوں فلسطینی شہریوں کو قتل کرنا، امداد روک کر پوری آبادی کو قحط کے حوالے کر دینا، یہ سب کسی وقتی ردِ عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اسرائیلی فوجی طرزِ عمل کا کئی دہائیوں پر محیط تسلسل ہے۔

کچھ بھی ۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء سے شروع نہیں ہوا، جب حماس نے ایک ہی دن کے لیے غزہ کے اس ”حراستی کیمپ“ سے نکلنے میں کامیابی حاصل کی، جس کا ذکر آج سے انسٹھ برس پہلے چوتھے فوجی نے کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل نے اس دن کو صرف ایک بہانے کے طور پر استعمال کیا تاکہ ایک پرانی داستان کو نئے سرے سے زندہ کر سکے، وہ داستان جس میں فلسطینیوں کا قتلِ عام اور ان کی جبری بے دخلی کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ اس مرتبہ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کارروائی کا پیمانہ کہیں زیادہ وسیع اور اس کا دورانیہ کہیں زیادہ طویل ہے۔

واشنگٹن اور دیگر مغربی دارالحکومتوں نے اسرائیل کو وہ وقت، وہ مہلت اور وہ سفارتی تحفظ فراہم کیا جس کی بدولت وہ غزہ میں وہ کام مکمل کرنے کے قریب پہنچ گیا جسے ماضی میں وہ صرف جزوی طور پر انجام دے سکا تھا۔ امریکہ کی فراہم کردہ جدید ہتھیاروں کی طاقت نے اسرائیل کو وہ صلاحیت دے دی جس کا وہ پہلے صرف خواب دیکھ سکتا تھا: غزہ کو نقشۂ عالم سے مٹا دینا۔

بھوک کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی پالیسی

۱۹۶۷ء کے ان فوجیوں نے، جنہوں نے برسوں بعد ضمیر کی آواز پر حقائق بیان کیے، اعتراف کیا کہ ان کا کام ”دشمن سے لڑنا“ نہیں تھا، یا موجودہ اسرائیلی قیادت کی اصطلاح میں ”دہشت گردوں کا خاتمہ“ کرنا نہیں تھا۔ ان کا اصل مشن جنگ کی آڑ میں فلسطینی شہریوں کو قتل کرنا اور ان پر دہشت طاری کرنا تھا۔

بہت کم فوجیوں نے اس بات کو چھپانے کی کوشش کی کہ وہ یہ مظالم کیوں کر رہے تھے۔ ان کے سپرد یہ ذمہ داری تھی کہ خوف وہراس کی ایسی فضا قائم کریں جو اسرائیل کی اس حکمتِ عملی کا لازمی حصہ تھی، جس کا مقصد فلسطینی سرزمین کے باقی ماندہ حصوں سے زیادہ سے زیادہ فلسطینیوں کو بے دخل کرنا تھا۔ یہ وہ علاقے تھے جنہیں اسرائیلی فوج نے ۱۹۶۷ء میں اپنے قبضے میں لیا اور بعد ازاں غیر قانونی طور پر ان پر تسلط برقرار رکھا۔

اس سب کو اسرائیلی قیادت ایک نئے موقع کے طور پر دیکھ رہی تھی تاکہ صہیونی ملیشیاؤں کی جانب سے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں شروع کی گئی نسلی تطہیر کی مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔ یہ وہ مہم تھی جو برطانوی مینڈیٹ کے خاتمے اور فلسطین سے برطانوی انخلا کے دوران پوری شدت کے ساتھ شروع کی گئی تھی۔

اس مہم کے اختتام تک تقریباً ۸۰ فیصد فلسطینیوں کو نومولود یہودی ریاست کی حدود کے اندر واقع اپنے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

ان میں سے بہت سے لوگ لبنان اور شام جیسے ہمسایہ ممالک کے پناہ گزین کیمپوں میں جا بسے، جبکہ کچھ فلسطینی تاریخی فلسطین کے ان حصوں میں پناہ لینے میں کامیاب ہوئے جو باقی رہ گئے تھے، یعنی مغربی کنارہ، مشرقی یروشلم اور غزہ۔ یہ ان کے وطن کا وہ ۲۲ فیصد حصہ تھا جسے ۱۹۴۸ء میں اردن اور مصر نے اسرائیلی پیش قدمی سے بچایا تھا۔

۱۹۶۷ء کی جنگ کو اسرائیلی قیادت نے گویا ایک دوسرا سنہری موقع سمجھا۔ ایک ایسا موقع جس کے ذریعے وہ پورے تاریخی فلسطین پر فوجی قبضہ کر کے، یہودی آبادکار بستیوں کے قیام کے ذریعے اسے نوآبادیاتی تسلط میں لے آئے، اور ساتھ ہی نسلی تطہیر کے منصوبے کو آگے بڑھاتے ہوئے فلسطین کو اس کے اصل باشندوں سے خالی کر دے۔

فلسطینی علاقوں پر قبضے کے چند ہی ہفتے بعد اُس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم لیوی اشکول نے کابینہ کے سامنے واضح کیا کہ جبری بے دخلی کا آغاز کہاں سے ہونا چاہیے۔

اس نے کہا:

”ہماری دلچسپی سب سے پہلے غزہ کو خالی کرانے میں ہے۔“

اشکول بخوبی جانتا تھا کہ عالمی دباؤ کے پیشِ نظر غزہ کی نسلی تطہیر کھلے عام نہیں بلکہ خاموشی اور تدریج کے ساتھ کی جانی چاہیے تاکہ بین الاقوامی توجہ کم سے کم حاصل ہو۔

۲۰۰۷ء میں شروع ہونے والے غزہ کے سولہ سالہ محاصرے کی پیش بندی کرتے ہوئے اس نے تجویز دی کہ اسرائیل غزہ پر ایسی گھٹن اور قید کی کیفیت مسلط کرے کہ فلسطینی خود ہی وہاں سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے الفاظ تھے کہ فلسطینیوں کو غزہ چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، ”بالکل اسی گھٹن اور قید کے باعث جو ہم ان پر مسلط کریں گے“۔ اس نے مزید کہا کہ اگر آبادی کو پانی جیسی بنیادی ضرورتوں سے محروم کر دیا جائے تو نسلی تطہیر کا عمل کہیں زیادہ تیزی سے مکمل ہو سکتا ہے۔

اس کا کہنا تھا:

”شاید اگر ہم انہیں کافی پانی نہ دیں تو ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں بچے گا، کیونکہ ان کے باغات سوکھ جائیں گے اور مرجھا جائیں گے۔“

اسی سوچ کے تحت تقریباً چالیس برس بعد اسرائیل نے باقاعدہ حساب لگایا کہ غزہ میں اتنی ہی خوراک داخل ہونے دی جائے کہ لوگ مسلسل غذائی قلت کا شکار رہیں، مگر فوراً ہلاک نہ ہوں۔

۲۰۰۶ء میں حکومت کے سینئر مشیر دوو وائسگلاس نے اسی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

”منصوبہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کو غذا کی قلت پر رکھا جائے، مگر انہیں بھوک سے مرنے نہ دیا جائے۔“

سترہ برس تک غزہ کو اسی ”غذائی پرہیز“ پر رکھنے کے بعد، جب حماس مختصر وقت کے لیے محصور علاقے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئی، تو اسرائیلی وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو اور اس کے جرنیلوں نے اسے اپنے منصوبے کو آخری مرحلے میں داخل کرنے کا موقع سمجھا۔

انہوں نے صرف ان ”باغات“ کو ہی تباہ نہیں کیا بلکہ اس ”غذائی پرہیز“ کو مکمل بھوک کے محاصرے میں تبدیل کر دیا، ایسا محاصرہ جو انسانیت کے خلاف جرم شمار ہوتا ہے، اور جس کی بنیاد پر نیتن یاہو اور اس کے سابق وزیر دفاع یوآف گیلنٹ کو بین الاقوامی فوجداری عدالت مطلوب قرار دے چکی ہے۔

بے گناہوں کو نشانہ بنانا

۱۹۶۷ء کے جرائم فلسطینی مورخین نے بہت پہلے قلم بند کر دیے تھے، لیکن حسبِ معمول ان کی کسی نے پروا نہیں کی۔ اسرائیلی مورخین کو اس داستان کو سمجھنے میں کہیں زیادہ وقت لگا، کیونکہ انہیں اسرائیلی فوجی آرکائیوز کے کچھ حصوں تک رسائی برسوں بعد حاصل ہوئی۔

اب ہآرٹز نے اکیووت انسٹی ٹیوٹ (Akevot Institute) کی تحقیق کی بنیاد پر ایک نئی رپورٹ شائع کی ہے، جس میں ۱۹۶۷ء سے شروع ہونے والی فلسطینیوں کی وسیع پیمانے پر جبری بے دخلی کی بے رحمانہ تفصیلات سامنے آئی ہیں۔

اخبار کے مطابق:

”تاریخی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل نے مغربی کنارے، غزہ اور شام کے گولان کی پہاڑیوں سے تقریباً تین لاکھ عرب باشندوں کو بے دخل کیا یا وہاں سے بھگا دیا۔ اور ۱۹۴۸ء کی طرح اس مرتبہ بھی اس

بے دخلی میں شہریوں کا قتل، عرب آبادیوں میں خوف و دہشت پھیلانا، لوٹ مار اور آخر کار ان کی بستیوں کی تباہی شامل تھی۔“

۱۹۶۷ء میں بڑی تعداد میں فلسطینیوں کو بے دخل کرنے کے بعد اگلا مرحلہ، جیسا کہ ۱۹۴۸ء میں بھی ہوا تھا، انہیں واپس آنے سے روکنا تھا۔

اسرائیلی صحافی اور پارلیمان کے رکن اوری آونیری نے اُن فوجیوں کے بیانات قلم بند کیے جو اردن اور مصر کی سرحدوں پر تعینات تھے، جہاں فلسطینیوں کو دھکیل دیا گیا تھا۔ ان فوجیوں کا کام یہ تھا کہ جو بھی فلسطینی خاندان واپس اپنے گھروں کی طرف لوٹنے کی کوشش کرے، اسے موقع پر ہی قتل کر دیا جائے۔

ان ہی میں سے ایک فوجی کی شہادت، جسے ہآرٹز نے نقل کیا اور آونیری نے اپنی خود نوشت میں درج کیا، یوں ہے:

”ہم نے ان گزر گاہوں کو بند کر رکھا تھا اور ہمیں واضح احکامات تھے کہ کسی پیشگی انتباہ کے بغیر دیکھتے ہی گولی مار دو۔ چنانچہ ہر رات مردوں، عورتوں اور بچوں پر فائرنگ کی جاتی تھی، حتیٰ کہ چاندنی راتوں میں بھی، جب انہیں صاف پہچانا جا سکتا تھا، یعنی مرد، عورت اور بچے الگ الگ نظر آ رہے ہوتے تھے۔

صبح ہم علاقے کا جائزہ لینے نکلتے، اور جو لوگ ابھی تک زندہ ہوتے، خواہ وہ زخمی ہوں یا کہیں چھپے ہوئے، موقع پر موجود افسر کے صریح حکم کے مطابق انہیں بھی قتل کر دیتے۔ قتلِ عام مکمل ہونے کے بعد ہم لاشوں پر مٹی ڈال دیتے، یہاں تک کہ بعد میں ایک ٹریکٹر آ کر انہیں اٹھا لے جاتا۔“

آج بھی اسرائیلی فوج کے اندر سے سامنے آنے والے ضمیر کے قیدی یہی تنبیہ کر رہے ہیں کہ فوجی نظریہ اور عملی حکمتِ عملی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔

گزشتہ تقریباً تین برس کے دوران متعدد تحقیقات سے یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ اسرائیل نے اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے بارہا اپنے ہی ہاتھوں قتل کیے گئے شہریوں کی لاشوں کو خفیہ طور پر بلڈوزروں کے ذریعے اجتماعی قبروں میں دفن کیا، جو بین الاقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی ہے۔

ایسا اس نے ایک سال قبل اس وقت بھی کیا جب امداد حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے فلسطینیوں کا قتلِ عام کیا گیا، اور پھر مارچ ۲۰۲۵ء میں، جب ایمبولینسوں پر گھات لگا کر حملہ کیا گیا اور پندرہ فلسطینی امدادی کارکنوں کو موقع پر ہی قتل کر دیا گیا۔

۱۹۶۷ء میں ”دیکھتے ہی گولی مار دو“ کی پالیسی سے مضطرب ایک فوجی نے اپنے کمانڈر کے ساتھ ہونے والی گفتگو یاد کرتے ہوئے کہا:

”میں نے افسر سے پوچھا: اگر مجھے بچوں کے رونے کی آواز سنائی دے تو کیا انہیں بھی گولی مار دوں؟ اس نے جواب دیا: ’لڑکیوں جیسی باتیں مت کرو‘۔“

اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد سے اسرائیل غزہ میں ایک سال سے کم عمر ایک ہزار سے زیادہ شیر خوار بچوں کو قتل کر چکا ہے۔ ان میں سے سب فضائی حملوں کا شکار نہیں ہوئے۔

۲۰۲۳ء کے اواخر میں اسرائیلی فوج نے غزہ کے النصر ہسپتال پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں موجود پانچ قبل از وقت پیدا ہونے والے نومولود بچوں کو انکیوبیٹرز میں تڑپ تڑپ کر مرنے دیا، حتیٰ کہ ان کی لاشیں وہیں گلنے سڑنے لگیں۔

اسرائیلی فوجی کمانڈر یہ بھی جانتے تھے کہ امداد کی ناکہ بندی کا پہلا شکار سب سے کمزور لوگ ہوں گے۔

پناہ گاہوں، بچوں کے دودھ اور خوراک سے محروم کیے جانے کے باعث نومولود بچے یا تو سردی سے مر گئے یا بھوک سے۔ ان کی مائیں خود غذائی قلت کا شکار تھیں اور اپنے بچوں کے لیے دودھ تک پیدا کرنے کے قابل نہیں رہیں۔

جیسا کہ دوسرے فوجی نے اعتراف کیا تھا، اسرائیلی فوجی نظریہ سپاہیوں کو اس نہج پر تربیت دیتا ہے کہ وہ فلسطینیوں، حتیٰ کہ شیر خوار بچوں، کو بھی انسان سمجھنا چھوڑ دیں۔ ان کی جان کی کوئی قدر باقی نہیں رہتی۔

ماضی کی بازگشت

گزشتہ ہفتے بھی اسرائیلی فوجیوں نے مغربی کنارے میں ایک اور فلسطینی شیر خوار بچے کو قتل کر دیا۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب انہوں نے فلسطینی شہر الخلیل میں، جو اسرائیلی قبضے کے تحت سب سے زیادہ سخت اور ظالمانہ نگرانی والے علاقوں میں شمار ہوتا ہے، جامعہ بیت اللحم کے استاد فہد ابو ہیکل کی گاڑی پر گھات لگا کر حملہ کیا۔

گاڑی ابھی رک ہی رہی تھی کہ ایک اسرائیلی فوجی نے چند میٹر کے فاصلے سے اس پر فائر کھول دیا۔ اتنے کم فاصلے سے وہ گاڑی میں بیٹھے افراد کو صاف دیکھ سکتا تھا۔

گولی ابو ہیکل کے سات ماہ کے شیر خوار بیٹے سام کو لگی، جو اپنی والدہ کی گود میں تھا۔ بچہ جاں بحق ہو گیا جبکہ اس کی والدہ زخمی ہو گئیں۔

گاڑی میں موجود ابو ہیکل کا گیارہ سالہ بیٹا اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ننھے بھائی کو خون میں لت پت دم توڑتے دیکھتا رہا۔

اسرائیلی فوج کئی دہائیوں سے فلسطینی بچوں کو قتل کرتی آ رہی ہے۔ اس کے باوجود مغربی ذرائع ابلاغ اور سیاست دانوں نے کبھی اس درجے کے غم و غصے کا اظہار نہیں کیا، جیسا انہوں نے ۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد اسرائیل کے اس بے بنیاد دعوے پر کیا تھا کہ حماس نے چالیس اسرائیلی بچوں کو قتل کر دیا ہے۔

پہلے سے تیار شدہ منصوبہ

۱۹۶۷ء میں غزہ اور مغربی کنارے سے فلسطینیوں کی بے دخلی کی مہم نہ تو اچانک ترتیب دی گئی تھی اور نہ ہی وقتی جذبات کا نتیجہ تھی۔ ہارٹز کی نئی تحقیق کے مطابق اس پالیسی کی منصوبہ بندی کئی برس پہلے سے نہایت سوچ بچار کے ساتھ کی جا چکی تھی۔

۱۹۴۸ء کے بعد سے اسرائیل صرف ایسے مناسب موقع کا منتظر تھا جب وہ فلسطینیوں کی مزید بے دخلی کر سکے اور فلسطینی سرزمین کے باقی ماندہ حصوں پر بھی قبضہ جما کر اپنے آبادکار نوآبادیاتی منصوبے کو مکمل کر دے۔

مصر، شام اور اردن کے خلاف ۱۹۶۷ء کی جنگ نے اسے یہی بہانہ فراہم کر دیا۔

اس جنگ میں بٹالین کے ایک سینئر کمانڈر اشائی عمرامی نے بعد میں اعتراف کیا:

> "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ دراصل بڑے پیمانے پر آبادی کی جبری منتقلی کی کوشش تھی۔"

ہارٹز لکھتا ہے:

> "اس پوری داستان میں فلسطینی محض تماشائی تھے۔ وزیر دفاع موشے دایان نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ مغربی کنارے کے فلسطینی اس جنگ میں شریک ہی نہیں تھے، یہ ان کی جنگ نہیں تھی۔ اس کے باوجود قیمت انہی کو ادا کرنا پڑی۔"

۱۹۴۸ء کی طرح اسرائیل نے ایک بار پھر فلسطینی بستیوں کی منظم تباہی شروع کر دی تاکہ واپس آنے والوں کے لیے کوئی گھر باقی نہ رہے۔

لیکن ہارٹز کے مطابق اسرائیل اپنی غیر معمولی فوجی کامیابی کا خود بھی ایک طرح سے شکار بن گیا۔

اخبار لکھتا ہے:

> "تنازعے کی تاریخ میں یہ ان چند مواقع میں سے ایک تھا جب شدید بین الاقوامی دباؤ کے باعث اسرائیل کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔"

اس حقیقت کی طرف شاید اشارہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ۱۹۶۷ء کے برعکس گزشتہ تقریباً تین برس کے دوران ایسا کوئی مؤثر بین الاقوامی دباؤ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بلکہ مغربی ممالک کی نئی سیاسی قیادت، جیسے برطانیہ کا وزیر اعظم سر کیئر اسٹارمر، جو کبھی انسانی حقوق کے وکیل کے طور پر معروف تھا، نے غزہ کے فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل کی کھلی نسل کش پالیسی کو بھی "حقِ دفاع" قرار دے کر اس کا جواز فراہم کیا۔

غزہ سے نظریں چرانا

اس بے خوفی اور جواب دہی سے مکمل آزادی نے اسرائیل کو یہ حوصلہ بھی دیا کہ وہ اپنی تباہ کاریوں کا دائرہ مزید وسیع کرے۔ ایران میں اسے محدود کامیابی ملی، لیکن جنوبی لبنان میں اس نے کہیں زیادہ مؤثر انداز میں اپنی فوجی کارروائیاں آگے بڑھائیں۔

ادھر مغربی سیاست دان اور ذرائع ابلاغ غزہ کو گویا فراموش کرتے جا رہے ہیں، جبکہ اسرائیل وہاں مسلسل دباؤ، تباہی اور انسانی مصائب میں اضافہ کر رہا ہے۔

اس مقصد کے لیے اس نے ایک نام نہاد "زرد لکیر" (Yellow Line) قائم کر دی ہے، جو غزہ کے تباہ شدہ علاقے میں اسرائیلی فوج کے زیر کنٹرول خطے کی حد بندی کرتی ہے۔ فلسطینیوں کے لیے اس علاقے میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ یہ علاقہ غزہ کے تقریباً نصف رقبے سے بڑھ کر ستر فیصد تک پھیل چکا ہے۔

یوں غزہ کے باشندوں کو اپنے ہی وطن کے کھنڈرات میں بتدریج سمٹنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، جبکہ اسرائیل اس کوشش میں ہے کہ کوئی تیسرا ملک ــــ مثلاً مصر یا شاید صومالی لینڈ ــــ انہیں اپنے ہاں قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

تاریخی تناظر کی بیخ کنی

امریکی ماہر فلکیات کارل سیگن نے ایک مرتبہ کہا تھا:

> "حال کو سمجھنے کے لیے ماضی کو جاننا ضروری ہے۔"

اور یہی وجہ ہے کہ مغربی سیاست دانوں اور ذرائع ابلاغ نے پوری احتیاط سے اس ماضی کو نظروں سے اوجھل رکھا ہے۔

انہوں نے شعوری طور پر وہ تاریخی پس منظر حذف کر دیا ہے، جیسے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کی اسرائیلی نسلی تطہیر کی مہمات، جو غزہ، مغربی کنارے اور جنوبی لبنان میں اسرائیل کے موجودہ طرزِ عمل کی وضاحت کرتی ہیں۔

جب عوام کو تاریخ سے محروم کر دیا جائے تو انہیں یہ یقین دلانا آسان ہو جاتا ہے کہ اسرائیلی مظالم محض حماس کے ۲۰۲۳ء کے ایک روزہ حملے کا ردِ عمل ہیں، بلکہ ایک ایسا ردِ عمل جو بقول مغربی حکومتوں کے ''متناسب'' بھی ہے۔

یوں ایک بدیہی حقیقت نظروں سے اوجھل کر دی گئی:

کم از کم گزشتہ آٹھ دہائیوں سے اسرائیل ہر ایسے موقع سے فائدہ اٹھاتا آیا ہے جو فلسطینیوں کو ان کی سرزمین سے بے دخل کرنے کے لیے موزوں ثابت ہو سکتا تھا۔

اس تناظر میں اکتوبر ۲۰۲۳ء کا حماس کا حملہ کوئی تاریخی موڑ یا غیر معمولی انقطاع نہیں رہ جاتا، جیسا کہ مغربی دنیا میں اسے پیش کیا جاتا ہے۔ بلکہ ۱۹۶۷ء ہی میں، یعنی اس واقعے سے چھپن برس پہلے، لیوی اشکول اپنی کابینہ کو بتا چکا تھا کہ کوئی غیر متوقع واقعہ اسرائیل کے خفیہ نسلی تطہیر کے منصوبے کو تیز کر سکتا ہے۔

اس کے بقول:

> ''شاید آئندہ کوئی اور جنگ چھڑ جائے، اور پھر یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے۔ لیکن یہ تو ایک طرح کی غیر متوقع نعمت ہو گی، ایک ایسا حل جس کی ابھی توقع نہیں۔''

ہارٹز کی تازہ تحقیق نے جب اس گم شدہ تاریخی تناظر کو دوبارہ سامنے رکھا تو پوری کہانی کا مفہوم بدل گیا۔

۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء کے واقعات اب محض اندھی وحشت معلوم نہیں ہوتے، بلکہ کئی دہائیوں پر محیط اسرائیلی پالیسیوں کے مقابلے میں ایک ایسے مایوس کن اور آخری داؤ کی صورت دکھائی دیتے ہیں جن کا مقصد فلسطینیوں کی زندگی کو غربت، محاصرے، بھوک، قتل اور مسلسل جبر کے ذریعے اس قدر ناقابلِ برداشت بنا دینا تھا کہ وہ یا تو اپنا وطن چھوڑ دیں یا وہیں مر جائیں۔

اور جب یہی تاریخی پس منظر سامنے رکھا جائے تو غزہ میں اسرائیل کی نام نہاد ''جوابی کارروائی''، جو درحقیقت ایک نسل کش مہم ہے، اپنی اصل صورت میں نمایاں ہوتی ہے:

یہ گزشتہ آٹھ دہائیوں سے جاری نسلی تطہیر کے منصوبے ہی کا تسلسل ہے۔

بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہو گا کہ یہ اسی منصوبے کا آخری باب ہے، اس کا فیصلہ کن اختتام۔

ابتدا ہی سے یہی منصوبہ تھا

اسرائیل کے بانی ڈیوڈ بن گوریون نے ۱۹۳۷ء میں، یعنی اسرائیل کے قیام سے گیارہ برس پہلے، اپنے بیٹے کو ایک خط میں لکھا تھا:

> ''ہمیں عربوں کو یہاں سے نکال کر ان کی جگہ خود آباد ہونا ہو گا۔''

۱۹۴۸ء میں فلسطینیوں کی وسیع پیمانے پر بے دخلی کے دوران اپنی ڈائری میں اس نے اپنے جرنیلوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا:

> ''اگر ہم کسی خاندان پر الزام عائد کریں تو ہمیں اس پر کسی رحم کے بغیر ضرب لگانی چاہیے۔ عورتوں اور بچوں پر بھی کوئی رحم نہیں ہونا چاہیے، ورنہ یہ مؤثر ردِ عمل ثابت نہیں ہو گا۔ کارروائی کے دوران مجرم اور بے گناہ میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں۔''

اصل مقصد خوف کو بطور ہتھیار استعمال کرنا تھا، تاکہ فلسطینی اپنے ہی وطن میں رہنے کی ہمت کھو بیٹھیں۔

۱۹۵۰ء میں اسرائیلی فوج کے ایک سینئر کمانڈر مرد خائی مکلیف نے اسی پالیسی کی منطق بیان کرتے ہوئے کہا:

> ''الجلیل سے ایک لاکھ چودہ ہزار لوگوں کو دہشت پھیلائے بغیر بے دخل کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔''

اگرچہ ان واقعات کے بارے میں فلسطینیوں کی گواہیوں کو نظر انداز کر بھی دیا جائے، تب بھی اسرائیلی فوجی آرکائیوز کے وہ محدود حصے، جو اب تک اسرائیلی مورخین کے لیے کھولے گئے ہیں، ۱۹۴۸ء میں فلسطینیوں کے قتلِ عام اور ان کے خلاف منظم جنسی تشدد کی ناقابلِ تردید شہادت فراہم کرتے ہیں۔

حالیہ اسرائیلی دستاویزی فلموں، مثلاً ''طنطورہ'' میں، جو اس فلسطینی گاؤں کے نام پر بنائی گئی ہے جہاں ایک ہولناک قتلِ عام ہوا تھا، اسرائیلی فوج کا سابق اہلکار، جو اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکا ہے، خود آرکائیوز میں محفوظ دستاویزات کی تصدیق کرتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے فلسطینی لڑکیوں کی اجتماعی آبروریزی ہوتے دیکھی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جنسی تشدد کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی یہ روایت آج بھی ختم نہیں ہوئی۔

اسرائیلی انسانی حقوق کی تنظیم بی تسیلیم (B'Tselem) کے مطابق یہ تشدد اسرائیل کے ٹارچر کیمپس کے اس وسیع نیٹ ورک کا حصہ ہے، جہاں فلسطینی قیدیوں پر منظم جسمانی اور جنسی اذیتیں ڈھائی جاتی ہیں۔

ان زیادتیوں کی شدت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب انہیں مکمل طور پر چھپانا ممکن نہیں رہا۔

یہاں تک کہ نیویارک ٹائمز جیسے مرکزی دھارے کے مغربی ذرائع ابلاغ کو بھی، اگرچہ بہت تاخیر سے، ان واقعات کا اعتراف کرنا پڑا، جس پر نیتن یاہو نے سخت احتجاج کیا اور اخبار کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی دھمکیاں دیں۔

قیدیوں کے ساتھ جنسی تشدد اس قدر معمول بن چکا ہے کہ گزشتہ ماہ جب قبرص کے قریب بین الاقوامی پانیوں میں غزہ کا محاصرہ توڑنے کے لیے روانہ ہونے والے بین الاقوامی امن کارکنوں کے جہاز کو اسرائیلی فورسز نے روک کر سینکڑوں کارکنوں کو گرفتار کیا تو ان میں سے متعدد نے بھی منظم جنسی تشدد کا سامنا کیا۔

اسرائیل چاہتا ہے کہ خوف صرف فلسطین تک محدود نہ رہے، بلکہ ہر اس شخص تک پھیل جائے جو فلسطینی عوام کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کی جرأت کرے۔

اس کے باوجود مغربی سیاست دانوں اور ذرائع ابلاغ نے اپنے ہی شہریوں کے خلاف ہونے والے ان سنگین جرائم کا بمشکل ذکر کیا۔ کیوں؟

کیونکہ ان جرائم کا اعتراف کرنا اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اسرائیلی قبضے کے تحت فلسطینیوں پر اس سے کہیں زیادہ ہولناک مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔

شراکتِ جرم کے زنداں

غزہ کوئی استثنائی واقعہ نہیں۔ یہ اسرائیل کی گزشتہ آٹھ دہائیوں پر محیط فوجی حکمتِ عملی کا عین منطقی تسلسل ہے۔

اگر مغربی معاشروں کے عوام اس حقیقت سے بے خبر ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے سیاسی اور ابلاغی طبقات نے مسلسل اس کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ انہیں اس تاریخ سے ناواقف رکھا جائے۔

اگر مغربی عوام جانتے کہ گزشتہ اسی برس سے فلسطینیوں پر، پہلے صہیونی تحریک اور پھر اسرائیلی ریاست کے ہاتھوں، کیا کچھ گزرتا رہا ہے، تو شاید احتجاجی مظاہروں میں شریک ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ بڑھ جاتی، یہاں تک کہ ان مظاہروں کو سیاسی طور پر نظر انداز کرنا ممکن نہ رہتا۔

اگر انہیں حقیقت معلوم ہوتی تو شاید وہ ان کارکنوں کے ساتھ شامل ہو جاتے جو برطانیہ سمیت مختلف مغربی ممالک میں کھلے عام کام کرنے والی اسرائیلی اسلحہ ساز کمپنیوں، مثلاً ایلبٹ سسٹمز (Elbit Systems)، کی سرگرمیاں روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ممکن ہے وہ فلسطین اور لبنان کے عوام پر برسائے جانے والے ڈرونز اور دیگر ہتھیاروں کی رسد منقطع کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے۔

تب شاید صرف چند ہزار نہیں بلکہ لاکھوں لوگ برطانیہ کی سڑکوں پر نسل کشی کے خلاف پلے کارڈ اٹھائے کھڑے ہوتے، خواہ انہیں ”دہشت گردی کی حمایت“ کے الزام میں گرفتار ہی کیوں نہ کیا جاتا۔

شاید اتنی بڑی تعداد میں گرفتاریاں برطانوی جیلوں کے نظام کو مفلوج کر دیتیں اور اس نام نہاد نظامِ انصاف کا کھوکھلا پن سب پر آشکار ہو جاتا۔

اگر مغربی عوام جہالت کے بجائے حقیقت کا علم رکھتے تو شاید وہ غزہ جانے والی امدادی کشتیوں میں سوار ہوتے، یہاں تک کہ کشتیوں کا ایک ایسا عظیم بیڑہ وجود میں آ جاتا جسے مغربی ذرائع ابلاغ بھی نظر انداز نہ کر سکتے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اگر اس پوری تاریخ اور اس کے حقیقی تناظر کو سمجھ لیا جائے، اگر اسرائیل کی کئی دہائیوں پر محیط قتل، عصمت دری اور جبری بے دخلی کی پالیسی کو اس کی اصل شکل میں دیکھا جائے، تو مغربی عوام شاید اس حقیقت کو بھی پہچان لیں کہ ان کے سیاسی اور ابلاغی طبقات کوئی اخلاقی قوت نہیں ہیں۔

وہ نہ کسی اعلیٰ تہذیب کی اقدار کے محافظ ہیں، نہ بین الاقوامی قانون کے علمبردار، اور نہ ہی جمہوری و لبرل عالمی نظام کے پاسبان۔

حقیقت میں وہ ایک ایسے سیاسی اور معاشی ڈھانچے کا حصہ ہیں جو انہیں وہ سچ بولنے ہی نہیں دیتا جو مغرب کے اقتدار کے پورے نظام کو لرزا سکتا ہے، ایک ایسا نظام جو جنگی صنعت کے ذریعے ایک محدود اشرافیہ کو بے پناہ دولت فراہم کرتا ہے اور اسی کے ذریعے حیاتی ایندھن کی صنعتوں کے دیو قامت منافعوں کا تحفظ کیا جاتا ہے۔

یہی نظام کچھ فلسطینیوں کو قبل از وقت قبروں میں پہنچا دیتا ہے، کچھ کو حراستی کیمپوں میں، کچھ کو جلاوطنی میں، اور کچھ کو دائمی افلاس کی زندگی میں دھکیل دیتا ہے۔ اور اسی دوران یہی نظام مغرب کے باشندوں کو بھی ایسی قید میں مبتلا کر دیتا ہے جس کی دیواریں نظر نہیں آتیں۔

یہ یا تو جہالت اور شراکتِ جرم کی قید ہے، یا پھر علم اور بے بسی کی قید۔ دونوں صورتوں میں انجام وہی ہے جس کا اعتراف پہلے اسرائیلی فوجی نے کیا تھا:

ہماری اپنی انسانیت مرنے لگتی ہے۔

ہمارے دل یا تو سخت ہو جاتے ہیں، یا پھر ٹوٹ جاتے ہیں۔

اور بالآخر ہمارے سامنے بھی وہی چیلنج آ کھڑا ہوتا ہے جس کا سامنا آج فلسطینی کر رہے ہیں:

اپنی اس قید سے آزادی کا راستہ تلاش کرنا۔

[یہ مضمون ایک معاصر آن لائن جریدے میں شائع ہو چکا ہے۔ مستعار مضامین مجلے کی ادارتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)]

☆☆☆☆☆

فلسطینی اشرافیہ: ایک صدی سے مزاحمت کے خلاف استعمار کی معاون

جوزف مساد

غزہ میں جاری اسرائیلی نسل کشی اور مغربی کنارے اور لبنان میں اس کی دہشت گردانہ کارروائیوں کے دوران، فلسطینی اور لبنانی مزاحمتی قوتوں کو صرف اسرائیل ہی کا سامنا نہیں، بلکہ اپنی اس اشرافیہ سے بھی نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے جو دشمن کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔

دنیا کے بیشتر خطوں میں نوآبادیاتی تسلط اور سامراجی غلبے کے خلاف معاشروں کا ردِ عمل عموماً تین صورتوں میں سامنے آیا ہے۔

۱. غریب کسانوں، مزدوروں اور شہری متوسط طبقے کے ایک بڑے حصے کی جانب سے انقلابی مزاحمت۔

۲. خوش حال اشرافیہ کے ایک بڑے طبقے اور متوسط طبقے کے بعض حلقوں کی جانب سے مفاہمت اور تعاون۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ قابض طاقت سے تعاون کے ذریعے کچھ رعایتیں حاصل کی جاسکتی ہیں اور ایسی براہِ راست محاذ آرائی سے بچا جا سکتا ہے جس میں محکوم قوم کی شکست یقینی ہو۔

۳. دولت مند طبقے کے ایک اور حصے کی مکمل اطاعت اور کھلی معاونت۔ اس گروہ کی امید تھی کہ نوآبادیاتی اقتدار کے مقامی کارندے بن کر وہ نہ صرف اپنے حریف اشرافیہ پر فوقیت حاصل کرے گا بلکہ قابض طاقت کی خصوصی عنایات بھی سمیٹے گا، کیونکہ اس کے مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ استعماری تسلط برقرار رہے۔

ایسے رویے ایشیا سے لے کر افریقہ تک، تقریباً تمام نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی معاشروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

عرب دنیا، بشمول فلسطین، بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھی۔ بلکہ نکبہ سے پہلے فلسطینی معاشرے نے برطانوی استعمار اور صہیونی آبادکار نوآبادیات کے مقابلے میں بعینہٖ یہی طرزِ عمل اختیار کیا، اور نکبہ کے بعد بھی یہی صورت حال برقرار رہی۔

۱۹۲۰ء کی دہائی کے آغاز ہی سے، باہمی اختلافات کے باوجود، فلسطین کی دولت مند اشرافیہ اس بات پر متفق تھی کہ صہیونی استعمار کا مقابلہ برطانوی قابض حکام سے تعاون کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس حکمتِ عملی کی قیادت عرب ایگزیکٹو اور سپریم مسلم کونسل کر رہی تھیں، جن پر یروشلم، یافا اور دیگر شہری مراکز کے بڑے فلسطینی رئیس خاندانوں کا غلبہ تھا۔

ان کے مقابلے میں اشرافیہ کا ایک دوسرا گروہ، جس میں یروشلم کا ایک حریف خاندان اور وہ خاندان شامل تھے جو ان دونوں اداروں میں نظر انداز کیے گئے تھے، برطانیہ اور صہیونی تحریک دونوں کے ساتھ مکمل تعاون کا حامی تھا۔

اسی گروہ نے صہیونی سرمایہ اور سرپرستی کے تحت حزبِ زراعی (الزراعی)، جمعیۃ المسلمین الوطنیہ اور بعد میں الحزب الوطنی (نیشنل پارٹی) قائم کیں۔

اس کے برعکس، کسانوں اور مزدوروں کی اکثریت نے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا، جبکہ شہری متوسط طبقے کے ایک بڑے حصے نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

تحریکِ استقلال

فلسطینی اشرافیہ کے طرزِ عمل سے، خواہ وہ کھلے عام تعاون کرنے والا چھوٹا گروہ ہو یا مفاہمت پسند بڑا طبقہ، متوسط طبقے کے اہلِ فکر اس قدر مایوس ہوئے کہ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں حزبِ استقلال قائم کی۔

اس جماعت نے کسانوں اور مزدوروں کی مزاحمت کی حمایت کی اور احتجاجی مظاہروں، معاشی بائیکاٹ اور سول نافرمانی پر مبنی ایک عوامی تحریک شروع کی۔

غزہ کا حمدی الحسینی (جس کا یروشلم کے رئیس حسینی خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا) اور استقلال کے دوسرے نوجوان رہنما دنیا کی دیگر آزادی کی تحریکوں، بالخصوص ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی جدوجہد سے متاثر تھے۔

اسی بنا پر حمدی الحسینی، نابلس کے نوجوان استاد اکرم زعیتر، قوم پرست دانشور اور معلم عزت دروزہ، اور وکیل عونی عبد الہادی، جو ۱۹۲۸ء کے بعد اشرافیہ کے زیرِ اثر عرب ایگزیکٹو کے سیکریٹری بھی رہا، نے گاندھی کی پیروی کرتے ہوئے برطانوی حکام کے ساتھ عدمِ تعاون کی پالیسی اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔

انہوں نے گاندھی کے ۱۹۳۰ء کے مشہور نمک مارچ سمیت بائیکاٹ اور سول نافرمانی جیسے طریقہ کار سے بھی استفادہ کیا۔

پارٹی کے قیام کے فوراً بعد استقلال کے رہنماؤں نے کھلے عام فلسطینی اشرافیہ پر برطانوی اقتدار کی معاونت کا الزام لگایا۔

دسمبر ۱۹۳۲ء میں پارٹی کے پہلے عوامی اجتماع میں انہوں نے فلسطین کی آزادی کا مطالبہ کیا، برطانیہ اور صہیونیت کی مذمت کی، اور عراق، سعودی عرب اور مصر جیسے نوآزاد عرب ممالک کے ساتھ تعاون پر زور دیا۔

انہوں نے عرب ایگزیکٹو کو بے عملی کا مرتکب قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اس کی قیادت برطانوی مینڈیٹری اتھارٹی (British Mandatory Authority) سے ہر قسم کا تعاون ختم کرے۔

اگلے ہی سال، ۱۹۳۳ء میں، جب برطانوی جبر، صہیونی نسلی امتیاز، فلسطینی کسانوں کی بے دخلی اور یہودی آبادکاری، سب اپنی انتہا کو پہنچ گئے، حزبِ استقلال عوام کو منظم کرنے کی اپنی قوت کے عروج پر تھی۔

مزاحمت اور جبر

جب عرب ایگزیکٹو کو عدمِ تعاون کی پالیسی اپنانے پر آمادہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو حزبِ استقلال نے اکتوبر ۱۹۳۳ء میں برطانوی پالیسیوں اور صہیونی آبادکاری کے خلاف ملک گیر مظاہرے منظم کیے۔

بالآخر عرب ایگزیکٹو نے بھی، اگرچہ اس کے اندر موجود تعاون پسند اشرافیہ کی مخالفت کے باوجود، ان مظاہروں کی حمایت کر دی۔

فلسطین بھر میں ہزاروں افراد سڑکوں پر نکل آئے۔ صرف یافا میں آٹھ ہزار مظاہرین شریک تھے، جن میں وادی الحویرث کے وہ چھ سو کسان بھی شامل تھے جن کی زمینیں چند ماہ پہلے صہیونی آبادکاروں نے ہتھیا لی تھیں۔

برطانوی پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کر کے یافا اور حیفا میں ۲۶ نہتے مظاہرین کو شہید کر دیا اور درجنوں کو زخمی کر دیا۔

برطانوی حکام، فلسطینی اشرافیہ کے دونوں دھڑے اور صہیونی تحریک، تینوں اس بات پر متفق تھے کہ حزبِ استقلال کو کچل دینا ان کے مشترکہ مفاد میں ہے۔

ان کی مشترکہ کوششیں بالآخر کامیاب رہیں، اور ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء تک فلسطین کی مقبول ترین آزادی پسند جماعت تقریباً تباہ کر دی گئی۔

اس کے باوجود استقلال کے سابق کارکنوں اور مؤتمر الشباب سے وابستہ نوجوانوں نے اشرافیہ سے یہ مطالبہ مزید شدت سے دہرایا کہ وہ برطانیہ سے صہیونیت کے خلاف مدد مانگنے کی لاحاصل پالیسی ترک کرے اور عدمِ تعاون کی راہ اختیار کرے۔

۱۹۳۶ء تک فلسطینی مزدوروں نے مسلسل ہڑتالیں شروع کر دیں، جن کی اشرافیہ نے مخالفت کی۔ اس رویے کے باعث نوجوانوں، استقلال کے باقی ماندہ کارکنوں اور مزدور طبقے میں ان کی ساکھ مزید گر گئی۔

ادھر اشرافیہ کے سیاست دان قانون ساز اسمبلی کے قیام کے لیے ہائی کمشنر سے مذاکرات میں مصروف رہے، جبکہ دوسری طرف حمدی الحسینی جیسے استقلالی رہنماؤں اور شہری مزدوروں کی قیادت میں ہونے والے عوامی اجتماعات نے ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو ایک تاریخی عام ہڑتال کی صورت اختیار کر لی۔

یہ ہڑتال مسلسل چھ ماہ جاری رہی اور آج بھی دنیا کی طویل ترین عام ہڑتال سمجھی جاتی ہے۔

استقلالیوں، نوجوان تنظیموں اور جمعیۃ الشبان المسلمین کی قیادت میں متحرک عوام سیاسی منظرنامے کی مرکزی قوت بن گئے۔

اسی عوامی دباؤ کے نتیجے میں مفتی امین الحسینی سمیت اشرافیہ کے وہ رہنما، جو ابتدا میں ہڑتال کے مخالف تھے، ایک ہفتے بعد عرب اعلیٰ کمیٹی قائم کرنے پر مجبور ہوئے، جس نے ۱۹۳۴ء میں تحلیل ہونے والی عرب ایگزیکٹو کی جگہ لی۔

تاہم اعلیٰ کمیٹی نے سول نافرمانی کے مطالبات کو نرم کرنے کی کوشش کی، جبکہ برطانوی ہائی کمشنر اشرافیہ کو مسلسل یاد دلاتا رہا کہ عوام کو قابو میں رکھنا ان کی ذمہ داری ہے۔

مفتی امین الحسینی نے بھی ۱۹۳۶ء کے موسم گرما تک عام ہڑتال اور وسیع تر فلسطینی بغاوت کی مکمل حمایت سے گریز کیا۔

اسی دوران فلسطینی اشرافیہ نے نئی سیاسی جماعتیں قائم کیں، جو برطانوی سرپرستی حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں، جبکہ نیشنل ڈیفنس پارٹی تو صہیونی قیادت کی خوشنودی حاصل کرنے میں بھی سرگرم تھی۔

دوسری طرف کسان، مزدور، نوجوان اور دانشور مزاحمت پر ثابت قدم رہے، جبکہ اشرافیہ تعاون اور مفاہمت کی راہ پر گامزن رہی۔ بالآخر یہی کشمکش عظیم فلسطینی انقلاب (۱۹۳۶ء–۱۹۳۹ء) پر منتج ہوئی، جسے برطانوی فوج اور صہیونی آبادکاروں نے بے پناہ خونریزی کے بعد کچل دیا۔ اس دوران آٹھ ہزار سے زائد فلسطینی شہید ہوئے۔

فلسطینی تعاون پسند اشرافیہ نے انقلابیوں کے خلاف امن دستے (Peace Bands) کے نام سے ایک مسلح ملیشیا بھی تشکیل دی، جس کا کام فلسطینی مجاہدین کو قتل کرنا تھا۔

اسی انقلاب کی شکست نے نو برس بعد ۱۹۴۸ء کے سانحۂ نکبہ کی راہ ہموار کی۔

اوسلو کے وارث

یہی صورتِ حال نکبہ کے بعد کے دور میں بھی دوبارہ ابھر کر سامنے آئی۔

جلاوطن کیے گئے فلسطینی کسانوں اور مزدوروں کی نئی نسل نے، متوسط طبقے کے بعض حلقوں کے ساتھ مل کر، ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اواخر میں ایک نئی سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا، جو ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اواخر تک ایک مسلح مزاحمتی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔

جلد ہی فلسطینی اشرافیہ نے اس تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بظاہر مقصد یہ بتایا گیا کہ اس تحریک کو ”بین الاقوامی“ سطح پر قبولیت دلائی جائے۔ اس سلسلے میں پہلا اہم قدم یہ

تھا کہ عرب حکومتوں کو آمادہ کیا گیا کہ وہ ۱۹۷۴ء میں تنظیمِ آزادئ فلسطین (پی ایل او) کو ”فلسطینی عوام کا واحد جائز نمائندہ“ تسلیم کریں۔

اس کے بعد عرب حکومتوں کی مالی سرپرستی نے بتدریج پی ایل او کو سرکاری اور محتاط سیاست کا خوگر بنا دیا۔

نکبہ سے پہلے کی فلسطینی اشرافیہ کی حکمتِ عملی کو دہراتے ہوئے، پی ایل او نے بھی امریکہ اور یورپ کے ساتھ تعاون کا راستہ اختیار کیا اور صہیونی آبادکار نوآبادیات سے فلسطین کی مکمل آزادی کے مطالبے کو ”اعتدال“ کے نام پر محدود کرتے ہوئے ”دوریاستی حل“ کے مطالبے تک لے آئی۔

امریکہ کے ساتھ خفیہ روابط اور یورپ کے ساتھ کھلے سفارتی تعلقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی مکمل آزادی کا داعی رہنے والی پی ایل او، پورے فلسطین کی آزادی کے بجائے، فلسطینی سرزمین کے ایک چھوٹے سے حصے پر ایک محدود ریاست کے قیام کا مطالبہ کرنے لگی۔

اگر ۱۹۷۴ء کے بعد کی پی ایل او، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء کی دہائی کے درمیان مفاہمت اور تعاون پر یقین رکھنے والی فلسطینی اشرافیہ کے کردار کی تجدید تھی، تو ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدوں پر دستخط کے بعد یہی پی ایل او ایک بار پھر اسی اشرافیہ کے اس دوسرے دھڑے میں تبدیل ہو گئی جس نے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۰ء کی دہائی میں حزبِ زراع اور نیشنل ڈیفنس پارٹی کی طرح صہیونی تحریک اور اس کے استعماری سرپرستوں کے ساتھ کھلا تعاون کیا تھا۔

آج کی فلسطینی اتھارٹی (پی اے) انہی تعاون پسند قوتوں کا عکس معلوم ہوتی ہے۔

دوسری طرف یاسر عرفات کی قیادت میں پی ایل او، اور بعد ازاں اس کی جانشین فلسطینی اتھارٹی، ان تمام کوششوں کو دبانے میں مصروف رہی ہیں جن کا مقصد حزبِ استقلال اور کسان انقلابیوں کی اس مزاحمتی روایت کو زندہ کرنا تھا، جسے پہلے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط سے پی ایل او کے ریجیکشنسٹ فرنٹ (Rejectionist Front) نے اپنایا، اور بعد ازاں ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آغاز سے حماس، اسلامی جہاد اور پی ایل او کے باقی ماندہ بائیں بازو کے دھڑوں نے آگے بڑھایا۔

اس کا نقطۂ عروج ۲۰۰۷ء میں منتخب حماس حکومت کے خلاف وہ بغاوت تھی، جسے امریکہ، اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی نے مشترکہ طور پر منظم کیا۔ یہ اسی اتحاد کی یاد تازہ کرتی ہے جس نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں حزبِ استقلال کو کچلنے کے لیے مشترکہ محاذ بنایا تھا۔

اس موقع پر فلسطینی اتھارٹی کی سیکیورٹی فورسز نے وہی کردار ادا کیا جو ۱۹۳۰ء کی دہائی میں امن دستے (Peace Bands) ادا کرتے تھے۔

۱۹۹۳ء سے فلسطینی عوام اسی صورتِ حال کا سامنا کر رہے ہیں۔ آج بھی ان کی جدوجہد ایک طرف صہیونی استعمار کے ساتھ تعاون کرنے والی فلسطینی اتھارٹی ہے، اور دوسری طرف آزادی کی علم بردار مزاحمت، جس کا مقصد آبادکار نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہے۔

غزہ میں جاری نسل کشی، اسرائیل اور اس کے مغربی سرپرستوں کا فلسطینی مزاحمت کے خلاف جواب ہے، جبکہ اسی دوران فلسطینی اتھارٹی نے بھی اپنے زیرِ انتظام مغربی کنارے میں مزاحمتی قوتوں کے خلاف کارروائیوں اور کریک ڈاؤن میں مزید شدت پیدا کر دی ہے۔

اس مقصد کے لیے اسے اسرائیلی قابض فوج اور مسلح صہیونی آبادکاروں کی مدد بھی حاصل ہے۔

تاہم، جس طرح ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء کی دہائی تک فلسطینی اشرافیہ کا تعاون اور مفاہمت مزاحمت کو ختم کرنے میں ناکام رہی، اسی طرح آج کی فلسطینی اتھارٹی بھی اپنے سپرد کیے گئے اس مشن میں ناکام ہو رہی ہے کہ فلسطینی عوام کے دلوں سے مزاحمت کا جذبہ مٹا دے۔

بالآخر فلسطینی عوام کے مستقبل کا فیصلہ اسی مسلسل جدوجہد سے ہو گا، ایک طرف اسرائیل، اس کے مغربی سرپرست، فلسطینی اتھارٹی اور اس کی پشت پناہی کرنے والی دولت مند فلسطینی اشرافیہ، اور دوسری طرف آزادی کے لیے برسرِپیکار مزاحمتی قوتیں۔

ایک صدی سے زائد عرصے پر محیط تعاون اور مزاحمت کی اس کشمکش کے باوجود، اور اسرائیل کی جانب سے نسل کشی بند کرنے سے مسلسل انکار کے باوجود، حالات کا پلڑا بدستور مزاحمت کے حق میں جھکتا دکھائی دیتا ہے۔

[یہ مضمون ایک معاصر آن لائن جریدے میں شائع ہو چکا ہے۔ مستعار مضامین مجلے کی ادارتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)]

☆☆☆☆☆

جو چیز جہاں سے لو وہیں رکھو

ایک صاحب نے حضرت والا کی چھتری جہاں سے لی تھی بجائے اس کے دوسری جگہ رکھ دی۔ ارشاد فرمایا کہ یہ بھی آداب میں سے ہے کہ جو چیز جہاں سے لے وہیں رکھے اور صرف دوسرے ہی کی چیز نہیں بلکہ اپنی بھی چیز جہاں سے لے وہیں رکھے۔ میں نے تو اپنے مکان میں تمام چیزیں مقررہ جگہوں پر رکھی ہیں، اس میں پریشانی نہیں ہوتی۔ فرض کرو دیا سلائی کا بکس ہے، اگر مقررہ جگہ پر رکھا ہو تو اگر آدھی رات کو بھی ہاتھ پڑے گا تو فوراً مل جاوے گا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (نوّر اللہ مرقدہ)

(اصلاح کے تیر بہدف نسخے، صفحہ ۲۰۴)

ٹارچر ورثے میں ملا ہے!

وسعت اللہ خان

مقبوضہ فلسطین سے متعلق اقوامِ متحدہ کی خصوصی وقائع نگار فرانسسکا البانیز ان بین الاقوامی اہلکاروں میں شامل ہیں جنھیں اسرائیل اور امریکہ اس لیے سنگین خطرہ سمجھتے ہیں کہ وہ بنا لگی لپٹی وہ سب کہہ ڈالتی ہیں جس پر اسرائیل اور امریکہ مکمل پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ نہ صرف اسرائیل اور امریکہ میں ان کے داخلے پر پابندی ہے بلکہ ان کا معاشی مقاطع بھی جاری ہے۔ بینک اکاؤنٹس اور کریڈٹ کارڈز بھی منجمد ہیں مگر امریکہ اور اسرائیل ان کی زبان منجمد نہیں کر پا رہے۔

بقول فرانسسکا البانیز ٹارچر اسرائیل کے ریاستی خمیر میں شامل ہے۔ ۱۹۴۸ء کے عظیم نقبہ میں اسرائیلی ملیشیاؤں نے فلسطینیوں کی نسلی صفائی میں تیزی لانے کے لیے ریپ بطور ہتھیار استعمال کیا۔ اسرائیلی مورخ بنی مورس کی نگاہ سے ابتدائی دور کی ایسی متعدد سرکاری دستاویزات گزری ہیں جن میں فوج کے ہاتھوں ریپ کے کم از کم درجن بھر واقعات کا تذکرہ ہے۔

جن نوآبادیاتی طاقتوں نے اسرائیل کی پیدائش میں دائی کا کردار ادا کیا، ان طاقتوں نے محکوموں پر جو جو مظالم ڈھائے، اسرائیل نے نہ صرف ایک اچھے شاگرد کی طرح انہیں ازبر کیا بلکہ مزید ترقی دی۔

مثلاً فلسطین کی برطانوی نوآبادیاتی انتظامیہ نے مقامی بغاوتیں دبانے کے لیے جو ایمرجنسی قوانین لاگو کیے اسرائیل نے ان قوانین کو جوں کا توں اپنی فوجداری لاگ بک میں شامل کر لیا۔

۱۹۲۰ء تا ۲۲ء آئرلینڈ میں آزادی کی تحریک دبانے کے لیے برطانیہ نے بلیک اینڈ ٹینز کے نام سے پیرا ملٹری فورس تعینات کی۔ اپریل ۱۹۲۲ء میں اس پیرا ملٹری فورس کے ساڑھے چھ سو ارکان کو ریٹائر کرنے کے بجائے فلسطین بھیجا گیا۔ انہوں نے وہاں تشدد کے وہ تمام طریقے آزمائے جو وہ آئرش حریت پسندوں پر منطبق کر چکے تھے۔

۱۹۳۶ء تا ۳۹ء کی فلسطینی بغاوت دبانے کے لیے کرفیو لگائے گئے، گھروں کو بارود سے اڑایا گیا۔ شہریوں کو انسانی ڈھال بنایا گیا۔ جافا کے پرانے شہر کو منہدم کر دیا گیا۔ انتظامی قانون کے تحت کسی بھی مشکوک شہری کو غیر معینہ مدت کے لیے حراست میں رکھا جا سکتا تھا (اسرائیل آج تک اس قانون اور دیگر برطانوی نوآبادیاتی ہتھکنڈوں کو مقبوضہ علاقوں میں مسلسل استعمال کر رہا ہے)۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں انہی طریقوں سے برطانیہ نے کینیا میں ماؤ ماؤ تحریکِ آزادی کچلنے کی کوشش کی۔ پائپ لائن کے نام سے جانے گئے بدنام عقوبت خانے تعمیر کیے گئے۔ بغاوت میں حصہ لینے والوں کے حوصلے توڑنے کے لیے اعضائے تناسل کاٹ دیے جاتے یا ٹوٹی بوتلوں سے ریپ کیا جاتا۔ تفتیش کے دوران قیدیوں کو کپڑے پہننے کی اجازت نہ ہوتی۔ خواتین کو بھی مسلسل جنسی ہراسانی کا سامنا کرنا پڑتا۔

فرانس بھی ان سامراجی ممالک میں شامل ہے جنھوں نے اسرائیل کو ابتدا میں نہ صرف اقتصادی آکسیجن فراہم کی، اس کے جوہری پروگرام کی بھرپور معاونت کی، بلکہ ۱۹۵۶ء میں نہر سویز کو جمال عبد الناصر حکومت کی قومی ملکیت سے چھڑوانے کے لیے ایک ناکام اجتماعی حملہ بھی کیا۔

فرانس نے اپنی نوآبادی الجزائر کو ٹارچر کی سب سے بڑی تجربہ گاہ بنا کے رکھا۔ فرانسیسی فوجیوں پر آج تک الزام ہے کہ انہوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں تحریکِ آزادی کچلنے کے لیے خواتین کے ریپ کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ مردوں کے نازک حصوں کو برقی جھٹکے دینا تو عام سی بات تھی۔

فرانسیسی ماہر نفسیات اور فلسفی فرانز فینن نے الجزائر کے بلیدہ اسپتال میں فرانسیسی فوجیوں کا بھی علاج کیا اور ان کے تشدد زدہ الجزائریوں کا بھی علاج کیا۔ بقول فینن ٹارچر جنگی جرم نہیں بلکہ اس نوآبادیاتی سوچ کا نچوڑ ہے کہ کس طرح محکوموں کو مسلسل دبا کے لوٹا جا سکے۔

فرانسیسی قانون دان الجزائر میں تشدد کو قانونی پوشاک پہنانے کے لیے "معتدل جسمانی دباؤ" کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ ۱۹۸۷ء میں اسرائیل میں ٹارچر کی چھان بین کرنے والے لنڈاؤ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بعنہٖ ٹارچر کو جواز دینے کے لیے یہی اصطلاح استعمال کی۔ جب کہ ۱۹۹۹ء میں اسرائیلی ہائی کورٹ نے "ناگزیر حالات میں ضروری جسمانی دباؤ" کے مشروط استعمال کو جائز قرار دیا۔

اب سے دو برس قبل اسرائیلی پارلیمنٹ میں ایک عرب رکن احمد طبی نے سوال اٹھایا کہ آیا کسی قیدی کو ڈنڈوں یا آہنی سریوں سے ریپ کرنا قانونی ہے۔ نیتن یاہو کے حامی ایک رکنِ پارلیمان ہونک ملوسکی نے کہا کہ اگر قیدی کا تعلق حماس سے ہے تو ہر سلوک جائز ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جسمانی و جنسی ٹارچر کس طرح ایک نوآبادیاتی نظام سے دوسرے تک آئرلینڈ سے فلسطین، فلسطین سے کینیا، الجزائر سے پریٹوریا (جنوبی افریقہ) اور وہاں سے الخلیل (ہیبرون) تک ریلے ریس کی طرح سفر کرتا ہے۔

فلسطینی قیدیوں کے حقوق پر کام کرنے والی تنظیم ادامیر کے ڈائریکٹر عبد الطیف غائث کو ۵۷ برس پہلے ۱۹۶۹ء میں یروشلم کی جیل میں رکھا گیا۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۹۳ پر)

غزہ

Gaza is NOT a trend!

کوئی ’ٹرینڈ‘ نہیں ہے!

فلسطین کے لاکھوں شہداء بھائی، بہنوں اور بچوں کا خون اتنا ارزاں نہیں ہے!

ذرا سوچیے!

کیا غزہ کے بچوں کا خون ہمارے لیے کسی ’ٹرینڈ‘ سے بڑھ کر ہے؟!

قدم اٹھائیے!

صہیونی مصنوعات کا......

#بائیکاٹ_کیجیے!

۱۷ قسط

عمرِ ثالث

امارتِ اسلامیہ افغانستان کے مؤسس

عالی قدر امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد رحمہ اللہ کی مستند تاریخ

مصنف: قاری عبدالستار سعید

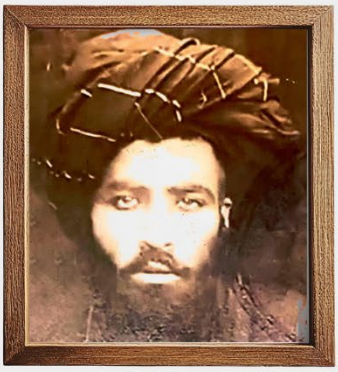

چند اعتراضات اور ان کا جائزہ

کیا امارت اسلامیہ کو عوامی حمایت حاصل نہیں تھی؟

امارتِ اسلامیہ کے خلاف جاری پروپیگنڈا مہمات میں ایک نمایاں اعتراض یہ اٹھایا جاتا رہا ہے کہ یہ تحریک محض ایک مخصوص طبقے تک محدود تھی، اور معاشرے کے وسیع حلقوں میں اسے نہ تو کوئی نمایاں حیثیت حاصل تھی اور نہ ہی عوامی تائید میسر تھی۔ اسی بنا پر یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ اس محدود طبقے کے سوا معاشرے کے دیگر طبقات نے اس کی حکومت میں شرکت اختیار نہیں کی۔

تاہم، حقیقت اس یک رُخی تاثر سے کہیں زیادہ وسیع اور مختلف ہے۔ اس اسلامی تحریک کی بنیاد اگرچہ ملا محمد عمر مجاہد کی قیادت میں مدارس کے طلبہ نے رکھی، لیکن اس کے آغاز کے فوراً بعد افغان معاشرے کے مختلف طبقات نے اس کی حمایت میں لبیک کہا۔ نہ صرف انہوں نے مالی و عسکری تعاون فراہم کیا، بلکہ خود بھی عملی طور پر اس جدوجہد کا حصہ بن کر میدان میں اتر آئے۔

افغانستان کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے بے شمار ایسے مجاہدین، کمانڈرز اور بااثر شخصیات جو سوویت یونین کے خلاف جہاد میں شریک رہے تھے، امارتِ اسلامیہ کی صفوں میں شامل ہوئے اور انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

جب قندھار، کابل، مزار شریف، ہرات، جلال آباد اور غزنی جیسے بڑے شہر فتح ہوئے، تو سابقہ افغان حکومت کے وہ تمام سرکاری ملازمین جن کا کمیونسٹ نظام سے کوئی تنظیمی یا نظریاتی تعلق نہیں تھا، بلکہ جو محض عوامی خدمت کے جذبے کے تحت حکومتی ذمہ داریوں پر فائز تھے، ان کی اکثریت نے امارتِ اسلامیہ کے قیام کے بعد بھی اپنی ملازمتیں جاری رکھیں۔ یوں محکماتی و ریاستی مناصب سے لے کر وزارتوں کی معاونیت اور نیابت تک مختلف سطحوں پر افراد کو مناسب عہدوں پر فائز کیا گیا، انہیں ذمہ داریاں سونپی گئیں، اور حکومتی نظم و نسق کو فعال بنانے میں ان سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔

امارتِ اسلامیہ نے صرف ان افراد کو حکومتی ذمہ داریوں سے الگ کیا جو کمیونسٹ نظریات کے حامل تھے اور اپنے سابقہ دورِ حکومت میں افغان عوام پر ظلم و ستم کے مرتکب ہوئے تھے، یا وہ جو اب بھی اسی نظریاتی وابستگی پر قائم تھے۔ ان کے علاوہ، بیشتر وزارتوں، صوبائی انتظامیہ اور حتیٰ کہ دفاعی و حساس اداروں میں بھی وہی پرانے سرکاری ملازمین اپنے فرائض انجام دیتے رہے، خواہ ان کا تعلق مذہبی طبقے (مولوی حضرات) سے نہ بھی تھا۔

افغان عوام کا امارتِ اسلامیہ کے قیام، عسکری پیش قدمی اور اس کے استحکام میں ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن کردار رہا ہے۔ ابتدا میں امارتِ اسلامیہ کے مجاہدین وسائل کی شدید کمی کا شکار تھے، حتیٰ کہ بنیادی ضروریات بھی محدود تھیں۔ ایسے حالات میں مختلف علاقوں کے عوام نہایت خلوص اور جذبۂ ایثار کے ساتھ مجاہدین کی خوراک، اسلحہ اور دیگر ضروری اشیاء فراہم کرتے رہے۔ اگرچہ جہادی گروپس میں قیادت اور کمانڈ کا محور طالبان ہی تھے، تاہم افرادی قوت کی ایک بڑی تعداد عام عوام پر مشتمل تھی، جو رضاکارانہ طور پر اس تحریک میں شامل ہوتی رہی۔ ضرورت اور بحرانی حالات میں یہی عوام منظم نفیرِ عام کی صورت اختیار کر کے مجاہدین کی مدد کو پہنچتے تھے۔

ستمبر ۱۹۹۵ء میں جب اسماعیل خان نے صوبہ فراہ کی جانب سے ایک بڑا حملہ کیا اور پیش قدمی کرتے ہوئے ہلمند کے گرشک علاقے تک پہنچ گیا، تو یہ صورتِ حال طالبان مجاہدین کے لیے نہایت دشوار اور سنگین تھی۔ اس نازک موقع پر قندھار شہر اور اس کے اطراف و اکناف کے اضلاع سے عوام اپنے ذاتی اسلحے سمیت اُٹھ کھڑے ہوئے اور امارتِ اسلامیہ کے مجاہدین کی مدد کے لیے ہلمند کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ قندھار کے عوام نے اس معرکے میں نہ صرف اپنے نوجوانوں کو دفاع کے لیے پیش کیا، بلکہ خوراک، مالی امداد اور نقد رقوم کے ذریعے بھی بھرپور تعاون فراہم کیا، جس نے اس جدوجہد کو ایک نئی توانائی اور استقامت عطا کی۔

جون ۱۹۹۷ء میں شمالی صوبوں میں ایک تاریخی غداری ہوئی۔ مزارِ شریف میں پُرامن انداز میں داخل ہونے والے طالبان مجاہدین کی بڑی تعداد کو شہید کر دیا گیا، جبکہ بہت سے مجاہدین گرفتار کر لیے گئے۔ اسی دوران قندوز شہر میں بھی مجاہدین کی ایک بڑی جماعت محاصرے میں آ گئی، اور دوسری جانب احمد شاہ مسعود کے جنگجوؤں نے شمالی کابل کے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر کے دارالحکومت کابل کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

اس نہایت نازک اور کٹھن مرحلے پر افغانستان کے عام عوام نے ایک بار پھر امارتِ اسلامیہ کے ساتھ اپنی گہری وابستگی اور غیر متزلزل حمایت کا عملی ثبوت پیش کیا۔ جنوبی اور جنوب

مشرقی صوبوں سے عوام جوق در جوق لشکروں کی صورت میں نکل کھڑے ہوئے۔ خصوصاً قندھار زون اور پکتیا زون سے ہزاروں افراد کابل پہنچ گئے۔ ان کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ امارتِ اسلامیہ کے لیے سب کو اسلحہ فراہم کرنا اور منظم عسکری تشکیل دینا ممکن نہ رہا، چنانچہ بہت سے لوگوں کو واپس اپنے علاقوں کو لوٹ جانے کی ہدایت دی گئی۔

انہی عوامی قربانیوں، حمایت اور جذبۂ وفاداری کی بدولت امارتِ اسلامیہ اس سخت آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلی۔ یوں دارالحکومت کابل کا دفاع مزید مضبوط ہوا، جبکہ فضائی راستے سے مجاہدین کو قندوز منتقل کیا گیا، جنہوں نے دشمن پر پے در پے حملے کرتے ہوئے متعدد علاقوں کو دوبارہ فتح کر لیا۔

حالیہ امریکی حملوں اور عالمی استعماری اتحاد کے مقابلے میں امارتِ اسلامیہ کا مسلسل جہاد اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ امارتِ اسلامیہ کو افغان عوام میں گہری جڑیں اور وسیع عوامی حمایت حاصل ہے۔ کیونکہ دنیا کی بڑی عسکری قوتوں پر مشتمل ایک طاقتور اور حملہ آور دشمن کے مقابلے میں اتنے طویل عرصے تک کامیاب مزاحمت اور مسلسل جہاد، عوامی تائید وتعاون کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

دشمن کی تمام تر عسکری قوت، وسیع پروپیگنڈا مشینری اور مسلسل کوششوں کے باوجود یکے بعد دیگرے ناکامیوں سے دوچار ہونا، اور امارتِ اسلامیہ کو ختم کرنے کی خواہش کا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکنا، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے بعد افغان عوام کی بے لوث حمایت، قربانیوں اور وابستگی ہی کا نتیجہ ہے۔

کیا افغان طالبان کی تحریک پاکستان کے شہر کوئٹہ میں تشکیل دی گئی تھی؟

افغانستان کی معاصر سیاست، خصوصاً امریکی موجودگی میں قائم ہونے والے جمہوری نظام میں شریک بیشتر سیاسی جماعتیں بیرونِ ملک وجود میں آئیں۔ سوویت یونین کے خلاف جہاد کے دوران پاکستان میں سات جبکہ ایران میں آٹھ تنظیمیں تشکیل دی گئیں۔ اسی پس منظر کی بنا پر بعض لوگوں نے طالبان کی تحریک کو بھی انہی جماعتوں پر قیاس کیا، اور آج بھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ طالبان تحریک کی بنیاد پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں رکھی گئی تھی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

طالبان کی اسلامی تحریک، جو بعد میں امارتِ اسلامیہ کے نام سے معروف ہوئی، افغانستان کے قدیم دارالحکومت قندھار میں وجود میں آئی۔ یہیں اس نے اپنی ابتدائی قوت حاصل کی، پروان چڑھی، اور پھر رفتہ رفتہ پورے افغانستان میں پھیل گئی۔ اس موضوع کی تفصیل کتاب کے ابتدائی ابواب میں بیان کی جا چکی ہے، تاہم مذکورہ بالا دعوے کی تردید اور حقیقت کی وضاحت کے لیے چند اہم نکات قابلِ ذکر ہیں:

۱. امارتِ اسلامیہ کے بانی ملا محمد عمر مجاہد نے اپنی زندگی میں کبھی پاکستان میں سکونت اختیار نہیں کی۔ حتیٰ کہ سوویت یونین کے خلاف جہاد کے زمانے میں بھی اُن کا خاندان دیگر بہت سے افغان مہاجرین کی طرح ہجرت کر کے پاکستان نہیں گیا، بلکہ صوبہ ارزگان ہی میں مقیم رہا۔ اگرچہ جہادی دور میں ملا صاحب کبھی علاج معالجے کے لیے پاکستان گئے بھی ہوں، تو اُن کا قیام چند دنوں سے زیادہ نہ تھا۔

مزید یہ کہ تحریک کے آغاز سے لے کر اپنی وفات تک ملا محمد عمر مجاہد نے ایک لمحے کے لیے بھی افغانستان کی سرزمین نہیں چھوڑی۔ ایسی صورت میں یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ ایک شخص، جو پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات سے عملاً ناواقف ہو، وہیں سے کسی منظم سیاسی سرگرمی کا آغاز کرے اور ایک عظیم سیاسی و عسکری تحریک کی بنیاد رکھ دے۔

اصل میں یہ ایک بے بنیاد اور جھوٹی افواہ تھی جو دشمن کی جانب سے پھیلائی گئی ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔

۲. اگر طالبان تحریک پاکستان میں قائم کی گئی ہوتی تو لازماً وہ وہاں کے سیاسی اثرات سے بھی متاثر ہوتی۔ تاہم اس کے برعکس کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ملا محمد عمر مجاہد نے اپنے کسی فیصلے میں پاکستان کے سیاسی مفاد کو معیار بنایا ہو۔ امارتِ اسلامیہ کے نزدیک تمام فیصلوں کی بنیاد صرف اور صرف اعلائے کلمۃ اللہ تھی۔

مزید برآں، امارتِ اسلامیہ کے پاکستان کے اثرات سے آزاد ہونے کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ پاکستانی حکام نے دیگر عالمی قوتوں کی طرح متعدد بار کوشش کی کہ امارتِ اسلامیہ اسامہ بن لادن کے حوالے سے پالیسی میں تبدیلی کرے یا انہیں امریکہ کے حوالے کر دے۔ اسی مقصد کے لیے پاکستانی حکومت نے اعلیٰ سطحی وفود بھی قندھار روانہ کیے، تاہم ملا محمد عمر مجاہد نے ان مطالبات کو قبول نہ کیا اور اسی راستے پر قائم رہے جسے وہ اپنے ایمان اور ضمیر کے مطابق درست سمجھتے تھے۔

نصیر اللہ بابر کا قافلہ

۱۹۹۴ء میں افغانستان خانہ جنگی اور مختلف مسلح دھڑوں کے درمیان شدید لڑائیوں کی لپیٹ میں تھا۔ اسی زمانے میں پاکستان میں بے نظیر بھٹو کی حکومت برسرِ اقتدار تھی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کی خواہش تھی کہ پاکستانی مصنوعات اور برآمدات کے لیے نو آزاد وسطی ایشیائی ریاستوں کے ساتھ تجارتی اور اقتصادی روابط استوار کیے جائیں۔ تاہم اس وقت افغانستان کا دارالحکومت کابل جنگ کا میدان بنا ہوا تھا اور ملک بھر میں کوئی مضبوط مرکزی حکومت موجود نہیں تھی۔

جون ۱۹۹۴ء میں حکومتِ پاکستان نے یہ منصوبہ بنایا کہ قندھار سے ہرات تک جانے والی شاہراہ کو استعمال کرتے ہوئے ترکمانستان تک رسائی حاصل کی جائے، تاکہ اس پورے زمینی راستے کو پاکستانی مصنوعات اور تجارتی سامان کی نقل و حمل کے لیے بروئے کار لایا جا سکے۔ چونکہ افغانستان میں کوئی مقتدر مرکزی حکومت موجود نہ تھی، اس لیے پاکستانی حکام نے ہرات پر قابض اسماعیل خان اور قندھار و ہلمند کے مقامی مسلح کمانڈروں کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا، تاکہ اس راستے پر پاکستانی مال بردار گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے اجازت حاصل کی جا سکے۔

ستمبر ۱۹۹۴ء میں پاکستان کا وزیرِ داخلہ نصیر اللہ بابر اس تجارتی راہداری کو فعال بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ وہ اپنے ہمراہ چھ یورپی ممالک کے سفیروں کو لے کر قندھار پہنچا، جہاں اس نے مقامی کمانڈروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ پاکستانی مال بردار گاڑیوں کو اس راستے سے گزرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کا مؤقف تھا کہ اس کے بدلے مقامی قوتوں کو حقِ راہداری کی مد میں معقول مالی فوائد حاصل ہوں گے۔

قندھار کے بیشتر کمانڈروں نے نصیر اللہ بابر کے اس منصوبے سے اتفاق کر لیا، تاہم ایک کمانڈر، جو امیر لالی کے نام سے معروف تھا، اس تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ قندھار سے واپسی پر نصیر اللہ بابر ہرات گیا، جہاں اسے اسماعیل خان کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ اس وقت اسماعیل خان کو ہرات اور فراہ کے بیشتر علاقوں پر مؤثر کنٹرول حاصل تھا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اُس زمانے میں پاکستانی حکومت کے ہرات کے حکمران اسماعیل خان کے ساتھ نہایت خوش گوار اور قریبی تعلقات قائم تھے۔ اسی تناظر میں پاکستانی خفیہ ادارے سے وابستہ معروف افسر کرنل امام کو، اسماعیل خان کے دورِ اقتدار میں، ہرات میں پاکستان کا قونصل جنرل مقرر کیا گیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۹۴ء میں نصیر اللہ بابر نے اپنے تجارتی منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے ترکمانستان میں ایک اور اہم اجلاس منعقد کیا، جس میں اسماعیل خان اور جنرل دوستم بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر ترکمانستان کے صدر، صفر مراد نیازوف نے اسماعیل خان اور جنرل دوستم کو پاکستان کے ساتھ تعاون پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، تاکہ مجوزہ تجارتی راہداری کا منصوبہ کامیابی سے ہم کنار ہو سکے۔[1]

اکتوبر ۱۹۹۴ء میں پاکستانی حکام نے فیصلہ کیا کہ آزمائشی طور پر تجارتی سامان سے لدی چند گاڑیوں پر مشتمل ایک قافلہ روانہ کیا جائے، تاکہ اس مجوزہ تجارتی راہداری کی عملی افادیت کا جائزہ لیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو پاکستانی تجارتی سامان سے لدی آٹھ گاڑیوں کا ایک قافلہ فرضی سرحد عبور کر کے افغانستان میں داخل ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب قندھار کے ضلع اسپین بولدک پر طالبان نے حال ہی میں کنٹرول حاصل کیا تھا۔ قافلہ جب بولدک پہنچا تو اسے ایک غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل پاکستانی حکام نے پہلے قندھار اور بولدک کے سابق مسلح کمانڈروں کے ساتھ راہداری کے حوالے سے معاہدے کر رکھے تھے، لیکن زمینی حقائق بدل چکے تھے۔ اسپین بولدک، ژڑی اور میوند کے اضلاع اب طالبان کے زیرِ کنٹرول آ چکے تھے۔

نتیجتاً پاکستانی حکام کے لیے یہ ناگزیر ہو گیا کہ تجارتی سامان کو اس راستے سے آگے لے جانے کے لیے طالبان کے ساتھ بھی مذاکرات کیے جائیں اور ان کی رضامندی حاصل کی جائے۔

امارتِ اسلامیہ کے دورِ حکومت میں افغان جمعیتِ ہلالِ احمر کے سربراہ سید عبد اللہ آغا، المعروف تورک آغا، جو ان واقعات کے عینی شاہد تھے، بیان کرتے ہیں:

> ”ضلع اسپین بولدک پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد طالبان تحریک کے سرکردہ ذمہ داران وہیں باہمی مشاورت میں مصروف تھے کہ پاکستانی تجارتی قافلے کے نمائندے ان کے پاس آئے۔ انہوں نے اپنا معاملہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ بولدک سے ہرات تک پورے راستے میں موجود تمام مسلح کمانڈروں کے ساتھ ان کے معاہدے ہو چکے ہیں اور ان سے تحریری ضمانتیں بھی حاصل کی جا چکی ہیں کہ وہ قافلے کو کسی قسم کی رکاوٹ یا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تاہم اب چونکہ بولدک، ژڑی اور میوند جیسے بعض علاقے طالبان کے کنٹرول میں آ چکے ہیں، اس لیے ان کی درخواست تھی کہ قافلے کو اس راستے سے گزرنے کی اجازت دی جائے۔
>
> یہ پہلا موقع تھا جب طالبان کو اس منصوبے اور قافلے کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔ چنانچہ مزید حقائق معلوم ہونے تک قافلے کو روک لیا گیا۔ بعد ازاں قندھار کے بعض مقامی کمانڈروں نے تحریری طور پر طالبان کو آگاہ کیا کہ مذکورہ قافلے کو گزرنے کی اجازت دی جائے۔ جب طالبان نے پورے معاملے کا جائزہ لیا اور اس کی نوعیت کو سمجھ لیا تو انہوں نے بھی قافلے کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی، جس کے بعد تجارتی سامان سے لدی گاڑیاں قندھار کی جانب روانہ ہو گئیں۔
>
> البتہ قندھار کے بعض کمانڈر، جن میں منصور اور امیر لالی نمایاں تھے، اس منصوبے کے مخالف تھے۔ انہوں نے قندھار ایئرپورٹ کے قریب قافلے پر حملہ کر دیا، تجارتی سامان لوٹ لیا اور ڈرائیوروں کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ چند روز بعد جب طالبان نے قندھار شہر پر حملہ کر کے اس پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا تو پاکستانی قافلے کی گاڑیاں اور ان کے ڈرائیور نساجی کے علاقے میں ملے، جہاں انہیں امیر لالی کے اہلکاروں نے محبوس کر رکھا تھا۔“

اس تجارتی قافلے کی لوٹ مار اور ناکامی کے نتیجے میں نصیر اللہ بابر کا مجوزہ تجارتی منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ بعد ازاں پاکستان نے اس منصوبے کو مستقل طور پر ترک کر دیا اور اس راہداری کو فعال بنانے کے لیے دوبارہ کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔

---

[1] افغانستان، طالبان و سیاست ہائے جہانی، ص: ۱۲۱

اگرچہ طالبان تحریک ضلع اسپین بولدک پر قبضے سے تقریباً ڈھائی ماہ قبل قندھار کے مرکزی ضلع میوند (سنگ حصارک) میں وجود میں آچکی تھی، لیکن اسپین بولدک پر طالبان کے قبضے اور پاکستانی تجارتی قافلے کے افغانستان پہنچنے کے واقعات زمانی اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب واقع ہوئے۔ انہی دو واقعات کے تقارب اور بظاہر اتفاقی ہم زمانی کے باعث متعدد مؤرخین، لکھاریوں اور صحافیوں نے غلط نتائج اخذ کیے ہیں۔

مثال کے طور پر انتھونی ڈیوس نامی ایک غیر ملکی صحافی نے انہی دنوں طالبان تحریک کے بارے میں ایک تفصیلی مقالہ تحریر کیا، جسے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں غیر معمولی توجہ اور وسیع پذیرائی حاصل ہوئی۔ بعد ازاں بہت سے صحافیوں اور محققین نے بھی اسے بطور ماخذ استعمال کیا۔ انتھونی ڈیوس نے اپنے مقالے میں لکھا:

> ”طالبان کی عسکری کارروائیاں نصیر اللہ بابر کے افغانستان کے پہلے دورے اور ضلع بولدک میں پاکستانی تجارتی قافلے کی آمد کے درمیانی عرصے میں شروع ہوئیں۔ ۱۲ اکتوبر کو طالبان کے تقریباً ۲۰۰ افراد پر مشتمل ایک لشکر نے چمن سے متصل افغان ضلع بولدک پر حملہ کیا، جو اس وقت حزبِ اسلامی کے کمانڈر اختر جان کے کنٹرول میں تھا۔ طالبان نے محض دو گھنٹوں میں اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔“[۲]

انتھونی ڈیوس نے اس مبہم روایت کے ساتھ ایک اور دعویٰ بھی شامل کیا ہے۔ اس کے مطابق جب طالبان نے بولدک پر حملہ شروع کیا تو فرضی سرحد کے پاکستانی جانب موجود توپ خانے نے بھی ان کی مدد کی اور پوری لڑائی کے دوران طالبان کے مخالفین پر گولہ باری جاری رکھی۔

چنانچہ جب حقائق سے ناواقف کوئی عام قاری انتھونی ڈیوس یا دیگر متعصب اور طالبان مخالف صحافیوں کی ایسی تحریریں پڑھتا ہے تو اس کے ذہن میں فوراً یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ طالبان نے پاکستانی سرزمین سے اسپین بولدک پر حملہ کیا تھا اور ان کی کارروائی کا مقصد نصیر اللہ بابر کے تجارتی قافلے کے لیے راستہ ہموار کرنا تھا۔ اس طرح انتھونی ڈیوس نے واقعات کے زمانی تقارب کو بنیاد بنا کر ایک ایسا بیانیہ تشکیل دیا جس سے حقائق مسخ کر دیے گئے اور واقعات کی تعبیر ایک مخصوص رخ اختیار کر گئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طالبان تحریک ضلع اسپین بولدک پر قبضے سے تقریباً ڈھائی ماہ قبل ضلع میوند کے علاقے سنگ حصارک میں وجود میں آچکی تھی۔ تحریک نے یہیں سے اپنی پیش قدمی کا آغاز کیا، پہلے ضلع میوند کے مرکز تک پہنچی، پھر ضلع ڈنڈ کی جانب بڑھی اور بعد ازاں انہی علاقوں سے پیش قدمی کرتے ہوئے ضلع اسپین بولدک پر حملہ آور ہوئی، جہاں اتفاقاً اس کا سامنا پاکستانی تجارتی قافلے کے معاملے سے ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ طالبان نے ضلع اسپین بولدک پر مشرقی سمت، یعنی چمن (پاکستان) کی جانب سے حملہ نہیں کیا تھا، بلکہ مغربی سمت، یعنی قندھار شہر کی جانب سے پیش قدمی کرتے ہوئے اس علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ تاہم جیسے ہی طالبان کے ہاتھوں اسپین بولدک پر قبضے کی خبر ذرائع ابلاغ میں نشر ہوئی، تقریباً اسی وقت نصیر اللہ بابر کے تجارتی قافلے کی خبر بھی میڈیا کی شہ سرخیوں میں شامل تھی۔

ان دونوں واقعات کے زمانی تقارب اور بیک وقت منظرِ عام پر آنے کی وجہ سے متعصب اور طالبان مخالف حلقوں کو یہ تاثر دینے کا موقع ملا کہ طالبان تحریک دراصل نصیر اللہ بابر کے تجارتی منصوبے کا حصہ تھی یا اسی منصوبے کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل تھی۔

مزید یہ کہ اگر طالبان تحریک واقعی نصیر اللہ بابر کے زیر سرپرستی محض پاکستانی تجارتی قافلوں کی حفاظت اور ان کے لیے راستہ ہموار کرنے کی غرض سے وجود میں آئی تھی، تو یہ سوال اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ حکومتِ پاکستان اور نصیر اللہ بابر نے اس سے قبل قندھار کے مختلف کمانڈروں، ہرات کے اسماعیل خان اور ترکمانستان کے حکومتی نمائندوں کے ساتھ بڑے پیمانے پر معاہدے کیوں کیے تھے؟ ان معاہدوں کا مقصد بھی تو انہی تجارتی راستوں کو محفوظ اور قابلِ استعمال بنانا تھا۔

اسی طرح اگر طالبان کو پاکستانی تجارتی قافلوں کا محافظ قرار دیا جائے، تو یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ طالبان کے قندھار شہر میں داخل ہونے سے قبل ہی مذکورہ تجارتی قافلہ قندھار کی جانب کیوں روانہ ہوا؟ اور پھر راستے میں مسلح افراد کے ہاتھوں لوٹ مار کا شکار کیوں بنا؟

مزید بر آں، جب طالبان نے قندھار، ہلمند، فراہ اور ہرات سمیت وسیع علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم کر لیا تھا، تو اس کے بعد پاکستانی تجارتی قافلوں نے افغانستان کے راستے وسطی ایشیا تک باقاعدہ تجارتی آمد و رفت کیوں شروع نہ کی؟ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اس بات کا مستند ثبوت پیش نہیں کر سکتا کہ امارتِ اسلامیہ کے پورے دورِ حکومت میں پاکستان کا ایک بھی تجارتی قافلہ افغانستان کے راستے وسطی ایشیا تک پہنچا ہو۔

یہ تمام حقائق اس دعوے کی کمزور بنیادوں کو واضح کرتے ہیں کہ نصیر اللہ بابر کے تجارتی قافلے کو طالبان تحریک کے قیام کی وجہ قرار دیا جائے۔ درحقیقت یہ ان بے بنیاد اور غیر مستند الزامات میں سے ایک ہے جنہیں بعض طالبان مخالف حلقے اور صحافی اپنے قارئین کو متاثر کرنے کے لیے دہراتے رہتے ہیں، حالانکہ ان دعوؤں کے حق میں نہ کوئی مضبوط منطقی استدلال موجود ہے اور نہ ہی کوئی قابلِ اعتماد تاریخی شہادت دستیاب ہے۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆

---

[۲] How the Taliban Became a Military Force — Anthony Davis

پاک بھارت کشیدگی اور امریکی کردار

اریب اطہر

پاک بھارت تعلقات میں اتار چڑھاؤ سے سبھی واقف ہیں لیکن گزشتہ چند سالوں سے بھارتی سرکار مختلف نوعیت کی اور مختلف فرنٹس پر پاکستان کے خلاف جس جارحیت کا ارتکاب اب تسلسل سے کر رہی ہے، ماضی میں اس کے خلاف پاکستان کی حکومت اگرچہ زبانی کلامی ہی رد عمل دیا کرتی تھی لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے اس تکلف سے بھی جان چھڑالی گئی ہے۔ سوائے گزشتہ سال مئی کی جنگ کے، جس کو پاکستان نے سٹریٹیجک مقاصد کے لیے پروجیکٹ کیا اور فوائد سمیٹے۔ ذیل میں ہم ان بھارتی اقدامات کا ایک خلاصہ پیش کرنے کے ساتھ اس وجہ کو بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں جو پاکستانی حکومت کو ان اہم مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرنے، حتیٰ کہ میڈیا کو بھی انہیں ہائی لائٹ کرنے سے روکنے پر مجبور کر رہا ہے۔

آپریشن سندور ۲ کی تیاری کر رہے ہیں: انڈین آرمی چیف

انڈین آرمی چیف جنرل اوپیندر دویدی نے ایک بیان میں کہا کہ انڈیا آپریشن سندور ۲٫۰ کی تیاری کر رہا ہے، اور اس بات پر زور دیا کہ حالیہ صورت حال کے باوجود فوجی تیاری برقرار ہے۔ اس نے خبر رساں ادارے اے این آئی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ”آپریشن سندور اب بھی جاری ہے“۔ اس نے موجودہ صورت حال کو ”عارضی جنگ بندی“ قرار دیا۔ جنرل دویدی نے براہِ راست پاکستان کا نام لیے بغیر کہا کہ انڈین فوج مکمل طور پر تیار ہے اور اگر ضرورت پڑی تو نیا آپریشن شروع کیا جاسکتا ہے۔ اس نے کہا کہ صرف فوج ہی نہیں بلکہ فضائیہ اور بحریہ بھی مکمل تیاری میں ہیں۔ اس کے مطابق تینوں افواج کے درمیان بہتر ہم آہنگی پیدا کی جا رہی ہے تاکہ مستقبل کی جنگی صورت حال کے لیے ہر وقت تیار رہا جا سکے۔ جنرل دویدی کا کہنا تھا کہ ”انڈین فوج اور تینوں مسلح افواج آپریشن سندور ۲٫۰ کے لیے بھرپور تیاری کر رہی ہیں، اگر یہ ہوتا ہے۔ اس وقت ہم تینوں افواج کے درمیان تعاون کو مزید مضبوط بنانے اور آئندہ جنگی تقاضوں کے مطابق خود کو تیار کرنے پر کام کر رہے ہیں“۔

چین اور پاکستان کی کوئی مشترکہ سرحد نہیں ہے: بھارتی وزیر خارجہ

پاکستان کا وزیر اعظم شہباز شریف ۲۳ سے ۲۶ مئی تک چین کے سرکاری دورے پر گیا۔ اس دورے کے اختتام پر چین اور پاکستان کی جانب سے مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس اعلامیے کی ایک سطر میں کہا گیا ہے کہ ”دونوں فریقوں (یعنی پاکستان اور چین) نے آمادگی ظاہر کی کہ برابری اور باہمی فائدے کے اصولوں کے تحت سرحد پار آبی وسائل میں تعاون کیا جائے گا“۔ اس کے جواب میں انڈیا کی وزارت خارجہ نے اپنے بیان میں کہا کہ چونکہ چین اور پاکستان کے درمیان کوئی مشترکہ سرحد ہی نہیں ہے تو ”سرحد پار آبی وسائل میں تعاون“ کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

انڈیا نے یہ بھی کہا کہ وہ چین اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۳ء کے سرحدی معاہدے کو تسلیم نہیں کرتا اور جموں و کشمیر کے حوالے سے مشترکہ بیان میں شامل نکات کو بھی مسترد کرتا ہے۔ بھارتی جانب سے یہ بیانات صرف یہاں تک ہی نہیں رہے بلکہ ایک اور بیان میں انڈین وزارت خارجہ کے ترجمان رندھیر جیسوال کی جانب سے کہا گیا کہ حکومتِ انڈیا نے گلگت بلتستان اسمبلی کے لیے ۷ جون ۲۰۲۶ء کو ہونے والے عام انتخابات کے انعقاد کے پاکستانی منصوبے پر پاکستان کے سامنے باضابطہ احتجاج درج کرایا ہے۔ بیان کے مطابق انڈیا گلگت بلتستان کو جموں و کشمیر اور لداخ کے ساتھ اپنی سرزمین کا حصہ قرار دیتا ہے اور وہاں انتخابات کے انعقاد کو قبول نہیں کرتا۔ بیان میں مزید کہا گیا کہ انڈیا ان تمام کوششوں کو مسترد کرتا ہے جن کے ذریعے پاکستان اپنے زیر انتظام علاقوں میں کوئی انتظامی یا سیاسی تبدیلی لانے کی کوشش کرتا ہے۔ حیرانگی کی بات تو یہ ہے کہ اس سنگین نوعیت کے دعووں اور بیانات کے باوجود نہ ہی پاکستان کے وزیر اعظم اور نہ فوجی ترجمان کی جانب سے کوئی سخت جواب دیا گیا بلکہ وزارت خارجہ کی جانب سے ایک رسمی مذمتی بیان جاری کر دیا گیا۔

انڈیا نے سندھ طاس معاہدے سے متعلق ثالثی عدالت کا فیصلہ مسترد کر دیا

سندھ طاس معاہدے سے متعلق عالمی ثالثی عدالت کے فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے انڈین وزارتِ خارجہ کے ترجمان کی جانب سے جاری کیے گئے بیان میں کہا گیا ہے کہ انڈیا نے اس ”نام نہاد عدالت“ کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ پاکستان نے اقوامِ متحدہ پر زور دیا تھا کہ وہ سندھ طاس معاہدے کے حوالے سے انڈیا کے یک طرفہ فیصلے کا نوٹس لے کیونکہ اس معاہدے کی معطلی سے جنوبی ایشیا کے امن اور سلامتی کے لیے سنگین نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ انڈیا نے مقبوضہ کشمیر کے علاقے پہلگام میں ہونے والے حملے کے بعد پاکستان کے ساتھ سفارتی روابط محدود کرنے کے علاوہ دریاؤں کے پانی کی تقسیم سے متعلق ۱۹۶۰ء میں طے پانے والے سندھ طاس معاہدے کو بھی معطل کر دیا تھا۔ سندھ طاس معاہدے کے تحت انڈیا کو بیاس، راوی اور دریائے ستلج کے پانی پر جبکہ پاکستان کو تین مغربی دریاؤں سندھ، چناب اور جہلم کے پانی پر اختیار دیا گیا تھا تاہم اِن تینوں دریاؤں (سندھ، چناب، جہلم) کے بھی ۲۰ فیصد پانی پر انڈیا کا حق ہے۔ سندھ طاس معاہدے کے سابق ایڈیشنل کمشنر شیراز میمن کا کہنا تھا کہ سندھ طاس معاہدے کے تحت دونوں ممالک کی بنیادی ذمہ داریوں میں کم از کم سال میں ایک مرتبہ دونوں ممالک کے واٹر کمشنرز کا اجلاس ہونا، دریاؤں میں پانی کے بہاؤ کا ڈیٹا شیئر کرنا اور دونوں اطراف دریاؤں پر جاری پراجیکٹس پر دوسرے ممالک کی معائنہ ٹیموں کے دورے کرنا شامل ہے۔ دونوں ممالک کے انڈس واٹر کمشنرز عموماً مئی کے مہینے میں یہ اجلاس کرتے تھے اور دونوں ممالک کی حکومتوں کو اس کی سالانہ رپورٹ یکم جون کو پیش کی جاتی تھی۔ شیراز میمن کے مطابق عمل درآمد کی معطلی کا مطلب یہ ہے یہ اجلاس، معائنہ دورے

یادریاؤں میں پانی کے بہاؤ کی ڈیٹا شیئرنگ نہیں ہو گی۔ محسن لغاری کہتے ہیں کہ پاکستان کے لیے مشکل یہ ہے کہ اگر انڈیا کی جانب سے پانی کے بہاؤ سے متعلق آگاہ نہیں کیا جاتا تو اس سے منصوبہ بندی پر فرق پڑ سکتا ہے۔ ”کبھی ضرورت سے کم پانی ملے گا تو کبھی بہت زیادہ پانی سیلاب کے خدشات بڑھادے گا“۔

۸ء۷ کلومیٹر طویل سرنگ کے ذریعے چناب کا پانی بیاس میں موڑنے کا بھارتی منصوبہ

انڈیا کی حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) اس منصوبے کی تشہیر کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ ”انڈیا اب پرانے اصولوں کے تحت نہیں کھیلے گا“۔ ۲۲ مئی کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر بی جے پی نے لکھا کہ ”سندھ طاس معاہدے کو معطل کرنے کے بعد اب بل آخر انڈیا اب اپنے مغربی دریاؤں کی صلاحیتوں کا ہائیڈرو پاور، واٹر سکیورٹی اور سٹریٹجک استعمال کرنے جا رہا ہے“۔ بی جے پی کی اس پوسٹ کے مطابق یہ سرنگ آٹھ اعشاریہ سات کلومیٹر پر محیط ہو گی، جو دریائے چناب سے اضافی پانی بیاس کی طرف موڑ دے گی۔ یہ سرنگ انڈین ریاست ہماچل پردیش کے ضلع کوکسار میں بنے گی۔ اے این آئی کے مطابق چناب بیاس لنک منصوبہ چھبیس ارب بیس کروڑ روپے کی لاگت سے بنے گا۔ پاکستان کے دفتر خارجہ نے خبر دار کیا ہے کہ انڈیا نے دریائے چناب سے تقریباً ۱۹ لاکھ ایکڑ فٹ پانی کا رُخ اپنے بیاس کے نہری نظام پر موڑنے کے منصوبے کے لیے کمپنیوں سے بولیاں مانگی ہیں اور اس کے خطے میں ”سنگین نتائج“ سامنے آئیں گے۔ دفتر خارجہ کے ترجمان طاہر اندرابی کا کہنا تھا کہ انڈیا پانی کو ”بطور ہتھیار“ استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ”اس کے نہ صرف پاکستان کی معیشت بلکہ خطے کے استحکام، بین الاقوامی امن اور سکیورٹی کے لیے بھی خطرناک نتائج ہوں گے“۔

پاکستان میں موجود سابق کشمیری رہنماؤں اور کارکنان کی ٹارگٹ کلنگ

پاکستان میں گزشتہ سالوں میں تسلسل کے ساتھ ان کشمیری رہنماؤں اور کارکنان کی ملک بھر میں ٹارگٹ کلنگ کی جا رہی تھی جو ماضی میں جہادِ کشمیر سے منسلک رہے۔ ان میں بہت سے افراد ایسے بھی تھے جنہیں عسکری معاملات ترک کیے سالوں بیت چکے تھے اور وہ معمول کی زندگی اور اپنے روزگار میں مشغول تھے۔ ان ٹارگٹ کلنگز پر حکومت اور پاکستانی میڈیا کی پر اسرار خاموشی شکوک و شبہات کو جنم دیتی رہی کہ آخر ملک بھر میں ان افراد کی نشاندہی اور ان کی روٹین کے متعلق بھارتی ایجنسیوں کو معلوم ہونا کیسے ممکن ہے۔ یہ کسی ایک یا دو تین شہروں کے واقعات بھی نہیں تھے۔ ٹارگٹ کلنگ کا یہ سلسلہ جب طویل ہوا اور عالمی ذرائع ابلاغ میں بھی ہائی لائٹ ہونے لگا تو حکومت پاکستان معذرت خواہانہ لہجے میں رسمی کارروائی اور مؤقف دینے پر مجبور ہوئی۔ صحافی ماجد نظامی اس صورتحال پر تجزیہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”خوش آئند یہ بھی ہے کہ اتنے سال بعد ریاست ان معاملات پر اپنا مؤقف دے رہی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے ان حساس معاملات پر رپورٹ کرنے والے پاکستانی صحافیوں کو ’قومی مفاد‘ کے خلاف کام کرنے پر ’محبتوں‘ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔“

واضح رہے کہ اس سے قبل باجوہ دور میں یہ رپورٹ ہو چکا تھا کہ حکومت پاکستان نے ایک موقع پر بھارت سے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے پاکستان اب حقیقی معنوں میں مقبوضہ کشمیر میں عسکریت پسندی کے خاتمے کے لیے تعاون کرنے میں سنجیدہ ہے، عسکریت پسندوں کے ایک منصوبے کی اطلاع بھارتی حکومت کو باضابطہ طور پر سفارتی رابطے کے ذریعے پہنچائی تھی۔ اس تناظر میں یہ الزام درست معلوم ہوتا ہے کہ ان ٹارگٹ کلنگز میں بھارتی خفیہ ایجنسیوں کی معاونت پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے بھارت سے تعلقات بہتر بنانے کے لیے کی۔

ان واقعات سے کچھ مزید پیچھے چلتے ہیں تاکہ یہ سمجھنے میں آسانی رہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ پاکستان کی فوجی ڈاکٹرائن کا حصہ تھا اور ان واقعات کا آپس میں ربط اور تعلق ٹھوس تھا۔

۵ اگست ۲۰۱۹ء کے بھارتی اقدامات

۵ اگست ۲۰۱۹ء کو بھارتی حکومت نے مقبوضہ جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرتے ہوئے آئین کے آرٹیکل ۳۷۰ اور ۳۵ اے کو منسوخ کر دیا۔ اس کے تحت ریاست کو دو وفاقی خطوں (جموں و کشمیر، اور لداخ) میں تقسیم کر دیا گیا۔ آرٹیکل ۳۷۰ کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو حاصل نیم خود مختار اور خصوصی آئینی درجہ ختم کر دیا گیا۔ آرٹیکل ۳۵ اے کی منسوخی سے ریاست کے ”مستقل باشندوں“ کے خصوصی حقوق، بشمول زمین کی خریداری اور سرکاری ملازمتوں کا تحفظ، ختم ہو گئے۔ مقبوضہ ریاست کو مرکز کے زیرِ انتظام دو الگ الگ علاقوں (Union Territories) میں تقسیم کیا گیا۔ اس فیصلے سے قبل وادی میں مواصلاتی نظام (انٹرنیٹ، فون) معطل کر کے سخت کرفیو نافذ کر دیا گیا اور سیاسی رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا۔ پاکستان کی جانب سے ان بھارتی اقدامات پر معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا، تقریباً ویسا ہی جیسے قبائل میں امریکی ڈرون حملوں پر منافقانہ احتجاج ریکارڈ کروایا جاتا رہا۔ اصل صورتحال چند سالوں کے بعد پہلی دفعہ صحافی حامد میر نے خاتون صحافی اور اینکر نسیم زہرہ کے پروگرام میں ہوشربا انکشافات کے ذریعے واضح کی۔ صحافی حامد میر کو اس پر تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا کہ وہ یہ حقائق اتنی دیر سے (۲۰۲۳ء میں) کیوں منظر عام پر لائے؟ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ آرمی چیف جنرل قمر باجوہ کے ریٹائر ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جنرل باجوہ نومبر ۲۰۲۲ء میں ریٹائر ہوا۔ پاکستان میں حاضر سروس آرمی چیف کے کسی بڑے جرم کو بے نقاب کرنا یقینی طور پر پاکستان میں موت کو گلے لگانے کے مترادف ہے۔ دوسری بات حامد میر نے جو انکشافات کیے وہ معلومات تو دو درجن دوسرے صحافیوں کو بھی تھی ان میں سے بھی کبھی کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ لب کشائی کرتا۔ حامد میر نے انٹرویو میں دعویٰ کیا کہ سابق آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ اور عمران خان کو کشمیر میں مودی کے ۵ اگست ۲۰۱۹ء کے اقدامات کا مبینہ طور پر پہلے سے علم تھا اور وہ پارلیمان کو اعتماد میں لیے بغیر بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا چاہ رہے تھے۔ پاکستان کے نجی چینل پر اینکر نسیم زہرہ

کے شو میں کیے گئے انکشافات کے مطابق جنرل باجوہ نے ۲۵ صحافیوں کے سامنے کہا تھا کہ ”ہم جنگ لڑنے کے قابل نہیں ہیں، لہٰذا ہمیں بھارت سے صلح کر لینی چاہیے“۔

پاکستان فوج نے اس بارے میں باقاعدہ رد عمل نہیں دیا۔ البتہ فوج کے قریب سمجھے جانے والے تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ پاکستان کے سابق آرمی چیف نے معاشی مشکلات کا تو کہا ہو گا لیکن بھارت کے ساتھ جنگ کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کا بیان مبالغہ آرائی ہے۔ نسیم زہرہ کے ٹاک شو میں حامد میر کا دعویٰ تھا کہ کشمیر کا سودا جنرل قمر جاوید باجوہ نے کیا جس کی تفصیلات قوم کے سامنے نہیں آئیں۔

انہوں نے کہا کہ کشمیر میں سیز فائر یعنی جنگ بندی کے اعلان کے بعد مودی نے پاکستان کا دورہ کرنا تھا۔ اس بارے میں شاہ محمود قریشی کو جب پتہ چلا تو اس نے وزیر اعظم عمران خان سے بات کی۔ اس پر عمران خان نے اسے بتایا کہ جنرل باجوہ اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل فیض اس بارے میں بھارتی قومی سلامتی کے مشیر اجیت دوول سے بات چیت کر رہے ہیں۔ اس کے بعد عمران خان نے جنرل فیض کو کہا کہ وزارت خارجہ کو ”آن بورڈ“ لیا جائے جس کے بعد جنرل باجوہ نے وزارت خارجہ میں ایک بریفنگ کا اہتمام کیا جس میں اس نے کہا کہ ہمارا جنگی ساز وسامان بہت پرانا ہو چکا ہے اور ہم بھارت کے ساتھ جنگ نہیں لڑ سکتے۔ حامد میر نے نسیم زہرہ کو بتایا کہ جنرل باجوہ اس سے پہلے ایسی بریفنگ ہم صحافیوں کو بھی دے چکا تھا جس میں اس کا کہنا تھا کہ پاکستان کی جنگی صلاحیت بھارت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جب حامد میر نے کہا کہ جنرل باجوہ نے ۲۵ صحافیوں کے سامنے کہا کہ ہم جنگ لڑنے کے قابل نہیں ہیں، لہٰذا ہمیں بھارت سے صلح کر لینی چاہیے تو اینکر نسیم زہرہ نے کہا کہ عام طور پر ایسے بیان پر آرمی چیف کا کورٹ مارشل ہونا چاہیے۔ حامد میر نے اس بارے میں وائس آف امریکہ سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اس نے یہ بات پہلے بھی کی تھی:

> ”یہی بات دسمبر میں ہوئی تھی اور مئی ۲۰۲۱ء میں اس وقت کی تھی جب اپریل میں ہمیں بریفنگ دی گئی اور اس کے چند دن بعد صحافی اسد طور پر حملہ ہوا تو نیشنل پریس کلب کے باہر مظاہرے کے دوران میں نے یہی بات کی تھی کہ ہمیں بتایا جا رہا ہے ہم بھارت سے لڑنے کے قابل نہیں ہیں۔“

تحقیقات کے سوال پر حامد میر کا کہنا تھا کہ اس معاملے کی تحقیقات کون کرے گا، کیونکہ ”پوری کی پوری ریاست اس میں ملوث ہے“۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اس بارے میں عمران خان کی حکومت کے دوران کشمیر کے حوالے سے مودی کے اقدامات سے قبل بتایا تھا کہ ”یہ معاملہ ختم ہونے جا رہا ہے، اس میں امریکی صدر ٹرمپ بھی شامل تھا اور جنرل باجوہ نے جنرل فیض کے ساتھ مل کر بالا ہی بالا سب معاملات طے کر دیے تھے“۔

حامد میر نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ جنرل باجوہ نے کئی بار یہ بات کی جس پر میں نے اس سے کہا کہ مسئلہ کشمیر بات چیت کے ذریعے حل ہونا چاہیے اور بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر ہونے چاہئیں، لیکن یہ سب پارلیمنٹ کے ذریعے ہونا چاہیے اور ”اس پر جنرل باجوہ کا ایک ہی رد عمل ہوتا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ پارلیمان میں جان ہی نہیں ہے کہ وہ یہ سب بات چیت کر سکے“۔ حامد میر کے بقول ”میں نے ان سے کئی بار کہا کہ مشرف نے بیک ڈور چینل سے من موہن سنگھ سے بات کی لیکن وہ ناکام رہے۔ اب بھی بیک ڈور کے ساتھ بات چیت ناکام رہے گی۔ جس طریقے سے یہ لوگ بات کر رہے تھے وہ درست نہیں تھی کہ ملک میں کسی کو پتا ہی نہیں اور جنرل فیض اجیت دوول کے ساتھ مل کر مسئلہ کشمیر حل کر رہے تھے“۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کے خلاف جنگ لڑنے کے وسائل نہ ہونے کا بہانہ تراشا گیا تھا لیکن اصل وجہ امریکی ڈکٹیشن تھی۔

بھارت کے متعلق پالیسی میں امریکی کردار

اب اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ بھارت کے متعلق پالیسی میں امریکی مفادات کا کتنا عمل دخل ہے اور پاکستان کی فوجی اشرافیہ بھارت کے متعلق پالیسی طے کرتے ہوئے پاکستانی مفادات کو اولین ترجیح رکھتی ہے یا اصل فیصلہ ساز امریکہ ہے یا پاکستانی جرنیل امریکی مزاج اور امریکہ کی طے کردہ ریڈ لائنز میں رہتے ہوئے پالیسی بناتے ہیں۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد کچھ ہی عرصے میں پاکستان امریکی کیمپ میں شامل ہوا۔ اگرچہ اس وقت پاکستان کو لاتعداد مسائل درپیش تھے لیکن امریکی امداد کے حصول کا سبب فوج اور دفاعی اخراجات تھے۔

جون ۱۹۵۱ء میں امریکہ کوریا جنگ ہوئی جس میں پاکستان نے امریکہ سے تعاون کیا۔ کوریا میں اقوام متحدہ کی فوجی کارروائی کو سپورٹ کیا اور کوریا میں پاکستانی فوج کی ایک بریگیڈ بھیجنے پر رضامندی ظاہر کی بدلے میں امریکہ نے فوج کو جدید اسلحے سے لیس کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن حکومت پاکستان نے واشنگٹن سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ بھارت کے خطرے کے پیش نظر پاکستان کو دفاع اور سلامتی کی گارنٹی دی جائے۔ امریکہ کے انکار پر پاکستان نے کوریا میں فوج بھیجنے کا فیصلہ تبدیل کیا البتہ اقوام متحدہ کی کارروائیوں کی سیاسی حمایت کی۔[1]

بقول عائشہ جلال، لیاقت علی خان (اس سے قبل) ۱۹۵۰ء میں امریکہ کے دورے کے دوران بھی یہی مطالبہ کر چکے تھے کہ اگر امریکہ پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کی گارنٹی دے تو پاکستان کو بڑی فوج کی ضرورت نہیں۔[2]

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء لیاقت علی خان کو قتل کر دیا جاتا ہے اور دہائیوں بعد اس راز سے پردہ ہٹتا ہے کہ پاکستانی اداروں نے لیاقت علی خان کے قاتل کی بیوہ کو مرتے دم تک پروٹوکول اور

---

[1] A history of Pakistan Army by Brian Clougley

[2] The State of Martial Rule by Ayesha Jalal

آسائشوں کے ساتھ رکھا اور اس کی اولادوں کو جائیدادوں سے نوازا گیا، اس کے علاوہ بھی کافی تفصیل اب اخباروں میں شائع ہو چکی ہے جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو پاکستانی ایجنسیوں نے ہی قتل کروایا۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد جنرل ایوب کی حکومت میں امریکیوں سے تعلقات یکسر تبدیل ہو گئے، اب بھارت کے متعلق کوئی مطالبہ شرط نہیں بنتا۔ ایوب امریکیوں سے تعلقات مستحکم کرنے میں اتنا آگے گیا کہ ایک موقع پر امریکی اہلکار سے کہا: ”اگر آپ چاہیں تو ہماری فوج آپ کی فوج بن سکتی ہے“۔[۳]

ایف ایس اعجاز الدین لکھتے ہیں کہ جنرل یحییٰ نے یکم اگست ۱۹۶۹ء کو لاہور میں امریکہ کے صدر نکسن سے علیحدہ ملاقات کی اور وزارت خارجہ کو اعتماد میں نہ لیا، اس طرح اس نے ایوب کی روایت کو برقرار رکھا۔[۴]

جرنیلوں کی امریکہ کے سامنے یوں بچھے جانے کی پالیسی کے نتائج پاکستانی قوم نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں دیکھ لیے جب امریکی بحری بیڑے کے متعلق فقط افواہیں اڑائی گئیں لیکن بھارت کے خلاف پاکستان کی کوئی عملی مدد نہ کی گئی۔ بعد میں کئی مصنفین یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ امریکہ کا اس تنازع میں شامل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور یہ صرف دکھاوا تھا۔

حسین حقانی نے اپنی کتاب ”Pakistan Between Mosque and Military“ میں کارگل جنگ کے متعلق لکھا:

> ”ابتدا میں پاکستان نے فوجی اہلکاروں کی انوالومنٹ سے انکار کیا اور کشمیری عسکریت پسندوں پر الزام لگایا مگر پھر انڈیا نے مشرف اور چیف آف جنرل سٹاف عزیز خان کی کال ریکارڈنگ ریلیز کر دی۔ جس نے کسی شبہ کی گنجائش ہی نہ چھوڑی کہ وہاں کارگل میں فوج ہی ہے۔ مشرف اور عزیز میں یہ گفتگو اس وقت ہوئی جب مشرف بیجنگ میں تھا اور لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان جی ایچ کیو راولپنڈی میں۔ یہ راز ہی رہا کہ انڈیا کو اس کال تک رسائی کیسی ہوئی۔ لیکن پاکستانی ایجنسیز کا شک تھا کہ یہ ریکارڈنگ امریکی خفیہ ایجنسیوں نے کی اور پھر اسے انڈیا کو فراہم کیا تاکہ پاکستان کو شرمندہ کیا جاسکے اور کارگل سے پسپائی کے لیے دباؤ ڈالا جائے۔“

حسین حقانی نے اپنی کتاب میں یہ انکشافات آئی ایس آئی اور ایم آئی افسران سے ہونے والی گفتگو کے توسط سے کیے ہیں۔

یہ نکتہ غور طلب ہے کہ کارگل آپریشن کے متعلق اس وقت کا وزیر اعظم نواز شریف تک لاعلم تھا۔ لیکن امریکیوں کے پاس معلومات تھیں کہ اس آپریشن کا ماسٹر مائنڈ مشرف ہے۔ امریکیوں نے فوج کو پسپائی کے لیے دباؤ ڈلوایا، فوج نے نواز شریف کو امریکہ بھجوایا، جنگ بندی ہوئی، عوام میں تاثر ابھرا کہ فوج جنگ جیت رہی تھی مگر نواز شریف امریکہ کے پریشر میں آگیا۔ نواز شریف کی عزت مجروح ہوئی اور مشرف کارگل بوائے کے نام سے اس وقت ہیرو بن گیا۔ اس وقتی اور جھوٹی مقبولیت نے مشرف کے اقتدار پر قبضے میں مدد دی۔ اس صورتحال کا موازنہ اگر آپ گزشتہ سال مئی کی پاکستان بھارت جنگ سے کریں تو اس میں بھی امریکی انجینئرنگ کے کچھ اثرات ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ اس جنگ سے قبل پاکستانی فوج کو غزہ کے حوالے سے عملی اقدام کرنے کا دباؤ تھا۔ لیکن اس جنگ سے ساری توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔ اور چند روزہ جنگ میں جیتنے کے دعوے کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا فوج نے اسے اپنی طاقت اور سیاسی اثر رسوخ بڑھانے کے لیے بہت برے اور ظالمانہ انداز سے استعمال کیا۔

مئی ۲۰۲۵ء میں پاک بھارت جنگ کے بعد امریکی کانگریس کی کانگریشنل ریسرچ سروس نے ایک رپورٹ ”India-Pakistan Conflict in Spring 2025“ جاری کی جس میں واضح لکھا کہ:

> ”۲۰۰۵ء کے بعد سے، امریکہ اور ہندوستان نے ایک اسٹریٹیجک پارٹنر شپ کو آگے بڑھایا ہے، اس کا ایک حصہ چین کی بڑھتی ہوئی ترقی کے انسداد کے طور پر، اور دوطرفہ سیکورٹی تعاون کئی دہائیوں کی سرد جنگ کے دور کے خاتمے کے بعد بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے۔
>
> کانگریس اور یکے بعد دیگرے چار صدور نے امریکہ بھارت تعلقات کو وسیع اور گہرا کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات، جو سرد جنگ کے دوران ایک قریبی اتحاد تھے، گزشتہ ۱۵ سالوں میں کمزور ہوئے ہیں کیونکہ امریکہ کے ساتھ پاکستان کی سٹریٹیجک مطابقت میں کمی واقع ہوئی ہے۔“

اس سے قبل امریکی تھنک ٹینک کی رپورٹس امریکی حکومت کو یہ تجاویز دے چکی ہیں کہ وہ پاکستانی حکومت کو سختی سے اس بات کا ادراک کروائیں کہ بھارت کو امریکہ چین کے خلاف کھڑا کرنے کے لیے مکمل فراغت دینا چاہتا ہے، ایسے میں اگر بھارت کی توجہ کشمیری عسکریت پسندوں سے نمٹنے میں صرف ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار پاکستان کو سمجھا جائے گا اور پاکستان کو سخت ردعمل بھگتنا ہو گا۔

پاکستان کا ایک مضحکہ خیز اقدام سابق ایئر مارشل جواد سعید کے کورٹ مارشل کا بھی ہے۔ ۲۰۱۹ء میں انڈیا نے جب پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے علاقے بالاکوٹ پر حملہ کیا تو اس وقت جواد سعید نے انڈیا کی اس کارروائی کے خلاف بطور ایئر مارشل پاکستان کے ”آپریشن سوئفٹ ریٹارٹ“ کی سربراہی کی تھی اور اسی آپریشن کے نتیجے میں انڈین ایئرفورس کا پائلٹ ابھینندن گرفتار ہوا تھا۔ سابق ایئر مارشل کا نام ایئر چیف کے اُمیدواروں کی لسٹ میں بھی

---

[۳] United States and Pakistan (1947-2000) By Dennis Kux

[۴] The White House and Pakistan

شامل ہوا تھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ۲۰۱۹ء میں پاکستان اور بھارت کی اس فضائی جھڑپ پر امریکہ کی جانب سے پاکستان سے بازپرس کی گئی تھی کہ پاکستان نے امریکی ایف سولہ جہاز کیوں استعمال کیے اور پاکستان کی جانب سے وضاحت دی گئی کہ ہم نے ایف سولہ نہیں بلکہ دوسرے چینی ساختہ جہاز استعمال کیے۔ یہ بھی رپورٹس منظر عام پر آئیں کہ ایف سولہ کی مرمت کے بہانے ایف سولہ کا انتظام امریکی کنٹریکٹرز کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔

ایران جنگ کے سبب امریکی قربت

ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ ایران جنگ میں پاکستان بالخصوص عاصم منیر کے غیر معمولی کردار کے سبب امریکہ سے تعلقات میں جو گرم جوشی آئی ہے شاید یہی سبب ہے کہ پاکستان کی فوجی اشرافیہ بھارتی عزائم کو سیریس نہیں لے رہی۔ بلاشبہ ان مذاکرات میں مغربی میڈیا نے امریکی مفادات کو مد نظر رکھتے پاکستان کے کردار کو سراہا ہے جبکہ پاکستانی میڈیا نے مبالغہ آرائی کی سب ہی حدیں پار کر دی ہیں۔ لیکن اصل حقیقت کیا ہے یہ آنے والا وقت طے کرے گا۔ بعض تجزیہ نگاروں کی رائے میں پاکستان امریکہ تعلقات ہمیشہ ٹرانزیکشنل رہے ہیں، سرد جنگ، افغان جنگ، گیارہ ستمبر کے بعد، پہلے فائدہ اٹھایا گیا، پھر پابندیاں و ڈرون حملے ہوئے۔ اس لیے موجودہ سٹیج کو بھی ”بہترین سطح“ نہیں کہہ سکتے بلکہ حالیہ ضرورت، ایران تنازع میں پاکستان کی یونیک پوزیشن یعنی ایران کے ساتھ سرحد اور امریکہ کے ساتھ روابط، کی وجہ سے ہے۔ جیسے ہی امریکہ ایران تنازع کم ہوا یا نئی ترجیحات، جیسے انڈیا کے ذریعے چین کو لگام دینا، سامنے آئیں، یہ گرم جوشی ٹھنڈی پڑ سکتی ہے۔

آزاد کشمیر میں کریک ڈاؤن

آزاد کشمیر میں بنیادی حقوق کے حوالے سے اٹھنے والی تحریک کو ان دنوں میں جس انداز سے کچلا گیا ہے یہ وہی طریقہ کار تھا جو حال ہی میں پی ٹی آئی اور ٹی ایل پی کے خلاف استعمال کیا گیا۔ اگر مزید وضاحت کریں تو یہ طریقہ ہندوستان میں مسلم آبادیوں کے خلاف بھی استعمال ہوتا ہے جہاں سکیورٹی فورسز کے ہمراہ نقاب پوش غنڈے ہوتے ہیں جو عوامی املاک کی توڑ پھوڑ کرتے ہیں اور اس توڑ پھوڑ کا الزام مظاہرین پر لگا کر ایک وحشیانہ کریک ڈاؤن کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی فورسز کا یہ طریقہ کار ایک ایسی جگہ استعمال کرنا جسے وہ اپنی شہ رگ کہتی آئی ہے، اور اس وقت جب ہندوستان نئے حملوں کی دھمکیاں دے رہا ہے، یہ پاکستان کی دفاعی لائن کو اپنے ہاتھوں تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ سوشل میڈیا اکاؤنٹس اور فوج کے حمایت یافتہ نام نہاد صحافیوں نے بھی ایک ساتھ محاذ کھولتے ہوئے ان احتجاجوں کو بھارتی سازش اور احتجاج کرنے والوں کو را کے ایجنٹ حتیٰ کہ خوارج تک کہنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ سال پہلے جنرل شفاعت، جو پرویز مشرف کا ملٹری سیکرٹری رہا اور بعد ازاں کور کمانڈر لاہور تعینات ہوا، اس سے متعلق ایک سٹوری منظر عام پر آئی تھی۔ پرویز مشرف کے دور میں موصوف نے بھارتی فلموں کی نمائش پر پاکستان میں پابندی ہٹوائی اور پھر بھارتی فلم ڈائریکٹر سے اپنی بیگم کے نام لندن میں مہنگا اپارٹمنٹ لیا، اس کے علاوہ امریکہ میں بھی اس کے بیٹوں نے پراپرٹی خریدی۔ یہ سکینڈل منظر عام پر آنے کے بعد بھی جنرل شفاعت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی نہ ہی بھارتی فلم ڈائریکٹر سے اپارٹمنٹ لینے پر اس کی حب الوطنی پر کوئی حرف آیا۔ البتہ پاکستان میں اپنے حقوق کی بات کرنا یا فوج کے مفادات کے خلاف کسی بھی قسم کی کوئی بات کرنا انڈین ایجنٹ بنا ڈالتی ہے۔ سب سے اہم بات اسرائیل اور بھارت کی بڑھتی قربت کے باوجود پاکستان کی فوجی اسٹیبلشمنٹ کا ٹرمپ کے بورڈ آف پیس میں نیتن یاہو کی سرپرستی میں شامل ہونا اور نیتن یاہو کے ایجنڈے کو سپورٹ کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ جرنیل کسی بھی قسم کی پستی میں گرنے میں کوئی شرم لحاظ نہیں رکھتے۔

دو دہائیاں قبل مولانا عاصم عمر رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف تیسری جنگ عظیم اور دجال میں جو باتیں لکھیں آج منظر نامہ کہیں زیادہ کھل کر اسی جانب گامزن ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

> ”تاریخی اعتبار سے یہودیوں کا سب سے پکا دوست ہندوستان ہے نیز جنوبی ایشیا کو کنٹرول کرنے کے لیے ہندوستان کو مضبوط کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ان کا مکمل زور بھارت کو مضبوط کرنے پر ہے۔ اس کے علاوہ اس خطے میں وہ جگہ بھی ہے جہاں سے دجال کے خلاف ایک لشکر نکلے گا جو حضرت مہدی کی حمایت کرے گا بلکہ ان کو مضبوط کرے گا، اس لیے اس وقت سے پہلے ہی یہودی بھارت کو ناقابل تسخیر بنانا چاہتے ہیں اور ہر اس قوت کو ختم کرنا چاہ رہے ہیں جو بھارت کے لیے خطرہ پیدا کر سکے۔ پاکستان پر مسلسل دباؤ اور بھارت کی مکمل حمایت کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ جہاد کشمیر کا خاتمہ، پاکستان میں مجاہدین پر پابندیاں، قبائل اور افغانستان میں مکمل مجاہدین کے گرد گھیرا تنگ کیا جانا، کیا ان سب کو دیکھ کر اب بھی نہیں لگتا کہ ہمارا دشمن ان حدیثوں پر ہم سے پہلے عمل درآمد شروع کر چکا ہے اور ہم ہیں کہ ابھی فرصت ہی نہیں۔ لیکن ان سب حالات کو دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر ایمان رکھنے والوں کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انہیں پہلے سے زیادہ اپنے کام میں جوش و جذبہ اور نئے جنون کے ساتھ لگ جانا چاہیے، یہود و ہنود کے سیاسی پنڈت جو چاہیں اہل حق کو ختم کرنے کے لیے چالبازیاں اور امن مذاکرات کی چالیں چلتے رہیں لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا رب آسمانوں میں اپنی تدبیریں فرما رہا ہے اور یہود و ہنود کی یہی چالیں ان پر الٹنے والی ہیں جن سے مجاہدین کے لیے نئے راستے نکلنے والے ہیں صرف اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کی استقامت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔“[۵]

☆☆☆☆☆

---

[۵] تیسری جنگ عظیم اور دجال ص ۸۷

غزوۂ ہند کی فکری بنیادیں

تاریخ کے آئینے میں

ڈاکٹر محمد سربلند زبیر خان

ڈاکٹر محمد سربلند زبیر خان شہید مجاہدینِ پاکستان وبرِّ صغیر کے درمیان کسی تعارف کے محتاج نہیں اور ان کے یہاں ڈاکٹر ابو خالد کے نام سے معروف ہیں۔ پیشِ تر ان کی کتاب ’عصرِ حاضر کے جہاد کی فکری بنیادیں‘ زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر عام وخاص قارئین تک آج سے گیارہ سال قبل پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹر ابو خالد رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری کتاب ’غزوۂ ہند کی فکری بنیادیں تاریخ کے آئینے میں‘، مؤلف شہید نے مارچ ۲۰۱۲ء میں مکمل کی، لیکن مختلف النوع وجوہات کی بنا پر اب تک شائع نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں موجود حقائق اور اعداد و شمار کو ویسا ہی رکھا گیا ہے جیسا کہ بوقتِ تالیف مؤلف شہید نے تحریر کیا تھا۔

’نوائے غزوۂ ہند‘ ڈاکٹر ابو خالد شہید کی اس کتاب کو قارئین کی سہولت اور تدوین و ادارت میں آسانی کی خاطر، قسط وار مجلّے میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ (ادارہ)

باب چہارم: ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ (۲)

تغلق خاندان (۱۳۲۰ء تا ۱۴۱۴ء)

غازی ملک جنہیں غیاث الدین تغلق کے نام سے ہندوستان کا سلطان بنایا گیا تھا ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ علاؤالدین کے زمانے میں جب منگولوں کے حملوں کا خطرہ موجود رہتا تھا تو علاؤالدین نے اپنے وفادار اور آزمودہ کار سالاروں کو لاہور اور ملتان کے علاقوں میں حاکم تعینات کیا تھا۔ غازی ملک بھی انہی سالاروں میں سے ایک تھے۔ انہیں لاہور کے قریب دیپال پور کے علاقے میں حاکم بنایا گیا۔ علاؤالدین کے زمانے میں ہونے والے تمام منگول حملوں میں غازی ملک نے انتہائی دلیری، شجاعت اور دانشمندی کا ثبوت دیا اور کئی دفعہ اکیلے ہی منگولوں کے لشکروں کو شکست دی۔ خسرو خان کے فتنے کو ختم کر کے انہیں غیاث الدین تغلق کے نام سے سلطان بنا دیا گیا۔ غیاث الدین تغلق کا دور صرف چار سال اور چند ماہ پر مشتمل تھا مگر اس کا دور تاریخ میں بہت اہم ہے۔ اس دور کی اہمیت کو ہم مندرجہ ذیل نقاط میں پیش کرتے ہیں:

- غیاث الدین نے حکمران بننے کے چند ماہ کے اندر ہی ملک میں پھیلی طائف الملوکی کو ختم کر دیا۔
- انہوں نے تمام خلجی امراء اور خاندان خلجی کی تمام خواتین کی عزت بحال کی اور ان کے وظائف مقرر کیے۔
- غیاث الدین نے ٹیکس کو کم کر کے دسواں یا گیارہواں حصہ مقرر کیا۔ انہوں نے قابل کاشت زمینوں میں اضافہ کیا اور نہریں کھدوائیں۔
- غیاث الدین نے خسرو کے زمانے میں دیے جانے والے انعامات واکرام واپس لے لیے۔
- غیاث الدین خود بھی شریعت کے پابند تھے اور انہوں نے سختی سے اس کو نافذ بھی کیا۔ انہوں نے علماء کی سرپرستی کی اور بے شمار مدارس اور مساجد تعمیر کیں اور ان کے وظائف مقرر کیے۔
- ان کے ان اقدامات سے ایک طرف تو کا خزانہ بھر گیا، دوسری طرف رعایا خوشحال ہو گئی جبکہ تیسری طرف دین اور شریعت کا بول بالا ہوا۔

غیاث الدین تغلق ۱۳۲۵ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے سلطان محمد تغلق کے نام سے تخت پر بیٹھے۔ محمد تغلق نے ستائیس سال حکومت کی۔ گو محمد تغلق ایک قابل حکمران تھے مگر انہوں نے کئی بڑی سیاسی غلطیاں کیں جس کی وجہ سے ان کی حکومت کا آخری دور بغاوتوں کا گھر بن گیا۔ مگر محمد تغلق ہر دفعہ ان بغاوتوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ محمد تغلق کے دور کے کارناموں اور سیاسی غلطیوں کو ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ درج کرتے ہیں:

- محمد شاہ کو ایک وسیع حکومت اور بھرا ہوا خزانہ وراثت میں ملا تھا۔ انہوں نے اس خزانے سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ہر خاص اور عام کو اس خزانے سے نوازا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ رعایا خوش حال ہو۔
- محمد شاہ خود بھی ایک عالم تھے، انہوں نے علم کی ترقی کے لیے بھی بے پناہ خزانہ خرچ کیا۔ انہوں نے جگہ جگہ مدارس و مساجد تعمیر کیں اور علماء کے وظائف مقرر کیے۔
- ان کے خزانے کا تیسرا مصرف فوج تھی، انہوں نے ایران اور چین کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک بڑی فوج فراہم کی۔
- محمد شاہ ایک عدل پسند بادشاہ تھے، انہوں نے عدل وانصاف کے لیے بھی بہت سا پیسہ خرچ کیا۔
- محمد شاہ نے جو فوج چین کی فتح کے لیے بھیجی تھی وہ فوج چین پہنچنے سے پہلے ہی موسم کی بے رحمی کا شکار ہو گئی۔ اس فوج میں نہ صرف بہت سے قیمتی لوگ شہید ہو گئے بلکہ اس نے بادشاہ کے خزانے پر بہت برا اثر ڈالا۔
- انہوں نے جو رقم لوگوں پر بے دریغ خرچ کی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے زراعت کی ترقی پر صرف کریں۔ مگر انکے عمال کی بد عملی کی وجہ سے بہت سی رقم عام لوگوں تک نہ پہنچ سکی اور اس کا کم فائدہ ہوا مگر اس کا نقصان یہ ہو کہ اس کا خزانہ مزید خالی ہو گیا۔
- اپنے خزانے کو دوبارہ بھرنے کے لیے انہوں نے ٹیکسوں میں اضافہ کیا مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ بدگمان ہو گئے۔ اس بدگمانی کے نتیجے میں لوگوں نے زراعت کا کام چھوڑنا شروع کر دیا اسی دوران قحط پڑا اور اس نے حالات کو مزید خراب کر دیا۔

- ایک اور یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ انہوں نے جو تانبے کے سکے جاری کیے تھے اس کے ٹکسال کا نظام نہیں بنایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے جالی سکے بنانا کر انہیں سونے کے سکوں سے تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اس سے خزانے پر مزید برا اثر پڑا۔

اس صورت حال میں محمد شاہ ٹیکس میں اضافہ کرتے تو حالات مزید خراب ہو جاتے۔ اس لیے محمد شاہ کا آخری زمانہ انہیں بغاوتوں کو ختم کرنے میں گزر گیا۔ محمد شاہ ۱۳۵۰ء میں ٹھٹھہ کے قریب سندھ کی ایک بغاوت کو کچلنے کے دوران فوت ہو گئے۔ محمد شاہ کے بعد ان کے چچازاد بھائی فیروز شاہ تغلق حکمران بنے۔ انہوں نے چالیس سال حکومت کی۔ ان کا دور امن آشتی اور ترقی کا دور تھا۔ ان کے زمانے میں رعایا خوش حال تھی اور اشیاء کی فروانی اور ارزانی تھی۔ ان کی حکومت کی اہم باتیں درج ذیل ہیں:

- فیروز تغلق نے محمد شاہ کے زمانے کے ٹیکس معاف کر دیے صرف زکوۃ اور مال غنیمت کا حصہ رہنے دیا۔
- شاہی خوان پر سونے اور چاندی کے برتن کا استعمال منع کر دیا۔
- عورتوں کا قبروں پر جانا منع کر دیا۔
- محمد تغلق نے جن لوگوں کو قتل کرایا تھا یا سزائیں دے کر معذور کریا تھا ان کو خوب انعامات اور بخششیں دے کر ان سے معافی نامے لکھوائے کہ ہمارا اب محمد تغلق کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں۔
- اس نے بازاروں کا نظام بہتر بنایا۔ غلہ کی ترسیل کے نظام پر خاص توجہ دی۔ دوآبہ کی زمین میں کوئی ایک انچ کی زمین بھی ایسی نہ رہی جو پیداوار نہ دیتی ہوا۔ اس وجہ سے ملک میں بے انتہاء فراوانی اور ارزانی کا دور دورہ ہو گیا۔
- فیروز شاہ کے زمانے میں پانچ بڑی نہریں کھودی گئیں اس نے ملک کی زراعت کو چار چاند لگا دیے۔
- فیروز شاہ کے پاس ایک لاکھ نوے ہزار غلام تھے۔ انہوں نے ان سب غلاموں کی تربیت پر انتہائی توجہ دی، انہیں پڑھایا لکھایا، ان کی مختلف فنون میں تربیت کی۔ انہوں نے اپنے امراء کو بھی غلاموں کی تربیت کا حکم دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ غلام ان کی حکومت کے مختلف شعبوں میں کام کرنے لگے اور ان کے وفادار بھی رہے۔
- فیروز شاہ نے اپنے زمانے میں بہت سے فلاحی کام کرائے۔ انہوں نے شفا خانے بنوائے اور غریبوں اور بیواؤں کے لیے وظیفے مقرر کیے۔
- فیروز شاہ نے بے روزگاری کو ختم کرنے کے لیے خاص اقدام کیے۔ وہ اس بات کا خود خیال رکھتے تھے کہ ہر خاندان کا روزگار کا انتظام ہو۔
- فیروز شاہ کے زمانے میں علم دین پر خاص توجہ دی گئی۔ ان کے زمانے میں تفسیر تاتارخانی اور فتاویٰ تاتارخانی دو ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جو کہ آج بھی فقہ حنفی کی مشہور کتب ہیں۔
- فیروز شاہ کے زمانے میں مختلف ایجادات پر بھی توجہ دی گئی۔ اس زمانے میں ایک گھڑی کی ایجاد ہوئی جو نمازوں کے اوقات اور رمضان میں سحر اور افطار کے اوقات بتاتی تھی۔

فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد ان کا پوتا تغلق شاہ ثانی کے نام سے تخت پر بیٹھا مگر اپنی حرکتوں کی وجہ سے ایک سال بعد قتل ہو گیا۔ اس کے دوسرے پوتے ابو بکر کو بادشاہ بنایا گیا مگر اس کے چچا ناصر الدین نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اب اس میں اور نصرت خان میں جنگ شروع ہو گئی۔ ابھی یہ جنگ ہو رہی تھی کہ تیمور لنگ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ محمود شاہ نے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر شکست کھائی اور پہاڑوں میں جا چھپا۔ تیمور نے دہلی میں قتل عام کیا، غنیمت لوٹی اور جہاں سے آیا تھا وہاں واپس ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک سالار اقبال خان نے نصرت شاہ کو شکست دے دی۔ کچھ عرصے کے بعد ملتان کے حاکم خضر خان نے اقبال خان کو شکست دی اور اسے قتل کر دیا۔ ۱۴۱۴ء میں ناصر الدین مر گیا۔ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ خضر خان نے دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا یوں بادشاہت تغلق خاندان سے سادات خاندان میں چلی گئی۔

خاندان سادات (۱۴۱۴ء تا ۱۴۵۲ء)

تیمور کے حملے کے بعد ہندوستان کی معاشی حالت بہت خراب ہو گئی۔ بستیوں کی بستیاں ویران ہو گئیں۔ اس دور میں تغلق خاندان زوال پزیر ہو گیا اور اس کی جگہ خضر خان دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس کی زندگی کے سات سال ہندوستان کو ایک دفعہ پھر سے ایک مرکزی حکومت کے تحت منظم کرنے کی کوشش میں صرف ہو گئے، مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی اپنی زندگی اسی جدوجہد میں گزار دی۔ مبارک شاہ نیک سیرت بادشاہ تھا اور شریعت کا پابند تھا۔ اسے ہندوؤں کے ایک گروہ نے قتل کر دیا۔ مبارک شاہ کے قتل کے بعد اس کے وزیر نے اس کے بیٹے محمد شاہ کو تخت پر بیٹھا دیا۔ اس کی حالت ایک یرغمال سے زیادہ نہ تھی۔ اس وزیر کے خلاف بغاوت ہو گئی، اور وہ قتل ہوا۔ محمد شاہ ہندوستان کے حالات کے میں کوئی بہتری نہیں لا سکا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا علاؤ الدین بادشاہ بنا اس میں کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اس نے اپنا دار الحکومت دہلی سے بدایوں منتقل کر دیا۔ اس طرح دہلی کا تخت خالی ہو گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لاہور کا حاکم بہلول لودھی دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا۔ علاؤ الدین نے اسے پیغام بھیجا کہ تم میرے بھائی ہو اس لیے میں نے دہلی کی حکومت تمہیں دے دی ہے۔ اس طرح بادشاہت سید خاندان سے لودھی خاندان میں منتقل ہو گئی۔

لودھی خاندان (۱۴۵۲ء تا ۱۵۲۶ء)

لودھی خاندان افغان پشتون خاندان تھا۔ اس خاندان کے لوگ تجارت کے لیے ہندوستان آتے رہتے تھے۔ ان میں بہلول لودھی کا دادا بہرام خان گیروز شاہ کے زمانے میں ملتان کے حاکم مردان دولت کی فوج میں شامل ہو گیا۔ خضر خان نے اس بہرام کے بیٹے ملک شاہ کو

سرہند کا حاکم بنا دیا۔ بہلول لودھی ملک شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا۔ ملک شاہ کے مرنے کے بعد تمام پنجاب بہلول لودھی کے قبضے میں آگیا۔ سید خاندان کے بادشاہ علاؤ الدین کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بہلول لودھی ہندوستان کے پائے تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ بہلول لودھی جب ہندوستان کا بادشاہ بنا تو ہندوستان تیمور کے حملے کے بعد سے ہونے والے اثرات سے ابھی نہیں نکل سکا تھا اور تیمور کے بعد خاندان سادات ہندوستان کو ایک منظم مملکت میں تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ بہلول لودھی نے ہندوستان کو ایک دفعہ پھر ایک منظم مملکت میں تبدیل کر دیا۔ بہلول لودھی نے ۳۸ سال حکومت کی، اس کے بعد اس کا بیٹا سکندر لودھی تخت پر بیٹھا۔ سلطان سکندر لودھی کا زمانہ ہندوستان کے عروج کا زمانہ تھا۔ عدل و انصاف، معاشی ترقی میں یہ دور اپنی مثال آپ ہے۔ سکندر لودھی نے انتیس سال حکومت کی، اس کے بعد اس بیٹا ابراہیم لودھی تخت پر بیٹھا۔ ابراہیم لودھی کا دور بھی عروج کا دور تھا۔ ابراہیم لودھی مزاج کا سخت واقعہ ہوا تھا۔ اس کا چچا دولت خان اس سے ناراض ہو گیا اور وہ بابر سے جا ملا۔ اس نے بابر سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کی مدد کرے تو لاہور تک کا علاقہ اس کو دے دیا جائے گا اور لاہور سے آگے دولت خان کی حکومت ہو گی۔ مگر بابر کے ارادے کچھ اور تھے۔ یوں ۱۵۲۶ء میں بابر نے ابراہیم لودھی کی فوج کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ یوں ہندوستان کی حکومت لودھی خاندان سے نکل کر مغلیہ خاندان میں منتقل ہو گئی۔

مغلیہ سلطنت (۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء)

مغلیہ سلطنت کا آغاز ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی لڑائی میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قبضے سے ہوتا ہے۔

بابر (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء)

بابر ۱۴۸۳ء میں سمرقند میں پیدا ہوا۔ بابر کا تعلق چنگیز خان کی آٹھویں اور تیمور لنگ کی چوتھی نسل سے تھا۔ اس کا باپ سمرقند کا حاکم تھا۔ باپ کا انتقال بابر کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کے چچا نے اس کے باپ کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور بابر کو سمرقند سے بھاگنا پڑا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور دوبارہ سمرقند پر قبضہ کر لیا، مگر کچھ عرصے بعد اس کو یہاں سے پھر نکلنا پڑا۔ سمرقند سے مایوس ہو کر اس نے کابل پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ کابل میں بھی اسے بہت سی سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان سازشوں سے مقابلہ کرنے کے بعد اس نے ایک دفعہ پھر سمرقند پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ مگر آٹھ ماہ بعد اسے دوبارہ سمرقند سے نکلنا پڑا۔ اب اس نے سمرقند کا خیال چھوڑ دیا اور اپنی نظریں ہندوستان پر جما دیں۔ وہ پنجاب کو تیموری سلطنت کا حصہ سمجھتا تھا۔ حالات نے اس کا ساتھ دیا جب ابراہیم لودھی کے اپنے رشتے دار اس کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ بابر نے بہت کم فوج کے ساتھ ابراہیم لودھی کو شکست دے دی۔ اس کے بعد بابر نے رانا سنگھا کو شکست دی اور اس طرح اس کا اقتدار ہندوستان میں قائم ہو گیا۔

ہمایوں (۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۰ء)(۱۵۵۵ء تا ۱۵۵۶ء)

بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں بادشاہ بنا۔ جس دور میں ہمایوں بادشاہ بنا اس وقت بہت سے افغان سردار مغلوں سے حکومت چھیننے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ ان میں ایک بہادر شاہ گجرات میں دوسرا محمود شاہ لودھی اور تیسرا فرید خان جو بعد میں شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ہمایوں سے ہندوستان کی حکومت چھین لی۔ ہمایوں ہندوستان سے بھاگ کر ایران کے بادشاہ طہماسپ شاہ کے پاس چلا گیا۔ طہماسپ شاہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہمایوں بارہ سال طہماسپ شاہ کے پاس رہا۔ جب شیر شاہ سوری انتقال کر گیا اور اس کے بیٹے حکومت کو نہ سنبھال سکے تو ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح کے بعد ہمایوں سیڑھی سے پھسل کر انتقال کر گیا۔

شیر شاہ سوری (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء)

تاریخ کے اس موڑ پر یہ ضروری ہے کہ ہم اس شخص کا ذکر ضرور کریں جس نے مغلوں کو شکست دے کر نہ صرف ہندوستان کے تخت پر قبضہ کر لیا بلکہ پانچ سالوں کے قلیل عرصے میں ہندوستان میں ایک ایسا نظام قائم کر دیا کہ جس کی بنیاد پر مغلوں نے مستقبل میں اپنی حکومت کے نظام کو منظم کیا۔ یہ نظام آج بھی کسی نہ کسی سطح پر پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں قائم ہے۔ یہ شخص فرید خان ہے جو تاریخ میں شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہے۔ فرید خان سہسرام کے حاکم حسن خان کے ہاں پیدا ہوا۔ حسن خان کی چار بیویاں تھیں، اس کی سب سے چھوٹی بیوی ایک نو مسلم ہندو تھی۔ حسن خان مکمل طور پر اس بیوی کے زیر اثر تھا۔ اس بیوی کا نام چاندنی تھا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ اس کے بیٹے حسن خان کی جاگیر کے وارث بنیں۔ مگر اس کے راستے کا سب سے بڑا کانٹا فرید خان تھا۔ وہ ہر وقت فرید خان کو اپنے باپ کی نگاہ سے گرانے کی کوشش میں مصروف رہتی۔ اس کام میں اسے بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کا باپ اس سے ناراض ہو گیا۔

فرید خان جونپور کے حاکم کے پاس آگیا جو کہ اس کے باپ کا دوست تھا۔ یہاں فرید خان نے تعلیم حاصل کی اور فن حرب میں تربیت حاصل کی۔ جونپور میں اس کے جوہر سامنے آنا شروع ہوئے۔ اس کے باپ نے جب اس کی شہرت سنی تو وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا اور جاگیر اس کے حوالے کر دی۔ فرید خان نے پوری جاگیر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے پوری جاگیر کی ترتیب کو بدل دیا۔ اس نے مالک اور مزارع اور کسان کے درمیان اتنا مضبوط تعلق پیدا کر دیا کہ سب مل کر جاگیر کی پیداوار میں اضافہ کرنے لگے۔ اس بات نے فرید خان کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا۔ مگر اس کی سوتیلی ماں اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہی اور اس نے حسن خان کی ناک میں دم کر دیا جس کے نتیجے میں حسن خان نے اپنے بیٹے فرید خان سے درخواست کی کہ وہ یہ جاگیر چھوڑ دے۔ فرید خان باپ کا فرماں بردار تھا، اس نے جاگیر کو چھوڑ دیا۔

جاگیر سے نکل کر فرید خان بابر کے ایک افسر جنید برلاس کی توسط سے بابر کے محافظ دستے میں شامل ہو گیا۔ بابر نے جب فرید خان کی صلاحیتوں کو دیکھا تو اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔

اس صورت حال میں فرید خان نے بابر سے بنگال میں جاگیر حاصل کی اور اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ یہاں سے فرید خان کا عروج شروع ہوتا ہے۔ اس نے بنگال اور بہار کے حاکموں کو معزول کر کے دونوں صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ فرید خان کی اس قوت کا سن کر ہمایوں نے اس کے خلاف فوج کشی کی۔ اس فوج کشی کے دوران ایک بغاوت کو ختم کرنے کے لیے اس کو گجرات جانا پڑا۔ اس نے شیر شاہ (فرید خان) کے ساتھ صلح کر لی۔ اب شیر شاہ کو منظم ہونے کا موقع مل گیا۔ اس نے پہلے گنگا کے کنارے چونسہ کے مقام پر ہمایوں کی فوج کو شکست دی اور پھر قنوج کے میدان میں دوبارہ شکست دی اس کے بعد اس نے ہمایوں کا تعاقب پنجاب تک کیا۔ ہمایوں ایران بھاگ گیا اور فرید خان شیر شاہ کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

شیر شاہ سوری نے صرف پانچ سال حکومت کی۔ مگر اس نے ہندوستان کے زرعی، معاشی، مالیاتی اور حکومتی نظام میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں جن کے اثرات آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا اختصار سے ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

- شیر شاہ سوری کا ایک بڑا کارنامہ پورے ہندوستان کو بڑی شاہراہوں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرنا تھا۔ ایک شاہراہ بنگال، آگرہ، دلی اور لاہور سے ہو کر مغرب میں کابل کی طرف جاتی تھی۔ دوسری شاہراہ لاہور سے ملتان کی طرف جاتی تھی۔ تیسری شاہراہ آگرہ سے مانڈو کی طرف جاتی، چوتھی شاہراہ آگرہ سے چتور کی طرف جاتی تھی۔
- ان شاہراہوں کے ساتھ ساتھ اس نے سترہ سو سرائے بنائے اور درخت لگائے۔ ان سرائیوں میں ہندو اور مسلم دونوں کی رہائش کا علیحدہ انتظام کیا۔ ہر سرائے کے ساتھ مسجد بنائی ان مساجد میں مؤذن اور امام کا انتظام کیا گیا۔ ہر سرائے کے ساتھ پانی کے لیے کنویں موجود تھے۔
- شیر شاہ سوری نے ڈاک کا ایک انتہائی منظم نظام بنایا۔ ہر سات کوس[1] پر تازہ دم گھوڑے موجود ہوتے جو کہ ڈاک والوں کو میسر ہوتے اس طرح ملک کے دور دروز علاقے میں بھی اس کا پیغام چند دنوں میں پہنچ جاتا۔
- شیر شاہ سوری نے زمینداره اور مالیات کا نیا نظام بنایا جس کے اثرات اب بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔
- شیر شاہ سوری نے تانبے، چاندی اور سونے کے سکے جاری کیے۔ اس نے چاندی کے سکے کا نام روپیہ رکھا جو آج پورے برصغیر کی کرنسی کا نام ہے۔
- امورِ حکومت چلانے کے لیے شیر شاہ نے امور خارجہ، امور داخلہ، دفاع، خزانہ اور اوقاف کے محکمے بنائے۔

جلال الدین اکبر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۶ء)

ہمایوں کی وفات کے بعد جلال الدین محمد اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت وہ دہلی سے باہر اپنے استاد بیرم خان کے ساتھ ایک مہم پر تھا۔ بیرم خان نے گورداس پور کی ایک عید گاہ میں اس کی رسم تاج پوشی کی۔ اس کے بعد اس نے پانی پت کے میدان میں ہیمون کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ دہلی میں اس نے اپنی رسم تاج پوشی دوبارہ ادا کی۔ اکبر نے سن ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک تقریباً پچاس سال حکومت کی۔ اس کی حکومت کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی حکومت کا پہلا ۱۵۵۶ء سے ۱۵۷۹ء تک محیط ہے۔ اس دور میں اکبر ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے نظر آتا ہے جس کا مقصد دین اور رعایا کی خدمت ہے۔ ۱۵۷۹ء سے لے کر ۱۶۰۵ء تک کا دور وہ دور ہے جسے اس کی دینی گمراہی کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں اکبر نے ایسے عقائد کا برملا اظہار شروع کر دیا اور اس کی دعوت دوسروں کو دینا شروع کر دی جسے کسی صورت بھی اسلام کے دائرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں اکبر کے دور بادشاہت کے دونوں ادوار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں:

- اکبر کا پہلا دور ایک رحم دل اور عادل بادشاہ کا دور ہے۔ اس دور میں اکبر عقیدے اور عمل دونوں لحاظ سے ایک باعمل مسلمان تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ ہر سال حاجیوں کو رخصت کرنے کے لیے خود جاتا۔ ان کے حج میں ان کی امداد کرتا۔ علماء کی عزت کرتا۔ مدارس اور مساجد کی تعمیر اور ترقی میں مدد کرتا۔
- اس دور میں اس کی سلطنت مغرب کی طرف کابل اور قندھار تک پھیل گی۔ مشرق میں یہ اڑیسہ تک اور شمال میں کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی۔
- انتظام سلطنت میں اکبر نے شیر شاہ کے بنائے ہوئے نظام کو مزید ترقی دی۔ اس نے زمیندارہ کے نظام کو زمینوں کی پیمائش کروا کر دوبارہ منظم کیا۔
- اس نے سلطنت کے کاموں کو چار محکموں میں تقسیم کیا تھا جن میں ایک سرکارِ آتش جو آلات جنگ، اور افواج کی تربیت کو دیکھتا تھا۔ دوسرا محکمہ سرکار ہوائی کہلاتا تھا جس کا کام باورچی خانہ، اصطبل، فیل خانہ وغیرہ کی دیکھ بھال تھی۔ تیسرا محکمہ سرکار آبی کہلاتا تھا جس کا کام نہری نظام کی دیکھ بھال تھی۔ چوتھا سرکار خاکی کہلاتا تھا جس کا کام زراعت اور عمارت کی دیکھ بھال تھا۔
- اکبر نے اپنے مفتوحہ علاقے کو اٹھارہ صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ہر صوبے پر ایک نائب سلطنت تعینات تھا۔ اس کے تحت تین صیغے کام کرتے تھے۔ ان میں پولیس اور عدالتوں کا نظام کام کرتا تھا۔

اکبر کی حکومت کا دوسرا دور سن ۱۵۷۹ء سے شروع ہو کر اس کی موت ۱۶۰۵ء تک چلتا ہے۔ اس دور میں اس کے عقائد میں تبدیلی واقعہ ہونا شروع ہو گئی یہاں تک کہ یہ ایک مکمل دین کی شکل اختیار کر گیا۔ اکبر اس دین میں شامل ہونے کی دعوت دیتا تھا۔ جس کو دین الٰہی کہا

[1] اردو لغتوں میں درج ہے کہ ایک کوس ۳ء۲ کلو میٹر یا ۲ میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ (ادارہ)

جاتا ہے۔ اکبر کے دین کے عقائد کیا تھے؟ دین الٰہی کو قبول کرنے کی وجوہات کیا تھیں؟ اس بارے میں ہم ذیل میں اختصار سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

- اکبر نے اپنے آپ کو سلطان عادل قرار دے کر خود کو ہر مذہب کا مجتہد مطلق قرار دیا۔
- اس نے اپنے مرید بنا شروع کر دیے۔
- مریدوں سے بیعت لیتا تھا ان کو وظائف بتاتا تھا جو کہ کسی طرح بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں تھے۔
- اکبر صبح شام سورج کے نکلنے اور غروب ہونے کے اوقات میں عبادت کرتا اس کے چیلے بھی اس کا ساتھ دیتے۔
- اس نے اپنا دیدار کرنے کا بھی سلسلہ شروع کیا۔
- ہر مرید کو شجرے کے عوض اپنی تصویر عطا کرتا۔
- اس نے مسنون سلام کی جگہ یہ طریقہ نافذ کیا کہ ایک اللہ اکبر کہتا دوسرا جل جلالہ کہتا۔
- اکبر نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے گائے کو ذبح کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔
- ہندوؤں کے تہوار دیوالی کو منانے کا اہتمام کیا۔

غرض کہ اکبر کا یہ دین ہندومت، بدھ مت، جین مت، پارسی مذاہب کا مرقع تھا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکبر نے یہ دین الٰہی کیوں شروع کیا؟ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جو کہ علماء نے بیان کیں ہیں جنھیں ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

- اکبر جلاوطنی میں پیدا ہوا تھا اس لیے اس کی تربیت پر توجہ کم رہی۔ دین کا صحیح شعور اس میں پختہ نہ تھا۔
- اکبر جب بادشاہ بنا تو اس نے فتح پور سکری میں ایک عمارت بنائی جہاں وہ علماء کے ساتھ مذہبی بحثوں میں مشغول رہتا۔ اس عمارت کا نام اس نے عبادت خانہ رکھا۔ یہاں مذہبی بحثوں کے دوران بعض درباری علماء کے دین کے ساتھ رویئوں اور لڑائیوں سے وہ مذہب بیزار ہو گیا۔
- اکبر کے ذہن میں ہندوستان کے تمام مذاہب میں رواداری پیدا کرنے کا سودا سوار تھا۔
- اس دین الٰہی کی ایجاد میں اور اس کا دماغ خراب کرنے میں اس کے نورتنوں نے خاص کردار ادا کیا۔ جن میں مبارک شاہ اور اس کے بیٹے ابو الفضل اور فیضی شامل ہیں۔
- اکبر چونکہ ایران میں کافی عرصہ رہا تھا اور اس کے ایران کے صفوی بادشاہوں سے اچھے تعلقات تھے۔ اس لیے اس کے دربار میں ایران کا اثر زیادہ ہو گیا تھا جہاں سے رافضی اور عقل پرستی کے نظریات اس کے دربار میں عام ہو گئے۔ جنھوں نے اکبر کی گمراہی میں اہم کردار ادا کیا۔
- اکبر نے مذہبی رواداری کے نام پر ہندوؤں کو بڑی بڑی وزارتیں اور عہدے دیے اور ہندو مہارانیوں سے شادیاں کیں جس کی وجہ سے اس کی اس دینی گمراہی میں کوئی کسر ہی نہ رہی۔

اکبر کے دین الٰہی نے ہندوستان میں مذہبی رواداری کی نئی تشریح پیش کی تھی۔ مذہبی رواداری کی آڑ میں اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے اس عمل سے اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید اور اس کے مسلمہ اصولوں پر کیا زد پڑتی۔ یا دوسری بات یہ تھی کہ وہ اس بات کو جانتا تھا اور اس نے یہ بات جانتے بوجھتے ہوئے اور شعور کے ساتھ کی۔ صورتحال جو بھی ہو اکبر کے اس دین الٰہی کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک نئے معاشرتی تعلقات کا آغاز ہوا۔ یہ تعلقات اب ذاتی اور کاروباری سطح سے بڑھ کر ہندو مسلم شادیوں تک پھیل گئے۔ بادشاہ خود بھی مشرک عورتوں سے شادیاں کرتے اور ان کے شہزادے اور امراء بھی یہ کام کرنا شروع ہو گئے۔ جہانگیر کے زمانے میں بھی یہ کام جاری رہا۔ اس طرح ہندو مسلم شادیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی نسل میں توحید کے عقیدے، شریعت کی پابندی اور احترام وہ نہ رہا جو اس سے پہلی نسلوں میں موجود تھا۔ ہندو مسلم رواداری کی یہ نئی تشریح اب ایک بیماری کی طرح مسلم معاشرے میں پھیل گئی۔ جب دین کے مسلمہ عقائد اور شریعت کا احترام کے معیار کم ہونا شروع ہوا تو اس نے انسان کے ذاتی مفاد اور مقاصد زندگی کو بھی تبدیل کر دیا۔ اب دوست اور دشمن کی تمیز ختم ہو گئی۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کا ذکر ہم بعد میں انشاءاللہ کریں گے۔

نورالدین جہانگیر (۱۶۰۶ء تا ۱۶۲۷ء)

۱۶۰۶ء میں اکبر کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا سلیم نور الدین جہانگیر کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ جہانگیر کا دور ۱۲۲۶ء میں اس کی موت کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ جہانگیر کا دور ہندوستان میں امن اور عدل کا دور تھا۔ گو اس کے دور میں چند ایک بغاوتیں بھی اٹھیں مگر ان کو دبا دیا گیا۔ جہانگیر کے زمانے کے اہم واقعات مندرجہ ذیل ہیں:

- اس کے بیٹے خسرو نے اس کے خلاف بغاوت کی، جسے دبا دیا گیا۔ خسرو کو اندھا کروا کر جیل میں بند کر دیا گیا مگر بعد میں اسے آزاد کر دیا۔ ۳۵ سال کی عمر میں خسرو مر گیا۔
- جہانگیر کے زمانے میں عدل کے لیے اس نے ایک گھنٹی اور اس کے ساتھ ایک زنجیر لٹکا رکھی تھی۔ جسے کوئی بھی انصاف کا طالب ہلا کر بادشاہ سے انصاف طلب کر سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دھوبن نے اس زنجیر کو ہلا کر بادشاہ سے انصاف مانگا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ بادشاہ کی چہیتی ملکہ نور جہاں نے اس کے خاوند کو قتل کر دیا تھا۔ بادشاہ نے نہ صرف نور جہاں کو گرفتار کر لیا بلکہ دھوبن کو بھاری دیت ادا کر کے راضی کر لیا۔
- جہانگیر کے عہد کا ایک اور مشہور واقع ہندوستان میں طاعون کی وبا کا پھیلنا تھا جس میں ہزاروں لوگ مرے۔ بستیوں کی بستیاں ویران ہو گئیں۔

- جہانگیر کے عہد کا سب سے اہم واقع ۱۶۱۲ء میں انگریزوں کی سفارت کا آنا تھا۔ ۱۶۰۰ء میں ملکہ الیزبتھ اول نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کو منظور کیا۔ تھامس رو انگلستان کے بادشاہ جیمزاول کے سفیر کی حیثیت سے جہانگیر کے دربار میں آیا۔ اس کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے تجارتی مراعات حاصل کرنا تھا۔ شروع شروع میں جہانگیر اور اس کا بیٹا شاہ جہاں اس کے حق میں نہیں تھے۔ مگر نور جہاں کے بھائی آصف خان نے ان دونوں کو آمادہ کر لیا۔ اس طرح انگریزوں کو ہندوستان سے تجارت کرنے کے لیے مراعات دے دی گئیں۔ اس فیصلے نے ہندوستان کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ تجارت کے لیے آئے ہوئے انگریز آہستہ آہستہ مسلمانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر پورے ہندوستان پر غالب آ گئے۔
- جہانگیر کے زمانے میں اس کی چہیتی بیوی نور جہاں اور اس کے بھائی آصف خان کا اثر و رسوخ جہانگیر کے اوپر حد سے بڑھ گیا۔ نور جہان اور اس کا بھائی جہانگیر کے سب سے چھوٹے بیٹے کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ اس وجہ سے اس کا بیٹا شاہ جہاں اس کے خلاف ہو گیا۔ شاہ جہان کی بغاوت ختم کرتے کرتے جہانگیر بیمار ہو گیا۔ وہ موسم کی تبدیلی کے لیے کشمیر گیا، واپسی میں گجرات کے قریب فوت ہو گیا۔ اس کو لاہور کے قریب دریائے راوی کے کنارے شاہدرہ کے مقام پر دفنایا گیا۔

شاہجہان (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۹ء)

جہانگیر بادشاہ کے انتقال کے بعد شاہجہان ہندوستان کا بادشاہ مقرر ہوا۔ شاہجہان ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک تقریباً تیس سال تک ہندوستان کا بادشاہ رہا۔ اس کا دور مغل دور کے عروج کا دور ہے۔ شاہ جہان کے دور میں ہندوستان کی خوشحالی اور تعمیرات ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے۔ اس کے دور کے اہم واقعات کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

- شاہ جہاں نے تخت پر بیٹھ کر اکبر کے زمانے میں دربار میں شامل کئی ایسی رسومات کو، جو اسلام اور شریعت کے منافی تھیں، ختم کر دیا۔ خاص طور پر سجدے کا نظام جس میں شرک کا عنصر شامل تھا۔ اکبر کے زمانے کی دین الٰہی کے اثرات گو حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں سے جہانگیر کے زمانے میں ختم ہو گئے تھے، مگر اس کے کچھ اثرات باقی تھے۔ ان اثرات کو ختم کرنے کے لیے شاہجہان نے کافی کوشش کی۔ اس نے ہندو مسلم شادیوں پر پابندی لگا دی۔ اس طرح اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں مسلمان معاشرت میں جو کمزوری واقع ہو گئی تھی اس کا کافی کچھ علاج ہوا مگر مکمل طور پر اس کا علاج نہ ہو سکا۔
- شاہ جہاں کے دورِ حکومت کی وجہ شہرت اس کے زمانے کی تعمیرات تھیں۔ شاہ جہاں کے زمانے میں تعمیر ہونے والا تاج محل، موتی مسجد، لال قلعہ، لاہور قلعے کا شیش محل اور تخت طاؤس اور اس طرح کی بے شمار عمارتیں آج بھی ہندوستان اور پاکستان کی سر زمین میں موجود ہیں۔
- شاہ جہاں کا ایک اہم کارنامہ پرتگالیوں کے خلاف کامیاب کاروائی تھا۔ پرتگالی جو کہ انگریزوں کی طرح تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، انہوں نے سورت میں اپنی کالونی بنائی اس کے بعد اپنی تجارت کو بنگال تک پھیلا دیا۔ ان پرتگالیوں نے آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ انہوں نے سورت اور بنگال میں ناجائز طور پر زمین پر قبضہ شروع کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے وہاں کی آبادی جو کہ مسلمانوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی کو غلام بنانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی تجارت کی جگہوں پر قلعے بنانا شروع کر دیے اور اسلحہ رکھنا شروع کر دیا۔ شاہجہان کے پاس یہ شکایات پہنچیں تو اس نے اپنے مقامی حاکم قاسم خان کو ان کے خلاف کاروائی کرنے کا حکم دیا۔ قاسم خان نے کافی بڑی کاروائی کے بعد ان کا زور ختم کیا۔ اس میں دس ہزار کے قریب پرتگالی قتل ہوئے تین سو قیدی بنائے گئے۔
- شاہجہاں کے دور میں اسے اپنے آبائی وطن سمرقند کو فتح کرنے کا شوق سوار ہو گیا۔ اس نے ایک فوج اپنے بیٹے مراد کی سرکردگی میں بھیجی۔ اس مہم میں مراد کی کارکردگی کچھ تسلی بخش نہ تھی۔ اس نے مراد کو واپس بلا کر اورنگ زیب کو اس مہم پر بھیجا۔ اس نے اس مہم کو کامیاب بنایا اور بدخشاں تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اس مہم کو ایران کے بادشاہ عباس صفوی کی درخواست پر ختم دیا گیا۔
- شاہجہان کے عہد کا ایک اور اہم واقعہ اس کا ایران کی حکومت سے تعلقات کا خراب ہو جانا تھا۔ ایران پر صفوی خاندان کی حکومت تھی، یہ حکومت مغل بادشاہوں کی محسن سمجھی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیر شاہ سوری کے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد صفوی بادشاہ شاہ طہماسپ نے ہمایوں اور اس کے بیٹے اکبر کو ایران میں پناہ دی تھی۔ شیر شاہ کی وفات کے بعد جب ہمایوں نے ہندوستان کو دوبارہ فتح کرنے کی مہم کا آغاز کیا اس وقت بھی شاہ طہماسپ نے اس کی مدد کی۔ ہمایوں نے سب سے پہلے قندہار کو فتح کیا۔ قندھار کو فتح کرنے میں بھی ایرانی فوج نے اہم کردار ادا کیا۔ اس زمانے سے قندھار مغل حکومت کے قبضے میں تھا۔ شاہجہان کے زمانے میں ایران کے بادشاہ شاہ عباس نے اس پر قبضہ کر لیا۔ شاہجہان نے قندھار کو فتح کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔
- شاہجہان کے دور کا سب سے اہم واقعہ اس کے دو بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب عالمگیر کے درمیان ایک تیس سالہ سرد جنگ تھی جو بعد میں باقاعدہ جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ اس جنگ نے آنے والے دور میں ہندوستان کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ جنگ جہاں ایک طرف تو تخت ہندوستان پر قبضہ کرنے کی سیاسی جنگ تھی وہاں یہ نظریاتی اور فکری جنگ بھی تھی۔ ایک طرف تو شاہجہان کی آنکھوں کا تارا سب سے بڑا بیٹا دارا شکوہ تھا جس کے نظریات عقل پرستی، اکبر کے صلح کل کے نظریے، ویدانیت کے ہندو فلسفے اور بدعت پرستانہ عقائد سے بھرپور تھے تو دوسری طرف ہر معاملے کو دین اور شریعت کی کسوٹی پر پرکھنے والا اورنگ زیب عالمگیر تھا جو کہ شاہجہان کا تیسرا اور سب سے باصلاحیت بیٹا تھا، مگر جو ہر وقت بادشاہ کے عتاب کا

شکار رہتا تھا۔ شاہجہان دارا شکوہ کو بادشاہ بنانا چاہتا تھا اور اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتا اور مانتا تھا۔ جب تک شاہ جہان بادشاہ رہا اس وقت تک ہر بات دارا شکوہ کی مانی جاتی۔ دارا شکوہ نے اورنگ زیب کو ذلیل اور بدنام کرنے اور اپنی راہ سے ہٹانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مگر جب شاہ جہان بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو اورنگ زیب کے چار بیٹوں کی آپس میں جنگ شروع ہو گئی، جس میں اورنگ زیب کامیاب ہوا اور بادشاہ بن گیا جب کے دوسرے تمام بیٹے مارے گئے۔ شاہجہان کو دہلی کے قلعے میں نظر بن کر دیا گیا۔ اورنگ زیب کی اس فتح میں اس کا دین پسند ہونے نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس جنگ کے ہندوستان پر فکری اور سیاسی اثرات پر ہم آئندہ انشاءاللہ بحث کریں گے۔

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۹ء تا ۱۷۰۷ء)

اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا سب سے مضبوط اور طاقت ور آخری بادشاہ تھا۔ اس نے پچاس سال حکومت کی۔ اس کی حکومت ہندوستان میں مسلمانوں کا آخری عروج ثابت ہو کیونکہ اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کے جانشین اس کی حکومت کو سنبھال نہ سکے اور یہ حکومت بتدریج زوال پذیر ہوتے ہوئے بالآخر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اورنگ زیب کے دور کے اہم واقعات درج ذیل ہیں:

- اورنگ زیب کی بادشاہت کا اہم واقعہ تخت نشینی کی جنگ تھی جس میں شاہجہاں کے چاروں بیٹے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کر رہے تھے۔ دارا شکوہ دہلی پر قابض تھا۔ اس نے ایک فوج شجاع کے مقابلے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کی قیادت میں بھیجی جس نے شجاع کو شکست دی۔ شجاع پٹنہ کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں کے راجہ نے اس کو پناہ دی مگر جب اس نے اس راجہ کے خلاف سازشیں شروع کیں تو راجہ نے اس کو قتل کروادیا۔ مراد نے پہلے تو اورنگ زیب کا ساتھ دیا مگر اس کے بعد اس نے سازشیں شروع کر دیں تو گرفتار ہوا اور ایک شخص کے قصاص میں قتل کیا گیا۔ دارا شکوہ شکست کھا کر سندھ بھاگ گیا جہاں اورنگ زیب کے وفادار بلوچ سردار نے اس کو گرفتار کر کے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور ملحد قرار دے کر اس کو قتل کر دیا گیا۔
- اورنگ زیب عالمگیر نے بادشاہ کے درشن کو ختم کر دیا جو کہ اکبر کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ سجدے کا رواج تو شاہ جہاں نے ختم کر دیا تھا مگر درشن کا رواج چل رہا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اس کو الوہیت کی ہی ایک قسم قرار دے کر اس نظام کو ختم کر دیا۔
- اورنگزیب بیت المال سے کبھی کچھ نہ لیتا بلکہ قرآن لکھ کر اور ٹوپیاں بنا کر اپنے لیے اتنا کما لیتا جس سے اس کا گزر اوقات چلتا تھا۔ اس کی موت کے وقت اسی پیسے سے اس کا کفن دفن کیا گیا اور باقی بچ جانے والے پیسے کو صدقہ کر دیا گیا۔
- اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کا ایک بڑا کارنامہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہے۔ یہ فقہ حنفی کے مطابق مسائل کی بارے میں ایک کتاب تھی۔ اس کتاب کی تدوین میں اس وقت کے جید علماء کے بورڈ نے حصہ لیا۔ بادشاہ ذاتی طور پر اس کتاب کی تدوین میں دلچسپی لیتا اور خود اس کتاب کی سماعت کرتا اور اہم امور میں راہنمائی کرتا۔
- اورنگ زیب عالمگیر کے دور کا ایک اور اہم واقعہ وسطی ہند میں مرہٹہ قوت کا ظہور تھا جسے اورنگ زیب عالمگیر نے بار بار شکست دے کر قابو کر لیا۔ مگر اس کی وفات کے بعد یہی مرہٹہ قوت ایک بار پھر اکٹھی ہو گئی اور ایک وسیع مرہٹہ سلطنت وجود میں آئی جس کو احمد شاہ ابدالی نے شکست دی۔
- اورنگ زیب ہی کے زمانے میں پشتون اور افغان بغاوت ہوئی جس کی قیادت پشتو زبان کا مشہور شاعر خوشحال خان خٹک کر رہا تھا۔ اس بغاوت کو دبا دیا گیا۔

(جاری ہے، ان شاءاللہ)

☆☆☆☆☆

بقیہ: کانٹے اور پھول

ان کے مطابق جب بھی لوگوں کے مجمع میں سے کوئی ایک شخص کسی گشت پر پتھر پھینکے، تو پورے مجمع کو سخت سزا دی جائے تاکہ یہ مجمع سیکھ جائے کہ اپنے درمیان سے ایسے شخص کو روکنے کی کوشش کرے، خود بخود مزدوروں کے ایک مجمع میں سے ایک نوجوان نے گزرنے والی ایک گشت پر پتھر پھینکا، اس پر فوجی رک گئے اور مجمع پر حملہ آور ہو گئے، پٹائی کرنے اور لاتیں مارنے لگے۔ اچانک مجمع نے شور مچایا اور سب نے مل کر ایک جیسی حرکت کی، جھک کر پتھر اٹھائے اور حملہ آوروں کی طرف پھینکنے لگے، اس طرح وہ طبقہ جو متذبذب تھا، انتفاضہ میں شامل ہو گیا اور اپنے بچوں کی روزی تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ اس عوامی جدوجہد میں بھی شامل ہو گیا۔

(جاری ہے، ان شاءاللہ)

بقیہ: اک نظر ادھر بھی

ماہرین کے مطابق اگر موجودہ علاقائی سلامتی کے چیلنجز اور تجارتی رکاوٹیں نہ ہوتیں تو یہ تجارت کہیں زیادہ ہوتی۔ ہندوستان کی برآمدات کی مالیت ۲ء۱ بلین ڈالر تھی، جب کہ اسرائیل سے درآمدات ۶ء۱ بلین ڈالر تھیں۔ ہندوستان اسرائیلی اسلحے کا بھی خریدار ہے ہندوستان کی ڈیفنس امپورٹس میں اسرائیلی شئیر ۱۳ فیصد ہے۔ جس میں طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائل، گولہ بارود، اور precision-strike weapons درست حملہ کرنے والے ہتھیار شامل ہیں۔ گزشتہ مئی ۲۰۲۵ء میں ہونے والی جنگ کے دوران انڈیا نے اسرائیلی ہارپ ڈرون سے پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں حملے کیے۔ اسی طرح متحدہ عرب امارات اسرائیل کی تجارت ۲۰۲۴ء میں ۲۵۴ء۳ بلین ڈالر اور ۲۰۲۵ء میں ۲۰۹$ء۳ بلین تک پہنچ گئی تھی۔

چراغِ بصیرت اور فدائی معرکہ

حبیب الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

حبیب الرحمٰن بندیالوی

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ(سورۃ آل عمران:۱۶۹)

”اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں، انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا، بلکہ وہ زندہ ہیں، انہیں اپنے رب کے پاس رزق ملتا ہے۔“

تاریخِ عزیمت کے افق پر کچھ ستارے ایسے چمکتے ہیں جن کی روشنی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ وہ مٹی کے ایسے پیکر ہوتے ہیں جو زمین پر چلتے ضرور ہیں مگر ان کا دل عرشِ الٰہی کی وسعتوں سے جڑا ہوتا ہے۔

۲۷ جون کا دن، تاریخِ اسلام کے ایک ایسے ہی گمنام مگر لازوال مردِ حُر کی یاد دلاتا ہے جس نے بیس سال قبل، ۲۷ جون ۲۰۰۶ء کو خراسان کی تپتی دھرتی پر اپنے خون سے عشق و مستی کا ایک نیا باب رقم کیا تھا۔

یہ داستانِ شوق ہے کاروانِ حریت کے اس عظیم مجاہد کی، جسے دنیا حبیب الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔

ان کے سفرِ عشق کی ابتدا ۲۰۰۰ء سے پہلے کشمیر کی ان سنگلاخ وادیوں، فلک بوس چوٹیوں اور برفانی دروں سے ہوئی تھی جہاں مظلوموں کی آہیں اور سسکیاں غیرتِ مسلم کو پکار رہی تھیں۔

حبیب الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے عیش و آرام کی زندگی کو ٹھکرا کر جوانی کی امنگوں کو کشمیر کے مقدس جہاد کی نذر کر دیا۔

وہ ایک طویل عرصے تک وادیٔ کشمیر کی وادیوں اور چٹانوں پر غازیوں کے صفِ اول کے مسافر بنے رہے۔ کشمیر کا ایک ایک پہاڑ، ایک ایک غار اور وہاں کی یخ بستہ ہوائیں ان کے سجدوں اور ان کے عزمِ صمیم کی گواہ ہیں۔

وہ ایک ایسا دور تھا جب وادیٔ کشمیر مظلوم ماؤں بہنوں کے تحفظ اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کے نعروں سے گونجتی تھی، اور حبیب الرحمٰن اسی کاروانِ حریت کا دھڑکتا دل تھے۔

لیکن پھر غزوۂ گیارہ ستمبر کے بعد عالمی استعمار کی جانب سے امتِ مسلمہ پر آزمائش کا کوہِ گراں ٹوٹ پڑا۔ اس معرکے کے بعد جب عالمی استعمار اور فرعونی طاقتوں نے اسلام پر یلغار کی تو مسلم دنیا کے حکمرانوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ پاکستان کی دھرتی پر مسلط آمر پرویز مشرف نے خوف، بزدلی اور امریکی خوشنودی کی خاطر ایک ایسا شرمناک اور تاریخی یوٹرن لیا جس نے امت کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔

ریاستی پالیسیوں کا رخ راتوں رات بدل دیا گیا، جہادِ کشمیر پر سرکاری پابندیاں عائد کر دی گئیں، سرحدیں سیل ہو گئیں اور حریت کے پروانوں کو اپنے ہی گھر میں مجرم بنا کر دیوار سے لگانے کی ناپاک کوشش کی گئی۔

یہ وہ کٹھن گھڑی تھی جب اچھے اچھے مصلحتوں کے گورکھ دھندے میں الجھ گئے، ہتھیار ڈال کر بیٹھ گئے یا حالات کا رونا روتے رہے، لیکن حبیب الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ کا خمیر کسی اور مٹی سے اٹھا تھا۔ ان کے نزدیک جہاد کسی زمین، خطے یا حکومتی پالیسی کا محتاج نہیں تھا، بلکہ وہ تو ربِ کائنات کا ابدی حکم تھا۔

جب کشمیر کے راستے مسدود کیے گئے تو انہوں نے وطنی حدود کے بتوں کو پاش پاش کیا اور اپنے ایمان کی چنگاری کو لے کر ہجرت کی راہ لی۔ انہوں نے اس خراسان و افغانستان کے کوہساروں کا رخ کیا جہاں عالمی کفر کا سب سے بڑا بت، امریکہ، اپنی پوری مادی طاقت کے ساتھ دندناتا پھر رہا تھا۔

حبیب الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مادی زندگی میں ایک کٹھن آزمائش ان کی بینائی کی شدید کمزوری تھی۔

میری آنکھوں کے بجھنے سے مایوس نہ ہو
میں نے اس تیرگی کے پار بھی اک جہاں دیکھا

انہیں نظر کی بے حد تکلیف تھی، بینائی اتنی کم تھی کہ رات کے اندھیرے میں ٹارچ کے بغیر ان کے لیے چند قدم چلنا بھی ناممکن ہو جاتا تھا۔ دنیا مادی آنکھوں سے دیکھتی تھی کہ یہ شخص اندھیروں کا قیدی ہے اور چلنے کے لیے بیساکھی یا روشنی کا محتاج ہے، لیکن زمان و مکان کے مالک نے ان کے قلبِ منیر کو بصیرت اور ایمان کے اس لازوال نور سے منور کر رکھا تھا جس کے سامنے دنیا کی تمام مادی روشنیاں، ٹیکنالوجی اور سیٹلائٹ ہیچ تھیں۔

وہ مادی دنیا میں بھلے ایک ٹارچ کے محتاج رہے ہوں، مگر ان کا ایمان انہیں آفاق سے پرے سدرۃ المنتہیٰ دکھاتا تھا جہاں اندھیروں کا کوئی گزر نہیں تھا۔

آج سے بیس سال قبل، ۲۷ جون ۲۰۰۶ء کو افغانستان کے صوبہ ارزگان کی مقدس دھرتی پر، حبیب الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عشق کی آخری اور سب سے بڑی قیمت چکانے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے اپنی بینائی کی ہر کمزوری کو توکل اور استقامت کے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا جہاں مادی وسائل دم توڑ دیتے ہیں۔

انہوں نے مادی دنیا کے تمام بندھنوں کو توڑتے ہوئے ایک عظیم اور تاریخ ساز فدائی معرکہ سرانجام دیا۔

انہوں نے اندھیروں کو چیرتے ہوئے پیش قدمی کی، اور امریکی استعمار کی فرعونی فوج اور ان کے کبر و غرور پر صاعقۂ الٰہی بن کر گرجے۔

وہ محض ایک عسکری حملہ نہیں تھا۔ وہ تو نورِ توحید کا ظلمتِ کفر پر فیصلہ کن وار تھا۔ اس ہولناک معرکے کی گونج نے جہاں صلیبیوں کے تکبر کو خاک و خون میں ملا دیا، وہیں حبیب الرحمٰن شہید ؒ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لافانی بنا دیا۔

جب اس جہادِ مقدس کے میدان سے پہلی بار ان کی خبر ملی،، تو پیغام لانے والوں نے روایتی الفاظ میں موت کا نوحہ نہیں پڑھا، بلکہ پکارنے والوں نے پکار کر رشک و مسرت کے ساتھ یہ مژدہ سنایا کہ:

”مبارک ہو، بھائی حبیب کی شادی ہو گئی ہے جنت میں۔“

آج دو دہائیاں بیت چکی ہیں، مگر اس مردِ حر کے خون کی خوشبو آج بھی برصغیر سے لے کر خراسان کے پہاڑوں تک رچی بسی ہے۔ مادی آنکھوں سے اوجھل ہونے والا وہ مسافر، جو زمین پر ایک ٹارچ کا محتاج تھا، آج رب کے حضور اس مقامِ رفیع پر فائز ہے جہاں اس کی پاکیزہ روح نبی الملاحم، حضرت اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے عین مصداق سبز پرندوں کے قالب میں ڈھل چکی ہے۔

نحسبه كذالك والله حسيبه

وہ روحیں جو عرشِ الٰہی کے سائے تلے لٹکتی ہوئی سونے کی قندیلوں میں بسیرا کرتی ہیں، اور جنت الفردوس کے باغات، لہراتی نہروں، اور عالی شان محلات کی سیر کو ہر پل محوِ پرواز رہتی ہیں، جہاں نہ کوئی اندھیرا ہے اور نہ کسی روشنی کی محتاجی۔

۲۷ جون کا دن امتِ مسلمہ کے نوجوانوں کے لیے ایک ابدی پیغام ہے کہ راہیں بھلے بدل جائیں، حکمران بھلے سودے بازی کر لیں، اور جسمانی اعضاء بھلے ساتھ نہ دیں، لیکن اگر دل میں توحید کا سودا سچا ہو اور محبوب کے رخِ زیبا سے ملاقات کا شوق صادق ہو، تو انسان مٹی کے مادی قید خانوں سے نکل کر عرشِ بریں کا مہمان بن جاتا ہے۔

سلام ہو عزیمت کے اس راہی پر، جس کا خون بیس سال بعد بھی امت کے نوجوانوں کے دلوں میں ایمان کی شمعیں روشن کر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

بقیہ: ٹارچر ورثے میں ملا ہے!

انہوں نے تب کے جو تجربات بتائے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ساتھ والے سیل میں اسرائیلی تفتیش کار ایک خاتون فلسطینی قیدی رمسیا اودے کو ٹارچر کا نشانہ بنا رہے تھے۔

رمسیا کو ”اعترافِ جرم“ پر مجبور کرنے کے لیے اسے برہنہ کر کے والد کے سامنے باندھ دیا گیا۔ والد نے جب بیٹی کو اس حال میں دیکھا تو انہوں نے روتے ہوئے کہا کہ یہ جس بیان پر بھی دستخط کروانا چاہتے ہیں کر دے بھلے تو نے جرم کیا ہے یا نہیں۔ مگر رمسیا نے اصرار کیا کہ وہ بے گناہ ہے۔

عبد اللطیف غائث کے بقول رمسیا کو مسلسل کئی روز ٹارچر کا نشانہ بنایا گیا۔ لگ بھگ دس برس بعد (۱۹۷۹ء) رمسیا کو قیدیوں کے تبادلے کے نتیجے میں رہائی نصیب ہوئی۔

رمسیا نے جنیوا میں انسانی حقوق کمیٹی کے روبرو تفصیلی شہادت میں بتایا کہ کس طرح اسے ڈنڈوں سے ریپ کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ اس کے نازک اعضا اور چہرے پر برقی جھٹکے دیے جاتے رہے، باپ کے ہاتھوں ریپ کی دھمکیاں دی گئیں۔

رمسیا کی گواہی اقوام متحدہ کے ریکارڈ کا باضابطہ حصہ ہے۔ ۱۹۷۹ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ٹارچر کی ممانعت کے عالمی کنونشن کی منظوری دی۔ تاہم کنونشن کی منظوری کے ۴۷ برس بعد بھی دنیا بھر بالخصوص اسرائیل اور مقبوضہ فلسطین میں ٹارچر کم تو خیر کیا ہوتا پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔

نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے بیس برس میں ٹارچر کو ایک ادارہ جاتی شکل مل گئی۔ چنانچہ آج ٹارچر امن و امان قائم رکھنے کے نام پر ایک غیر معمولی طریقے کے بجائے معمول کا ہتھکنڈہ گردانا جاتا ہے۔ اذیت کرنے والوں کو عدالتی سزا ملنے کا تناسب ایک فیصد سے بھی کم ہے۔

[یہ مضمون ایک معاصر روزنامے میں شائع ہو چکا ہے۔ مستعار مضامین مجلے کی ادارتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)]

اپنا اپنا اسماعیل پیش کرو!

مجاہدین تمام اہلِ ایمان کو جنتوں کے اس سفر میں ہمراہی کی دعوت دے رہے ہیں اور انہیں یاد دلا رہے ہیں کہ آج کے دور میں لا الہ الا اللہ کا اقرار کرنے والے ہر فرد کو اسوۂ ابراہیمی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ترین چیز کو پیش کر دو تاکہ جنت کی ابدی زندگی میں وہ تمام نعمتیں جن کا وعدہ اللہ رب العزت نے خود فرمایا ہے، اُس کے حق دار بن سکو۔ گویا بزبانِ حال یہ منادی جاری ہے کہ اپنا اپنا اسماعیل پیش کرو!

حافظ طیب نواز شہید ؒ

الشوک والقرنفل
کانٹے اور پھول ۱۵

شیخ یحییٰ السنوار شہید رحمۃ اللہ علیہ کا شہرۂ آفاق ناول

مجلّہ ’نوائے غزوۂ ہند‘ بطلِ اسلام، مجاہد قائد، شہیدِ امت، صاحبِ سیف و قلم شیخ یحییٰ ابراہیم السنوار رحمۃ اللہ علیہ کے ایمان اور جذبۂ جہاد و استشہاد کو جلا بخشتے، آنکھیں اشک بار کر دینے والے خوب صورت ناول اور خود نوشت و سرگزشت ’الشوک والقرنفل‘ کا اردو ترجمہ، قسط وار شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ یہ ناول شیخ نے دورانِ اسیری اسرائیل کی بئر سبع جیل میں تالیف کیا۔ بقول شیخ شہید اس ناول میں تخیل صرف اتنا ہے کہ اسے ناول کی شکل دی گئی ہے جو مخصوص کرداروں کے گرد گھومتا ہے تاکہ ناول کے تقاضے اور شرائط پوری ہو سکیں، اس کے علاوہ ہر چیز حقیقی ہے۔ ’کانٹے اور پھول‘ کے نام سے یہ ترجمہ انٹرنیٹ پر شائع ہو چکا ہے، معمولی تبدیلیوں کے ساتھ نذرِ قارئین ہے۔ (ادارہ)

بیسویں فصل

غزہ شہر کی وحدت سٹریٹ پر فہمی بک سٹور کے چوراہے پر لوگوں اور گاڑیوں کا ہجوم ہے، یہ مقام ہزاروں غزہ کے باشندوں اور سینکڑوں فوجی اور سول افسران اور خفیہ ایجنسیوں کے اہلکاروں کے لیے ایک مرکزی محور ہے۔

سرایا کی عمارت میں جہاں غزہ کی پٹی میں قبضے کا مرکزی ہیڈ کوارٹر ہے، سڑک گاڑیوں سے بھری ہوئی ہے، اور چونکہ کوئی ٹریفک سگنلز نہیں ہیں جو ٹریفک کو منظم کریں، اس لیے سب کو رکنا پڑتا ہے اور گاڑیاں ایک ایک انچ آگے بڑھتی ہیں۔ ایک فوجی گاڑی جسے غزہ کی پٹی میں اسرائیلی ملٹری پولیس کا کمانڈر چلا رہا ہے، آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے، اور اس نے اپنا بازو گاڑی کی کھڑکی پر رکھا ہوا ہے اور گاڑی کے ریڈیو سے عبرانی زبان میں ایک عجیب موسیقی کے ساتھ گانا بج رہا ہے۔

ہجوم میں سے ”محمد“ آگے بڑھا، جو چند ہفتے پہلے غزہ کی جیل سے فرار ہونے والے نوجوانوں میں سے ایک تھا، جب وہ گاڑی تک پہنچا تو اس نے اپنی پستول نکالی اور اسے پولیس کمانڈر کے سر اور دل کی طرف نشانہ بنایا، اور کئی گولیاں چلائیں، پھر لوگوں کے درمیان غائب ہو گیا، جہاں ایک گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی، جو اسے لے کر وہاں سے دور چلی گئی۔

فوج کی بڑی تعداد نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا اور لوگوں کو حراست میں لینا شروع کر دیا۔ دکانیں بند کروا دیں، مار پیٹ اور توڑ پھوڑ شروع کر دی، خفیہ ایجنسی کے افسران تفتیش کے لیے اور مجرموں کو پکڑنے کے لیے معلومات جمع کرنے کے لیے پہنچ گئے، لیکن یہ معلومات بے سود ثابت ہوئیں۔

چند دن بعد ایک فوجی جیپ شہر کی ایک مرکزی سڑک پر معمول کا گشت کر رہی تھی، آہستہ آہستہ چل رہی تھی، سڑک کے قریب موجود ایک قبر کے پیچھے سے ایک نوجوان، جو چند دن پہلے جیل سے فرار ہوا تھا، نمودار ہوا اور اس نے بدوی قبیلے کی چابی گاڑی پر پھینکی، جس سے گاڑی میں دھماکہ ہو گیا، اور وہ مقام سے فرار ہو گیا، جبکہ زخمی فوجیوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔

چند دنوں بعد کچھ خودکار بندوقوں سے ایک فوجی گاڑی پر فائرنگ کی جانے لگی اور حملہ آور بغیر کسی مشکل کے واپس چلے گئے۔ یہ خبریں مقبوضہ علاقوں میں پھیل گئیں، ہر محلے، ہر گھر، اور ہر مجلس میں گونجنے لگی، سبھی ان حملوں کی سطح اور حملہ آوروں کی جرأت سے متاثر تھے اور قابض فورسز میں جو افراتفری پھیل گئی تھی اس سے خوش تھے۔ یہ ہمارے گھر میں ہونے والی کئی نشستوں میں سے ایک کا موضوع تھا۔

چند دنوں بعد پورا علاقہ بدترین خبروں سے جاگ اٹھا، قابض فورسز اور ان کی انٹیلی جنس نے دو جوانوں کو پکڑنے میں کامیابی حاصل کی جو کہ غزہ کی جیل سے فرار ہو گئے تھے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ حالیہ حملوں کے پیچھے تھے۔ انہیں ایک گھات لگا کر، ہزاروں گولیوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا، جو کہ بریج کیمپ کے شمال میں ایک ذیلی سڑک پر لگایا گیا تھا۔ یہ خبریں یونیورسٹی تک پہنچ گئیں، جس پر ہم نے تعلیم کو معطل کر دیا اور ایک مظاہرہ کیا جس میں فوجیوں کے ساتھ تصادم ہوا، یہ مظاہرے پورے علاقے میں پھیل گئے۔

چند دنوں بعد ۶ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو مغرب کی اذان کے بعد ان جوانوں کا ایک اور گروپ اور ان کے کچھ معاونین اپنی گاڑیوں میں غزہ کے شجاعیہ محلے کی ایک سڑک پر حرکت کر رہے تھے، جب ان پر کئی سول گاڑیوں نے حملہ کر دیا اور فائرنگ شروع کر دی۔ پھر بڑی فوجی فورسز بھی شامل ہو گئیں اور جوانوں کے ساتھ جھڑپ شروع ہوئی جس میں انٹیلی جنس کا ایک افسر مارا گیا جو کہ اس آپریشن کی نگرانی کر رہا تھا، تمام جوان شہید ہو گئے اور محلے میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

ابراہیم میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ وہ عثمان مسجد میں نماز جمعہ کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اکٹھا کریں گے، اور وہاں سے ایک عظیم الشان مظاہرہ شہداء کی یاد میں اور ان کی حرمت کے لیے نکلے گا۔ اس نے مجھے جانے کی ترغیب دی، بڑی تعداد میں نوجوان مسجد میں جمع ہوئے اور وہاں نماز جمعہ ادا کی۔ خطبہ اور نماز دونوں معمول کے مطابق تھے، جب نماز ختم ہوئی اور نمازی مسجد سے نکلنے لگے تو کچھ سرگرم کارکن ابراہیم کے گرد جمع ہو گئے اور نعرے لگانے لگے

بالروح بالدم نفديك يا فلسطين...... بالروح بالدم نفديك يا شهيد

”اپنی جان اور اپنے خون سے ہم تم پر قربان اے فلسطین...... اپنی جان اور اپنے خون سے ہم تم پر قربان اے شہید!“

لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور ایک عظیم الشان مظاہرہ شجاعیہ کی سڑکوں پر پھیل گیا، شہداء کے خاندانوں کے گھروں اور ان کے لیے لگائے گئے تعزیتی خیموں کے پاس سے گزرتا ہوا، جب بھی یہ مظاہرہ کسی ایسی جگہ پہنچتا تو رُک جاتا اور نعرے بلند ہو جاتے۔

چند منٹوں کے بعد فوج کی بڑی تعداد وہاں پہنچ گئی اور ان کے ساتھ جھڑپیں شروع ہو گئی، جن میں پتھر اور خالی بوتلیں پھینکی گئیں۔ یہ جھڑپیں شام تک جاری رہیں۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس علاقے میں اس طرح عوامی مظاہرے نکلے، جو بغیر کسی شک وشبہ کے مسلح جدوجہد کی حمایت میں تھے، یہاں تک کہ میرے بھائی محمود نے جب ہم اس دن شام کو گھر میں جمع ہوئے تو کہا: تم سب پاگل ہو، اس طرح کے مظاہرے کیسے نکل سکتے ہیں جو مسلح جدوجہد کی واضح حمایت میں ہوں۔

☆☆☆☆

محمد کی منگیتر نے اپنی پڑھائی اور امتحانات مکمل کر لیے تھے اور محمد شادی کی تیاریاں کرنے کے لیے غزہ سے واپس آ گیا تھا، اس نے رام اللہ میں ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور اسے تمام ضروریات سے آراستہ کیا۔ میری ماں ایک بھرپور اور مکمل شادی کی تقریب چاہتی تھی، لیکن محمد اور ابراہیم ایک سادہ اور چھوٹی خاندانی تقریب چاہتے تھے، اختلافات شدت اختیار کر گئے، محمد رام اللہ میں شادی کرنا چاہتا تھا تاکہ خاندان اور قریبی رشتہ دار دو یا تین گاڑیوں میں رام اللہ جا سکیں اور وہاں تقریب ہو کر معاملات آسانی سے نمٹ جائیں، ابراہیم چاہتا تھا کہ تقریب سادہ ہو اور گھر میں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ ہو تاکہ میری ماں اور بہن بھائی اور ہمارے پڑوسی خوش ہو سکیں۔ محمود اور حسن کے لیے یہ معاملہ زیادہ اہم نہیں تھا، ان کے لیے یہ اہم تھا کہ سب متفق ہو جائیں۔ فاطمہ اور تہانی میری ماں کے ساتھ تھیں، جبکہ میں اور مریم محمد اور ابراہیم کے ساتھ تھے۔ آخر کار سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ ہمارے خاندان سے ایک چھوٹا گروپ رام اللہ جائے گا تاکہ محمد اور اس کی دلہن کا نکاح ہو سکے، اور پھر دلہن اور اس کے خاندان کے جو لوگ چاہیں غزہ آ جائیں گے جہاں ابراہیم اور مریم کا نکاح ہو گا۔ خواتین کی جانب سے شادی کی تقریب جیسی وہ چاہتی ہیں منعقد ہو گی، اور اگلے دن محمد اور اس کی دلہن دوبارہ رام اللہ جا سکیں گے۔ تمام امور منصوبے کے مطابق بغیر کسی مشکلات کے مکمل ہو گئے، اس سے پہلے مجھے اور ابراہیم کو ہمارے مشترکہ کمرے سے منتقل ہونا پڑا، جہاں اس کے اور اس کی دلہن کے لیے انتظام کیا گیا تھا، اور مجھے عارضی طور پر مہمانوں کے کمرے میں رہنا پڑا۔ شادی کے بعد میں اپنی ماں کے ساتھ ان کے کمرے میں رہنے لگا۔ یہ واضح ہو گیا کہ یہ گھر تین جوان خاندانوں اور میری ماں کے لیے ناکافی ہو گا۔ انجینئر محمود نے گھر کے اوپر ایک دوسری منزل بنانے کی تجویز دی، اور ہمیں بتایا کہ تھوڑی محنت اور انتظار کے ساتھ یہ انجینئرنگ کے لحاظ سے ممکن ہے۔ ابراہیم نے اس کی تجاویز سے اتفاق کیا اور کہا کہ وہ اس پر عمل درآمد کر سکتا ہے، چنانچہ سب نے فیصلہ کیا کہ شادی کے دو ماہ بعد اس پر کام شروع کیا جائے گا۔

☆☆☆☆

اسی سال آٹھ دسمبر کی شام، جب ایک بس میں کئی فلسطینی مزدور اپنے کام سے واپس غزہ جا رہے تھے، اور بس حاجز ایریز کے قریب پہنچ چکی تھی، تو سڑک کے دوسری طرف سے ایک بڑی گاڑی جسے ایک صہیونی چلا رہا تھا، تیزی سے شمال کی طرف جا رہی تھی۔ جب وہ بس کے قریب پہنچی، تو اچانک بس کی طرف مڑ گئی اور اسے کچل دیا۔ اس حادثے میں کئی مزدور ہلاک ہو گئے اور دیگر زخمی ہو گئے۔ ہلاک شدگان کو ان کے گھروں میں اور زخمیوں کو ہسپتالوں میں منتقل کر دیا گیا، یہ خبر غزہ میں تیزی سے پھیل گئی کہ یہ حادثہ جان بوجھ کر مزدوروں کو قتل کرنے کے لیے کیا گیا تھا، ہزاروں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور اس حادثے کے بارے میں باتیں کرنے اور معلومات حاصل کرنے لگے۔

ایک نوجوان شیخ احمد کے گھر چپکے سے داخل ہوا تاکہ انہیں معاملے کی اطلاع دے اور سادہ طریقے سے پوچھے کہ کیا کرنا چاہیے۔ شیخ نے ان جنازوں کو بڑے پیمانے پر مظاہروں اور قابض فوج کے ساتھ شدید تصادم کی طرف لے جانے کا مشورہ دیا۔ وہ نوجوان انتظامات کرنے کے لیے نکل پڑا، جب جبالیا سے جنازے نکلے تو ان کے پیچھے ایک بڑی جماعت جمع ہو گئی، جو نعرے، تکبیریں اور تسبیحات بلند کر رہی تھی۔ قابض فوج آئی اور شدید تصادم شروع ہو گیا جو آدھی رات تک جاری رہا۔ جب ابراہیم رات کو گھر واپس آیا تو اس نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ اگلے دن اسلامی یونیورسٹی مظاہروں کا مرکز ہو گی اور ان لوگوں نے اپنے انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ صبح کے وقت اسرائیلی ریڈیو نے اعلان کیا کہ غزہ کے فوجی حاکم نے اسلامی یونیورسٹی کو تین دن کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ابراہیم نے اپنی گاڑی میں مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور کارکنان کو مطلع کیا کہ منصوبہ تبدیل کر دیا گیا ہے اور مظاہروں کو یونیورسٹی کی بجائے تمام علاقوں میں منتقل کیا جائے گا، ہر گروپ کو اپنے علاقے میں صورتحال کو بھڑکانا تھا۔

نصف دن کے دوران غزہ کا پورا علاقہ شمال سے جنوب تک قابض فوج کے خلاف آگ کی طرح بھڑک اٹھا، ہر علاقے میں ہزاروں لوگوں نے شدید مظاہرے کیے اور قابض فوج کے ساتھ شدید تصادم ہوا۔ ہر علاقے میں درجنوں زخمی ہوئے، زخمیوں کو ہسپتالوں یا قریبی کلینکس میں منتقل کیا گیا، ہر نئے زخمی کے ساتھ عوامی جذبات مزید بھڑک اٹھتے اور ان کا غصہ زیادہ ہو جاتا۔ جبالیا کے کیمپ میں انتفاضہ کا پہلا شہید، حاتم السیسی، شہید ہوا، دوسرے دن جمعرات کی صبح ہی سے واقعات پھوٹ پڑے، درجنوں نقاب پوش نوجوان سڑکیں بند کرنے لگے، رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور ان مزدوروں کی راہ روکی جو ۱۹۴۸ء میں مقبوضہ ہونے والے علاقوں کی طرف کام کے لیے جا رہے تھے۔ قابض فوج نے سڑکیں کھولنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار جب ایک سڑک کھولی جاتی تو دوسری جگہ بند ہو جاتی، نقاب پوش

نوجوان قابض فوج پر پتھر اور خالی بوتلیں پھینک کر تصادم کر رہے تھے، دوپہر کے وقت پورے علاقے میں بڑے پیمانے پر ریلیاں نکلی، جن میں فلسطینی پرچم اٹھائے گئے، فلسطین اور شہداء کے نعرے لگائے گئے اور یہودی آبادکاری کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔

ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر میں جلدی سے داخل ہوا اور اپنے بیٹے کے کمرے میں گیا جو ابھی تک صبح دس بجے کے بعد بھی سو رہا تھا، تم ابھی تک سو رہے ہو؟ نوجوان نے حیرت سے اپنے والد کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں ملتے ہوئے سوچا، مجھے مظاہروں اور تصادم میں شرکت کے لیے جگا رہے ہیں میرے والد؟ وہ والد جو چند دن پہلے تک قابض فوج کے خلاف کسی بھی کارروائی کی خبر سے کانپتے تھے اور ہمارا گھر بند کر دیتے تھے؟ اس دنیا میں ایسا کیا ہوا کہ یہ بڑی تبدیلی آئی؟ مسجد کے قریب سے لاؤڈ اسپیکر پر یہ آواز آ رہی تھی:

قسماً بالله الجبار، لتعودي يادار،
باسم الدين، على فلسطين، ليفر الغدار،
مشينا الدرب، خضنا الصعب، تخطينا الحدود،
مهما الشوك، الصبر المر، لتعودي يا دار

"اللہ جبار کی قسم! اے وطن، تو ضرور لوٹے گا۔
دین کے نام پر، فلسطین میں، تاکہ غدار بھاگ کھڑا ہو۔
ہم اس راہ پر چلے، دشواریاں جھیلیں، اور حدیں پار کر گئے۔
کانٹے کتنے ہی ہوں، صبر کتنا ہی تلخ ہو، اے وطن، تو ضرور لوٹے گا۔"

ہر چوراہے پر یا ہر راستے کے کنارے سینکڑوں نوجوان، جو اپنے ساتھ لائی ہوئی یا مستعار لی ہوئی کوفیہ پہنے ہوئے تھے، رکاوٹیں کھڑی کرتے، ٹائر جلاتے اور قابض فورسز سے ٹکراتے تھے۔ آنسو گیس کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ناک مسلسل بہہ رہی تھی، وہ فوراً گری ہوئی گیس کی شیل دوبارہ قابض فوجیوں کی طرف پھینک دیتے تھے تاکہ وہ بھی گیس کا مزہ چکھیں۔ درجنوں کی تعداد میں ایک زخمی کو اٹھاتے تھے جسے گولی لگی ہوتی تھی۔ گولیوں کی آوازیں جنگ کی طرح ہوتی تھیں اور مظاہرین کی چیخ و پکار، کوئی کسی سے مدد مانگتا اور مساجد کے لاؤڈ اسپیکر حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ ابراہیم اپنی گاڑی لے کر نکلا، میں نے اسے پکارا: کہاں جا رہے ہو، ساری سڑکیں رکاوٹوں سے بھری ہوئی ہیں؟ پیدل ہی چلے جاؤ اپنے کام پر۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا: فکر نہ کرو احمد، فکر نہ کرو۔ میں اسے دیکھنے لگا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ جیسے ہی وہ پہلی رکاوٹ پر پہنچا، مظاہرین نے فوراً اسے راستہ دیا، جلتے ہوئے ٹائر کو لوہے کی لمبی سلاخوں سے ہٹایا جو انہوں نے اس مقصد کے لیے تیار کی تھی، اس نے ایک کے بعد ایک رکاوٹ پار کی جیسے وہ معرکے کا اولین قائد ہو، شاید وہ یہی تھا۔

اس دن عصر کے وقت ہم تقریباً تیس نوجوان اکٹھے ہو گئے، ایک گشتی فوجی دستہ، تقریباً بیس فوجیوں پر مشتمل آ گیا، ہم فوراً گلیوں کے کونوں پر بٹ گئے اور جیسے ہی وہ سڑک کے درمیان پہنچے، پتھر بارش کی طرح ان پر برسنے لگے۔ انہوں نے ہوش و حواس کھو کر ہر سمت میں گولیاں برسانا شروع کر دیں، گولیوں کی آواز سن کر سینکڑوں مرد اور عورتیں باہر نکل آئے اور سب نے قابضین پر پتھراؤ شروع کر دیا، جنہیں پاگل پن نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ بے تحاشہ گولیاں چلا رہے تھے، زخمی گرنے لگے اور پتھروں کی بارش جاری رہی۔ ایک فوجی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت تھا، اس کے کندھے پر ایک بھاری وائرلیس سیٹ تھا، وہ مدد کے لیے بلا رہا تھا، اس نے مزید گولیاں چلانے کی کوشش کی، لیکن اس کی ٹانگیں اسے سنبھال نہیں سکتی تھیں اور وہ زمین پر گر کر عبرانی میں اپنی ماں کو پکارنے لگا: אמא (ایما) یعنی میری ماں، اے ماں! بیسیوں جیپیں مدد کے لیے دوڑیں، راستے میں ہر گلی سے مظاہرین سے ٹکرائیں، بڑی محنت کے بعد پہنچیں اور اپنے فوجیوں کو پتھراؤ کے درمیان ڈھونڈ لیا۔ درجنوں بلکہ سینکڑوں زخمی دار الشفاء ہسپتال پہنچے، کچھ ایمبولینسز میں اور زیادہ تر شہریوں کی گاڑیوں میں، دروازے کھلے ہوئے اور درجنوں لوگ زخمی کے ساتھ لٹکے ہوئے، ہزاروں لوگ خون میں تربتر ہسپتال کے مدخل پر ہو گئے، بازوؤں سے خون بہہ رہا تھا اور طبی عملہ انہیں پیچھے دھکیلنے لگا۔ وہ چیخ رہے تھے کہ یہ ہماری صلاحیت اور ہسپتال کی گنجائش سے کہیں زیادہ ہے۔ جب بھی کوئی گاڑی زخمی کو لے کر آتی، ہارن بجاتی یا سائرن بجاتی، ہسپتال کے مدخل پر لوگوں کا سمندر خود بخود حرکت میں آ جاتا، پورا ہجوم یک آواز ہو کر نعرے لگاتا، فلسطین، شہداء، زخمی اور قبضے کے خلاف اور اس کے لیڈروں اور ان کے کرتوتوں کے خلاف۔ بڑی تعداد میں فوجی ہسپتال کی علاقے میں پہنچنے لگے اور مظاہرین پر بے پناہ آنسو گیس اور گولیاں چلانے لگے۔ ہزاروں پتھر فوجیوں پر برسنے لگے، فائرنگ میں اضافہ ہو گیا اور ہجوم پیچھے ہسپتال کے اندر چلا گیا۔ یک آواز ہو کر نعرے بلند ہوئے: "الله اكبر، الله اكبر، خيبر خيبر يا يهود، جيش محمد سوف يعود، الله اكبر، بسم الله، الله اكبر"۔ فوجی ان کے پیچھے ہسپتال کے مدخل کی طرف دوڑ پڑے، سب دوبارہ آگے بڑھے اور نوجوان اپنے ہاتھوں میں پتھر لے کر تیار ہو گئے۔ اس ہجوم کے سامنے فوجی پیچھے ہٹنے لگے، ایک فوجی زمین پر گر گیا، اور لوگ اسے مارنے اور لاتیں مارنے لگے، اس کے ہتھیار اور فوجی سامان چھین لیا اور اسے زیر جامہ میں بھاگنے دیا، پھر جب ایک عقل مند نے خبردار کیا کہ ہتھیار رکھنے سے وہ ہزاروں کو مار سکتے ہیں، ان کا ہتھیار پھینک دو تو اس کا ہتھیار پھینک دیا۔

عوام کا حوصلہ آسمانوں کو چھو رہا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ اسرائیلی فوج کا افسانہ فلسطینیوں کے شدید غصے کے پتھروں کے آگے ٹوٹ رہا ہے، اور جھڑپوں، شہداء، زخمیوں اور بہادری کی کہانیاں ہر گھر اور ہر جگہ تک پہنچ رہی ہیں، جو نوجوانوں اور لڑکوں میں قربانی اور ایثار کی روح کو بھڑکا رہی ہیں۔

شام میں ابراہیم نے شیخ احمد سے شیخ کے گھر میں ملاقات کی، جہاں شیخ نے بیان کا متن لکھوایا جو اگلے دن جمعہ کی نماز میں مسجدوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ ابراہیم نے اس وقت چھپائی کا عمل شروع کیا جب اصل نسخہ تیار کیا گیا تھا۔ پھر ایک خفیہ پرنٹنگ پریس، جو ایک ایسے اسٹور میں چھپایا گیا تھا جو پرانے سامان کا گودام لگتا تھا، وہاں سے ہزاروں نسخے چھپنے لگے۔ ہر ایک گروپ کو پیک کیا گیا اور پھر یہ نسخے ابراہیم نے اپنی کار کی ڈگی میں رکھے اور عمومی سڑک پر

آگے بڑھنے لگا۔ اس کے آگے ایک اور گاڑی چل رہی تھی تاکہ وہ اچانک کسی چیک پوسٹ میں نہ پھنس جائے۔ آگے والی گاڑی نے پچھلے شیشے پر خاص لائٹس لگا رکھی تھیں تاکہ پچھلی گاڑی اسے دیکھ سکے اور کسی چیک پوسٹ پر رکنے یا سست ہونے سے پہلے خبردار ہو جائے۔ پہلے والی گاڑی کے پاس کوئی ممنوعہ چیز نہیں تھی، اس لیے وہ آسانی سے چیک پوسٹ پار کر سکتی تھی، دونوں گاڑیاں پمفلٹ تقسیم کرنے لگیں، جہاں ابراہیم ہر علاقے کی ایک مسجد میں پمفلٹس کا ایک بنڈل رکھتا اور پھر اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا، کچھ دیر بعد ایک نوجوان آکر ان پمفلٹس کو ایک مخصوص جگہ چھپا دیتا تاکہ اگلے دن جمعہ کی نماز کے بعد لوگوں کے سامنے آئیں۔

جمعہ کے دن جب نمازی نماز ختم کر کے مسجد سے نکل رہے تھے، تو انہیں زمین پر پمفلٹس کے ڈھیر ملے، ہر ایک پتھر پر رکھا ہوا تھا، ہر کسی نے اپنے گھر جاتے وقت پڑھنے کے لیے ایک نسخہ اٹھایا، یہ بیان "حركة المقاومة الاسلامية" کے نام سے دستخط شدہ تھا جس کا عنوان تھا "و أنا الغريق فما خوفي من الغرق" (میں تو پہلے ہی ڈوب چکا ہوں تو اب ڈوبنے سے کیا ڈرنا؟) اور اس میں لوگوں کو مزاحمت اور جدوجہد کی روح جگانے کی کوشش کی گئی تھی، اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور احتجاج کے لیے اکسایا، اور یوں ہجوم بڑھتا گیا، نعرے بازی کی آواز بلند ہونے لگی، اور لوگ اسرائیلی قبضے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہزاروں افراد ہر علاقے میں شہروں اور کیمپوں کی سڑکوں پر نکل آئے۔ اس دن ہم بھی ایک مظاہرے میں شامل ہو گئے جو مسجد سے شروع ہوا تھا، اور یوں مظاہرے کیمپس کی سڑکوں سے ہوتے ہوئے مین روڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ جیسے جیسے ہم فوجیوں کے قریب پہنچتے گئے، وہ اور فائرنگ کرتے، لوگوں کا حوصلہ اور بڑھتا گیا، جس کی وجہ سے فوجیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا، یہاں تک کہ ہم سرائے کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں فائرنگ بہت زیادہ ہونے لگی، ایک ہیلی کاپٹر مظاہرین کے اوپر آکر آنسو گیس کے بادل چھوڑنے لگا، اس دن مجھے لگا کہ غزہ کا بیشتر حصہ اور اس کا کیمپ آزاد ہو گیا ہے، بس سرائے کی عمارت اور اس کے ارد گرد ہی فوجی موجود تھے، اور یہی صورتحال پورے علاقے میں تھی۔

بلاطہ نامی کیمپ جو نابلس شہر کے قریب واقع ہے، وہاں مہینوں تک بارڈر گارڈز کے فوجیوں کے ظلم و ستم جاری رہے، جن میں زیادہ تر دروز برادری سے تھے، انہوں نے علاقے کی عورتوں اور لڑکیوں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا تھا، کیمپ میں پچھلے مہینوں سے مسلسل غم و غصہ کی کیفیت تھیں اس دوران غزہ کے واقعات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور لوگ جمعہ کے دن مظاہرہ کرنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے، جو کہ اسرائیلی فوج کے ساتھ شدید تصادم میں بدل گیا۔ اسی طرح کی صورتحال بیت لحم کے قریب واقع الدہیشہ کیمپ میں بھی دیکھنے کو ملی۔

☆☆☆☆

اسی دوران بیر زیت یونیورسٹی کو فوجی حکم کے تحت بند کر دیا گیا، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے محمد اور اس کی بیوی ہمارے پاس غزہ آئے اور چند دن کے لیے ہمارے ساتھ رہے۔ عام ہڑتالوں کی حالت میں، بہت سے لوگوں نے ایک دوسرے سے ملنے کا موقع تلاش کیا، اس دوران، فاطمہ بھی اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ ہمارے گھر آئی اور ہم سب اکٹھے ہو گئے۔ گھر مردوں، عورتوں، بچوں اور بچیوں سے بھر گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب ہم بچے تھے، ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے اور اب ہماری چھوٹی سی فیملی ایک فوج کے مانند ہو گئی ہے۔ میں نے مذاق میں یہ بات کہی، تو میری ماں نے کہا: نبی پر درود بھیجو، پھر سب نے کہا: اللهم صل على سيدنا محمد۔

دوپہر کے کھانے کے دوران جو کہ ایک دعوت کے مانند تھا، ایک لمبی سیاسی بحث چھڑ گئی کہ کیا ہو رہا ہے اس کا فائدہ ہے یا نقصان؟ مختلف آراء تھیں، کچھ حمایت میں تھے، کچھ مخالفت میں، کچھ خوفزدہ تھے اور کچھ نتائج پر پراعتماد تھے۔ میرا بھائی محمود یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب جلد ہی ختم ہو جائے گا جب لوگ اپنا غصہ نکال لیں گے اور یہ کچھ فائدہ مند نہیں ہو گا۔ ابراہیم خاص طور پر اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ یہ لہر جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ شام کو اسرائیلی ٹیلی ویژن کے عربی نیوز بلیٹن میں وزیر اعظم اسحاق شامیر کی تقریر آئی، جس میں اس نے کہا کہ فلسطینی لوگ تشدد سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے اور یہ تشدد بیکار ہے اور اسے سختی سے نمٹا جائے گا۔

محمود نے ابراہیم سے کہا: دیکھا، میری بات سچ ثابت ہوئی؟ ابراہیم ہنستے ہوئے بولا، بھائی! اس آدمی نے پہلی بار تسلیم کیا ہے، تم دیکھ نہیں رہے کہ اس نے ہمیں فلسطینی عوام کہا ہے؟ کیا تم نے پہلے کبھی شامیر یا دوسرے دائیں بازو کے اسرائیلی رہنماؤں سے سنا ہے کہ وہ ہمیں فلسطینی عوام کہیں؟ کل تک شامیر ہمیں علاقے کے لوگ یا غزہ، یہودا اور سامریہ کے باشندے کہتا تھا، لیکن آج اس نے ہمیں فلسطینی عوام کہا ہے۔ محمود نے اپنے کھانے میں مصروف ہونے کا بہانہ کیا تاکہ گفتگو کو جاری نہ رکھے یا اپنی شکست ظاہر نہ کرے۔

رات کے دوران مرد حضرات کے ایک گروہ نے شیخ احمد کی سربراہی میں اجتماع کیا اور مظاہرے کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ شیخ احمد نے اپنی رائے بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ قوم ایک عظیم قوم ہے اور وہ ہر قیمتی چیز کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے، اس نے پہلے بھی ثابت کیا ہے اور دوبارہ بھی ثابت کرے گی کہ وہ توقع سے زیادہ تیار ہے، بلکہ کئی گنا زیادہ۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ یہ بغاوت اور انتفاضہ ایک مستقل حالت میں بدل جائے، تاکہ یہ فلسطینی قوم کی روزمرہ زندگی کا محور بن جائے، ہماری زندگی کا ہر پہلو اس محور کے ساتھ مطابقت کرے، چاہے وہ تعلیم ہو، کام ہو، صحت ہو یا زندگی کے دیگر معاملات، یہاں تک کہ ہم اپنے اہداف حاصل کر لیں، یعنی قبضے کا خاتمہ اور وطن کی آزادی۔ انہوں نے کہا: ہم نے اللہ کی برکت سے اس مرحلے کے لیے سالوں کی محنت اور تربیت کی ہے، اور اب ہم نے آغاز کیا ہے، ہمیں رکنا نہیں چاہیے اور پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے، بلکہ آگے بڑھنا ہے اور اپنے کام کے معیار کو بلند کرنا ہے، اور مرحلہ بہ مرحلہ اپنے اہداف کی طرف بڑھنا ہے، ہماری قوم یہ ثابت کرے گی کہ وہ اس مقصد کے لائق ہے اور اللہ کی برکت سے کامیاب ہو گی۔

☆☆☆☆

حسن اور حسین دونوں بھائی محلے کی مسجد میں عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے، واپسی کے دوران حسین نے اپنے بھائی حسن سے کہا: کل کے واقعات آج کی طرح ہوں گے، یقینی طور پر مقابلے ہوں گے، زخمی لوگ گریں گے، اور انہیں الشفاء ہسپتال منتقل کیا جائے گا، جہاں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو جائیں گے، اور قابض افواج آئے گی اور لوگوں کو منتشر کرے گی۔ حسن نے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: اگر ایسا ہے تو ہمیں ابھی سے تیار ہونا چاہیے۔ حسین نے حیرت سے پوچھا: کیسے؟ حسن نے کہا: میرے ساتھ آؤ! وہ گھر گئے اور ایک بڑا پلاسٹک کا گیلن لیا، قریبی پٹرول پمپ پر گئے اور جو پیسے ان کے پاس تھے، ان سے پٹرول خریدا، پھر وہ واپس محلے کے کنارے کی ایک خالی جگہ پر گئے، جہاں انہوں نے بڑی تعداد میں خالی بوتلیں جمع کیں اور ان میں پٹرول بھرنے لگے۔ انہوں نے تقریباً چالیس بوتلیں بھریں، پھر کپڑے کے ٹکڑے کاٹ کر انہیں بوتلوں کے منہ میں ڈال دیا، تاکہ پٹرول تک پہنچ سکیں، پھر انہوں نے بوتلوں کو صندوقوں میں رکھا، اور ایک صندوق حسن نے اٹھایا اور دوسرا حسین نے، اور وہ دار الشفاء ہسپتال کی طرف روانہ ہوئے، وہاں انہوں نے صندوقوں کو ایک زیتون کے درخت کے نیچے چھپا دیا اور واپس گھر چلے گئے۔ صبح کے وقت شہر میں شورش برپا ہوئی اور زخمیوں کو الشفاء ہسپتال منتقل کیا گیا۔ لوگوں کی بھیڑ ہسپتال کی طرف بڑھنے لگی اور دکانوں میں نعرے بازیاں شروع ہو گئیں ''خیبر خیبر یا یهود جیش محمد سوف یعود'' جیسے نعرے گونجنے لگے۔

دوپہر کے وقت بڑی تعداد میں قابض فوجی دستے ہسپتال کے علاقے کو گھیرنے لگے اور مظاہرین پر حملہ شروع کر دیا، حسین ہسپتال میں موجود تھا اور قابض فوجیوں کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب فوجی جمع ہونا شروع ہوئے تو اس نے اندر سے بوتلیں تیار کرنی شروع کیں اور ہسپتال کی دیوار کے ساتھ ایک خالی ڈرم رکھا، فوجی آگے بڑھے اور مظاہرین سے جھڑپ شروع ہو گئی۔ حسین نے ڈرم کو دیوار کے ساتھ رکھا اور ایک بوتل اٹھا کر ڈرم پر چڑھ گیا۔ اس نے بوتل کو آگ لگا کر ایک فوجی جیپ کی طرف پھینک دیا جس پر پتھراؤ ہو رہا تھا۔ بوتل ٹوٹ گئی اور جیپ پر آگ لگ گئی۔ فوجی چیخنے لگے اور پیچھے ہٹ گئے، وہ اس جگہ پر فائرنگ کر رہے تھے جہاں سے بوتل آئی تھی، حسین نے ڈرم کو پیچھے ہٹایا جبکہ فوجی پتھراؤ اور بوتل کی جگہ پر مشغول تھے، اس نے دوسری بوتل اٹھا کر آگ لگائی اور ان کی طرف پھینکی، اس طرح آگے پیچھے بوتلیں پھینکتا رہا اور مظاہرین کی بڑی تعداد پتھراؤ کرتی رہی۔ جھڑپیں سورج غروب ہونے کے بعد تک جاری رہیں، حسین نے اکیلے ہی اس دن چالیس بوتلیں پھینکی اور اس کا بھائی حسن بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔

رات کو ایک لڑکے نے اپنے والد کی ہتھوڑی اور کچھ کیلیں اٹھالیں اور کچھ چھوٹے لکڑی کے ٹکڑوں میں کیلیں ٹھونکنے لگا۔ اس نے ان لکڑی کے ٹکڑوں کو اس راستے میں نصب کیا جہاں سے فوجی جیپیں گزرتی تھیں، تاکہ کیلوں کا نوک دار حصہ اوپر ہو اور فوجی گاڑیوں کے ٹائروں کو نقصان پہنچائے۔ وہ دونوں دور بیٹھ کر اپنے کام کا نتیجہ دیکھنے لگے۔ جب فوجی جیپیں تیزی سے مظاہرین کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچی تو چار گاڑیوں کے ٹائر پنکچر ہو گئے اور وہ رک گئیں جس سے باقی گاڑیوں کا راستہ بھی بند ہو گیا۔ لڑکے خوشی سے اچھلنے لگے اور نعرے لگاتے رہے ''خیبر خیبر یا یهود جیش محمد سوف یعود'' انہیں یہ خیال نہیں آیا کہ انہیں کیلوں کو بھی وہاں سے ہٹانا چاہیے تھا جو انہوں نے پیچھے چھوڑ دی تھیں۔ ابراہیم شام کے وقت اپنی گاڑی اس کچے راستے پر چلا رہا تھا کہ اچانک اس کی گاڑی کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا، وہ نیچے اتر کر وجہ جانچنے لگا، اس نے جیک نکالا اور پنکچر ٹائر کو ٹھیک کرنے لگا۔ غصے سے بھرا ہوا اور اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک تھی، جب اس نے ٹائر اٹھایا اور کیل کو دیکھا جو ایک لکڑی کے ٹکڑے میں پھنسی ہوئی تھی، تو وہ ہنستے ہوئے بولا: شعب جبار، شعب جبار۔ اس نے ٹائر بدل دیا اور حسن کی ورکشاپ کی طرف بڑھا جہاں اس نے حسن سے مضبوط تاروں کے ہزاروں چھوٹے ٹکڑے تیار کرنے کو کہا۔ حسن نے ہر ٹکڑے کو چند سینٹی میٹر لمبائی میں کاٹا، پھر درمیان سے اسے ایک زاویے پر موڑ دیا اور ہر دو ٹکڑوں کو برقی ویلڈنگ سے جوڑ دیا، اس طرح ہر ٹکڑا پرندے کے پاؤں کی طرح ہو گیا جو زمین پر ٹک سکے۔ حسن نے چند گھنٹوں میں بڑی مقدار میں یہ ٹکڑے تیار کر لیے، ابراہیم کو بلایا کہ وہ انہیں لینے آئے اور اسے گھر چھوڑ دے۔ پھر ابراہیم نے انہیں مختلف علاقوں میں سرگرم کارکنوں میں تقسیم کیا تاکہ وہ انہیں قابض فوجی گاڑیوں کے سامنے جب وہ نقاب پوشوں کا پیچھا کرنے نکلیں پھینک سکیں۔

اگلے دن جہاں بھی اور جب بھی قابض فوجی گاڑیاں گزرتیں، ان کے ٹائر پنکچر ہو چکے ہوتے اور گاڑی ایک طرف جھکی ہوئی ہوتیں۔ فوجی خود کو جال میں پھنسا ہوا محسوس کر رہے تھے، نہ وہ آگے بڑھ سکتے تھے نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے، اور نہ ہی وہ اس حالت میں رہ سکتے تھے۔ وہ مدد طلب کرتے اور مزید فوجی آجاتے جو کہ مظاہرین اور رکاوٹوں سے ٹکراتے، یا ان کا بھی وہی انجام ہوتا جو ان کا ہوا تھا جن کی مدد کو وہ آئے تھے۔ یہ ایک بہت ہی مزے دار اور مضحکہ خیز دن تھا، ان کی گاڑیوں کی حالت سے ایسا لگتا تھا کہ ان کی زیادہ تر ربڑ کے ٹائر والی گاڑیاں ناکارہ ہو گئی تھیں یا جو بچی تھیں وہ بھی کام کرنا چھوڑ چکی تھیں۔

انہوں نے لوہے کی پٹریوں والے ٹینکوں کو میدان میں اتارا، جس سے لوگوں کے حوصلے بلند ہوئے جب انہوں نے دیکھا کہ دشمن الجھ رہا ہے اور ہسٹیریا میں مبتلا ہو رہا ہے۔ اس سے لوگوں کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ ہم اس کام کے دوران ایک خطرناک کھیل کھیل رہے تھے جس میں ایک چابی کے سوراخ میں کیل ٹھونک کر اسے ایک دیوار پر زور سے مارتے تھے، اس سے چابی کے سوراخ میں موجود سلفر جو کہ ماچس کی تیلیوں سے نکالا گیا ہوتا تھا، دھماکے سے جل اٹھتا اور ایک بہت زوردار دھماکہ ہوتا۔ یہ کھیل کیمپ کے بچوں میں بہت مشہور تھا جس کی وجہ سے اکثر والدین اپنے بچوں کو اس کھیل سے روکنے کے لیے مارا کرتے تھے، کیونکہ یہ خطرناک اور پریشان کن تھا۔ اس کھیل کا خلاصہ یہ تھا کہ سلفر کی مقدار کو ایک تنگ جگہ میں جمع کرنے سے ایک دھماکہ پیدا ہوتا تھا، اس کا استعمال صاف کرنے والے ہتھیار کے طور پر مقبوضہ علاقوں میں کیا جاتا تھا، جس نے ابتدائی دستی بم بنانے کے خیال کو جنم دیا۔

جبالیہ کیمپ کے تین نوجوان، جن میں سے ایک "پلمبر" کے طور پر کام کرتا تھا، سلفر کے ساتھ دستی بم بنانے میں مصروف تھے، ایک پہلے سے تیار شدہ سوراخ سے وہ ایک لچک دار پٹی داخل کرتے، جس کی درجنوں تعداد بڑی احتیاط سے تیار کی گئی تھیں، کیونکہ کوئی بھی غلطی یا زائد رگڑ ایک چنگاری پیدا کر سکتی تھی جو ان کے ہاتھوں میں بم کے پھٹنے کا سبب بن سکتی تھی، پھر انہوں نے انہیں تقسیم کیا تا کہ اگلے دن کی مڈ بھیڑ کے لئے تیار ہوں۔

صبح کے وقت معمول کے مطابق اجتماعات، مظاہرے، پتھراؤ، فائرنگ اور آنسو گیس کے دھوئیں سے بھرے مناظر تھے، کچھ نوجوان دیواروں، جھاڑیوں یا سڑک کے کنارے چھپے ہوئے تھے، ایک گشتی گاڑی کے گزرنے پر، ایک نوجوان ان دستی بموں کو جلاتا اور گاڑی کی طرف پھینکتا تھا، جو ایک خوفناک دھماکہ پیدا کرتی تھی اور کبھی کبھار کچھ فوجیوں کو زخمی بھی کرتی تھی۔

☆☆☆☆

انتفاضہ کے ابتدائی دنوں کی ایک شام، میرے بھائی محمود کے چند دوست اس سے ملنے آئے، میں ان میں سے کچھ کو جانتا تھا اور کچھ کو نہیں۔ وہ سب مہمان خانے میں بیٹھے تھے، اور ماحول سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ایک تنظیمی اجلاس یا کچھ اس طرح کا تھا۔ انہوں نے کئی گھنٹے بحث و مباحثے میں گزارے، ان میں دو رائے تھیں، ایک مکمل شرکت کے حق میں اور دوسری مخالفت میں۔ آخر میں انہوں نے اتفاق کیا کہ ایک متحدہ قومی فریم ورک کے تحت شرکت کی جائے اور تنظیم آزادی فلسطین کی نمائندہ قومی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔ چند دن بعد دوسرے مہمان آئے، جو مختلف قومی جماعتوں کا ایک مجموعہ تھے، میں کچھ کو جانتا تھا۔ وہ طویل وقت تک بیٹھے بحث و مباحثے میں مصروف تھے، اور انتفاضہ کو قابض قوتوں کے خلاف مزید بھڑکانے کی بات کر رہے تھے۔ اب سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ دو بیانات جاری ہونے والے ہیں، ایک متحدہ قیادت کی طرف سے اور دوسرا اسلامی مزاحمتی تحریک (حماس) کی طرف سے۔ دونوں ہی شدت اور تسلسل کی روح لے کر آئیں گے، لیکن ان میں سے ہر ایک مختلف پروگرام پیش کرے گا۔ مثلاً پہلا اتوار کے روز عام ہڑتال کی دعوت دے گا، اور دوسرا پیر کے روز، پہلا بدھ کے روز اعتصام کی دعوت دے گا، اور دوسرا جمعرات کو زخمیوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لئے اجتماعی روزے کی دعوت دے گا۔ ہر گروہ کے کارکن اپنے بیانات ہر جگہ تقسیم کرتے تا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ پھیلایا جا سکے، اور ہر سرگرمی والے دن کارکن نقاب پہن کر سڑکوں پر اترتے تا کہ سب کو پابند کیا جا سکے اور کمزوری، عاجزی یا عوام کی بے حسی ظاہر نہ ہو۔ اس عمل نے کئی بار تصادم اور اختلافات کو جنم دیا، جنہیں آخری لمحے میں جھگڑے یا تصادم میں بدلنے سے روکا گیا، اور جو بھی مسائل سامنے آتے ان کا فوری طور پر حل کیا جاتا۔

مشترکہ قیادت یہ سمجھتی تھی کہ وہ فلسطینی عوام کی صحیح نمائندہ تنظیم ہے اور اس لیے وہی تصادم کی رفتار اور واقعات کے پروگرام کو طے کرنے کا حق رکھتی ہے، جبکہ حماس یہ سمجھتی تھی کہ وہ ایک بڑا اور فعال گروہ ہے جس کی تنظیم میں نمائندگی نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے اپنی سرگرمیوں کا پروگرام طے کرنے اور مطلوب رفتار کو مقرر کرنے کا حق نہیں ہے۔ آخر میں عوام اور شہریوں کی تیاری ہی فیصلہ کن ہے، کئی بار میرے بھائی محمود اور میرے دوسرے بھائی حسن یا محمد یا میرے چچازاد ابراہیم کے درمیان گھر میں شدید بحث چھڑ جاتی تھی، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ محمود مشترکہ قیادت میں ہے، جبکہ حسن، محمد اور ابراہیم دوسرے گروہ میں ہیں۔ اس دوران جواز کے بارے میں شدید بحث ہوتی تھی کہ کس گروہ کا عمل جائز ہے یا کس گروہ کی کوشش دوسرے کو نظر انداز کرنے اور اس کے وجود اور اثر کو نظر انداز کرنے کی کوشش ہے۔ اور ہر گروہ اس بات کے ثبوت دیتا تھا کہ وہی اختیارات کا حامل ہے اور وہی ہے جس نے انتفاضہ کی منصوبہ بندی کی ہے یا اسے شروع کیا ہے اور اس کی سرگرمیوں اور کارکردگی کو ترقی دی ہے۔ ہر ہفتے انتفاضہ نئے علاقوں تک پھیلتی جاتی تھی جو پہلے شامل نہیں تھے اور ہر ہفتے نئے طبقے کے لوگ اس میں شامل ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ یہ واقعی فلسطینی روزمرہ زندگی کا حصہ بن گئی۔ باقی سرگرمیاں اور روزمرہ کی زندگی کی سرگرمیاں بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئیں، تا کہ انتفاضہ کے مسلسل جاری رہنے کے باوجود زندگی اور معاشرتی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

بچے صبح کے وقت اسکول جاتے تھے، تعلیم حاصل کرتے تھے اور شام کے وقت سڑکیں تصادم، مظاہروں اور جھگڑوں کا منظر بن جاتی تھیں، تاجر صبح کے وقت خرید و فروخت کرتے تھے اور دوپہر کے بعد عام ہڑتال ہوتی تھی، اور یہ دیگر معاشرتی شعبوں پر بھی لاگو ہوتا تھا۔ پہلے چند مہینوں میں شہر الخلیل میں، جو باقی علاقوں سے پیچھے رہ گیا تھا، ایک اجلاس ہوا جس میں شہر کے اسلامی گروہ کے کئی رہنما شامل تھے، اور موجود لوگوں میں جمال اور عبد الرحمن بھی شامل تھے۔ بحث طویل ہو گئی تھی، کچھ لوگ شرکت کے حامی تھے جبکہ کچھ مخالف، آخر کار ایک مصالحتی فارمولے پر اتفاق ہوا جس کے تحت تدریجی طور پر محدود تعداد میں شرکاء کے ساتھ سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا، اور پھر نتائج کا جائزہ لیا گیا۔ محدود تعداد میں شرکت کے ساتھ سرگرمیاں شروع ہوئیں تو عوام میں وسیع پیمانے پر قبولیت اور شرکت دیکھنے میں آئی، اس کے بعد ایک ہنگامی کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا جس کی سربراہی جمال کو سونپی گئی تا کہ سرگرمیوں کو مزید بڑھایا جا سکے اور ان کی مستقل مزاجی کو یقینی بنایا جا سکے۔ تھوڑی ہی مدت میں سرگرمیوں میں تیزی آئی اور دیگر قوتیں بھی میدان میں آ گئیں۔ عوام کے وسیع طبقے ابھی تک اس انتفاضہ کے بارے میں فیصلہ نہیں کر پائے تھے، جیسے کہ وہ مزدور جو مقبوضہ علاقوں میں کام کرتے تھے، ان کے مفادات اور بچوں کی روزی روٹی امن و سکون اور اس بات پر منحصر تھی کہ وہ اپنے کام پر جا سکیں، اس طبقے کو بھی دوسرے طبقوں کی طرح انتفاضہ سے ہم آہنگ ہونا پڑا کیونکہ ان کے یہودی مالکان کے ساتھ وعدے اور ذمہ داریاں تھی۔

انتفاضہ کی سرگرمیوں کے بڑھنے اور اس کی مسلسل پریشانی کے سبب اسرائیلی وزیر دفاع اسحاق رابین نے "ہڈیاں توڑنے" کی پالیسی کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۹۱ پر)

بنگلہ دیش کے سول سرونٹس کی تربیت بھارت کی بجائے پاکستان میں

میڈیا رپورٹس کے مطابق بنگلہ دیش نے اپنی سول سروس کے اعلیٰ افسران کی تربیت کا پروگرام بھارت سے لاہور، پاکستان منتقل کرتے ہوئے ایک اہم سفارتی تبدیلی کا اشارہ دیا ہے، جس کے تحت پہلی بار بارہ سینئر بیوروکریٹس لاہور کے سول سروسز اکیڈمی میں تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق یہ فیصلہ ۲۰۲۴ء میں شیخ حسینہ حکومت کے خاتمے کے بعد بنگلہ دیش کی خارجہ پالیسی میں وسیع تر تبدیلی کا حصہ ہے، جس کے تحت ڈھاکہ بھارت پر انحصار کم کرتے ہوئے اسلام آباد کے ساتھ تعلقات بہتر بنا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بھارت میں سول افسران کے تربیتی پروگرام کو ختم کرنا بنگلہ دیش میں بھارت کے اثر رسوخ میں کمی کا سبب بنے گی، جو مثبت پیش رفت ہے، لیکن سول سرونٹس کی تربیت کے لیے پاکستان کا انتخاب آسمان سے گرا کھجور میں اٹکے والی بات ہے۔ پاکستان کے موجودہ مسائل میں بیوروکریسی کا کلیدی کردار رہا ہے، بیوروکریسی کا مروجہ نظام انگریزوں کا عطا کردہ ہے اور اسی بوسیدہ ڈیزائن میں آج تک برقرار ہے۔ یہ سیاستدانوں اور جرنیلوں کی لوٹ مار میں سہولت کاری کرتا ہے اور اس سہولت کاری کے عوض بے تحاشا مالی فوائد بھی سمیٹتا ہے، جس کی قیمت غریب عوام ہی ادا کرتی ہے۔ قیام پاکستان سے اب تک بیوروکریسی کے مکروہ سیاہ کردار پر اتنا کچھ لکھا جا چکا اور تا حال لکھا جاتا ہے کہ اگر معمولی زحمت کرتے ہوئے ایکس (ٹیوٹر) پر لفظ ”بیوروکریسی“ سرچ کر لیا جائے اور دیکھا جائے کہ مختلف شعبوں اور مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کی پاکستان کی بیوروکریسی کے متعلق کیا رائے ہے تو آپ بخوبی سمجھ جائیں گے کہ یہ لفظ تو پاکستان میں گالی بن چکا ہے۔ ایک شعبے کی اپنی جب یہ حالت ہے تو وہ دوسروں کو بھلا خاک تربیت دے سکتا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ بنگلہ دیش کی جانب سے اس فیصلے میں اس حد تک بے وقوفی کا مظاہرہ کیوں کیا گیا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں تجارتی روابط میں اضافہ اور دیگر شعبوں میں تعاون ہو جو عوام کی زندگیوں کو بہتر بنائے یہ زیادہ اہم ہے بجائے اس کے کہ بنگلہ دیش پاکستان کے بوسیدہ ظالمانہ فرنگی نظام کے اجزاء کو حاصل کرے۔

البانیہ میں کشنر کے لگژری ریزورٹس کے خلاف مظاہرے

البانیہ کے ساحلی علاقوں میں ٹرمپ کے داماد جیرڈ کشنر کا لگژری ریزورٹس بنانے کا منصوبہ طویل عرصے سے ماحولیاتی کارکنوں کی تنقید اور احتجاج کا ہدف ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ ترقیاتی منصوبے حکومت کے خلاف وسیع تر احتجاج کا مرکز بن چکے ہیں، البانیہ کی حکومت اس منصوبے کا دفاع کرتی نظر آ رہی ہے۔ نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق یہ احتجاج دارالحکومت اور ساحلی شہروں میں ہو رہے ہیں اور البانیہ میں (جو یورپ کے غریب ترین ممالک میں سے ایک ہے) پھیلی ہوئی شدید مایوسی کا اظہار بن گئے ہیں۔ اس منصوبے کی لاگت کا تخمینہ ۱.۴ بلین ڈالر ہے جو ماحولیاتی تحفظ اور شفافیت کے حوالے سے تشویش پیدا کر رہے ہیں۔ البانیہ کے وزیر اعظم Edi Rama نے بار بار ان منصوبوں کو ملک کی ابھرتی ہوئی سیاحت کی معیشت کو وسعت دینے اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کو راغب کرنے کا موقع قرار دیا ہے جبکہ ناقدین کی رائے ہے کشنر (جو کئی سرمایہ کاروں میں سے ایک ہیں) کو اپنے سسر صدر ٹرمپ کی خاطر ترجیحی سلوک دیا گیا۔ Jakob Weizman البانیہ کے انسداد بدعنوانی کے پروسیکیوٹرز اس لگژری ریزورٹ پراجیکٹ کی تفتیش کر رہے ہیں۔ اس پراجیکٹ میں ایڈریاٹک سمندر کا غیر آباد جزیرہ سازان (Sazan) اور Vjosa-Narta کے کئی سو ہیکٹرز شامل ہیں جو ایک حساس ساحلی دلدلی علاقہ (wetland) ہے۔ یہاں فلیمنگو، سیل اور سمندری کچھوؤں کے انڈے دینے کی جگہیں موجود ہیں۔ البانیہ کے خصوصی انسداد بدعنوانی کے دفتر SPAK نے تصدیق کی کہ اس نے ۲۰۲۴ء میں اس علاقے کی محفوظ حیثیت اور زمین کی ملکیت میں ہونے والی متنازع تبدیلیوں کی تفتیش شروع کر دی ہے، جنہوں نے سیاحت کی ترقی کا راستہ کھولا تھا۔ جیرڈ کشنر کے پاس اربوں ڈالر کی ریئل اسٹیٹ پورٹ فولیو ہے۔ ناقدین نے اس کے کاروبار اور سیاسی کردار کے درمیان اوورلیپ پر سوالات اٹھائے ہیں۔ اگست ۲۰۲۴ء میں کشنر نے اپنی فرم Affinity Partners کے ذریعے اس جگہ کو لگژری ریزورٹ میں تبدیل کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا۔ ۲۰۲۶ء کے شروع میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس علاقے کا دورہ بھی کر چکا ہے۔ البانیہ کے وزیر اعظم Edi Rama نے حال ہی میں پولیٹیکو سے انٹرویو میں تصدیق کی کہ حکومت اور کشنر کے درمیان بات چیت جاری ہے، اور یہ ڈیل تقریباً ۱،۰۰۰ ہوٹل رومز پر مشتمل ہو گی۔ SPAK کو ۲۰۱۹ء میں یورپی یونین اور امریکہ کی حمایت سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ قومی عدلیہ سے آزاد کام کرتا ہے اور سیاسی طور پر اعلیٰ سطح کے کئی عہدیداروں کی تفتیش، مقدمے اور سزا دے چکا ہے۔ متعدد آزاد پولز کے مطابق یہ فی الحال ملک کا سب سے زیادہ قابل اعتماد ادارہ ہے۔ پر تشدد احتجاج شہریوں اور ماحولیاتی این جی اوز کی قیادت میں مئی کے آخر میں شروع ہوئے، جب ڈویلپرز نے Zvernec (جنوبی البانیہ) میں تجویز کردہ جگہ پر خاردار تار والی بڑی باڑیں لگا دیں، جس سے مقامی لوگوں اور سیاحوں کی ساحل تک رسائی بند ہو گئی۔ احتجاج کرنے والوں نے حکومت کے دفاتر کے باہر جمع ہو کر پراجیکٹ ختم کرنے، علاقے کی حفاظت اور وزیر اعظم کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔ احتجاج کے بعد وائرل ویڈیوز میں نجی سیکیورٹی گارڈز ایک مظاہرے کرنے والے کو تشدد کا نشانہ بناتے، اسے درہ کے ساتھ گھسیٹتے اور دیگر مظاہرین کو دھمکیاں دیتے نظر آئے۔ البانیہ کی حکام نے دو نجی سیکیورٹی کمپنیوں کے لائسنس منسوخ کر دیے، ایک گارڈ کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا، تقریباً ۱۵ مظاہرین پر الزامات عائد کیے گئے، اور مقامی پولیس چیف کو ہٹا دیا گیا۔ وزیر اعظم Rama نے ایک بیان میں کہا: ”میں البانیہ کو خطے میں ایک

ایسی منزل بنانا چاہتا ہوں جس کی سب حسرت کریں، اور یہ پراجیکٹ اس کوشش کا حصہ ہے"۔ واضح رہے البانیہ جغرافیائی طور پر جنوب مشرقی یورپ کے جزیرہ نما بلقان میں واقع ہے لیکن ابھی تک یورپی یونین (EU) کا رکن نہیں ہے۔ البانیہ ۲۰۱۴ء سے یورپی یونین کا ایک باضابطہ امیدوار ملک ہے اور یونین میں شامل ہونے کے لیے الحاق کے مذاکرات کے ذریعے فعال طور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ البانیہ کی پچاس فیصد سے زائد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جبکہ ریاست سرکاری سطح پر سیکولر ہے۔

یورپی یونین کی رکنیت کے لیے بوسنیا ہرزیگووینہ سے اصلاحات کے مطالبہ

بوسنیا ہرزیگووینہ سے یورپی یونین کی رکنیت کے لیے اہم اصلاحات کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ یہ مطالبات یورپی یونین کی بیان کردہ ۱۴ کلیدی ترجیحات (key priorities) پر مبنی ہیں، جو بظاہر جمہوریت، ریاست کی فعالیت، قانون کی حکمرانی (Rule of Law)، بنیادی حقوق اور پبلک ایڈمنسٹریشن ریفارمز کے متعلق ہیں۔ حال ہی میں یورپی یونین کونسل کے صدر انٹونیو کوسٹا (António Costa) نے ساراجیوو میں کہا کہ بوسنیا کو فوری طور پر دو عدالتی اصلاحات منظور کرنی چاہییں اور چیف نیگوشیئٹر (chief negotiator) کا تقرر کرنا چاہیے تاکہ accession negotiations کھل سکیں۔ انہوں نے ریفارم ایجنڈا کے نفاذ پر بھی زور دیا، ورنہ یورپی یونین کے growth plan سے مزید فنڈز ضائع ہو سکتے ہیں۔ یورپی یونین انتخابی عمل میں ریفارمز پر زور دے رہی ہے اور مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ انتخابی عمل میں اقلیتوں کو حقوق دے کر اسے یورپین سٹینڈرڈ سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اور بوسنیا کے انتخابات یورپین سٹینڈرڈ پر کس طرح پورا اتریں گے؟ یہودیوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دے کر۔ ڈیٹون معاہدے کی وجہ سے صرف بوسنیائی، سرب اور کروشیائی شہری صدارت اور House of Peoples میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہودی اور دیگر اقلیتیں اس سے محروم ہیں۔ یورپ میں رائج جمہوریت اور انسانی حقوق کے دعووں کی اصلیت کیا ہے ان مطالبات سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ٹرانس جینڈر اور ایل جی بی ٹی کے حقوق کے نام پر ان فتنوں کے فروغ کا ایجنڈا بھی مطالبات کا حصہ ہیں۔

انڈونیشیا کا امریکہ سے معاہدہ اور ممکنہ تنازعات میں الجھنے کے خدشات

الفن فیبرین باسندورو شعبہ بین الاقوامی تعلقات، یونیورسٹی آف ایرلانگا، انڈونیشیا میں لیکچرر ہیں انہوں نے اپریل میں امریکہ اور انڈونیشیا کے مابین ہونے والے دفاعی معاہدے پر سخت تنقید کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ یہ معاہدہ اگرچہ شمالی ناٹونا سمندر میں فوجی صلاحیت اور ڈیٹرنس کے لیے حقیقی فوائد پیش کرتا ہے، لیکن اس سے جغرافیائی تنازعے میں پھنسنے کا خطرہ بھی بہر حال موجود ہے۔ ایران پر بڑھتے ہوئے جارحانہ امریکی حملوں کے درمیان، معاہدے پر دستخط ایک غیر ملکی آن لائن میڈیا آؤٹ لیٹ کی لیک ہونے والی رپورٹ کے ساتھ موافق تھے جس میں بتایا گیا تھا کہ واشنگٹن انڈونیشیائی فضائی حدود میں "بلینکٹ" اوور فلائٹ کی اجازت طلب کر رہا ہے۔ جکارتہ نے تیزی سے اس بات کی تردید کر دی کہ ایسی کوئی رعایت دی گئی تھی لیکن عوامی حلقوں میں اس حوالے سے اشتعال ضرور تھا کہ ان کی حکومت خاموشی سے اپنے ملک کی خود مختاری کو ایک بڑی طاقت (امریکہ) کو بیچ رہی ہے۔ اس عوامی اضطراب کو انڈونیشیا کی بنیادی خارجہ پالیسی کے نظریے، "آزاد اور فعال" (bebas aktif) اصول کی عینک سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جسے اس وقت کے نائب صدر محمد حطا نے اپنی ۱۹۴۸ء کی تقریر میں بیان کیا تھا اور ۱۹۵۳ء کے خارجہ امور کے مضمون میں مزید وضاحت کی تھی۔ بیباس اکٹف اصول بڑی غیر ملکی طاقتوں کے دباؤ کے درمیان انڈونیشیا کی سٹریٹجک خود مختاری کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ خود مختاری، عالمی امن اور ایک منصفانہ بین الاقوامی نظم کے فعال پیروی کا عزم کرتا ہے۔ "میجر ڈیفنس کوآپریشن پارٹنرشپ" معاہدے میں اگرچہ سٹریٹیجک فوائد بھی نظر آتے ہیں، جکارتہ کا انحصار امریکی ساختہ دفاعی پلیٹ فارمز اور آلات پر ہے۔ انڈونیشیا امریکہ کے ساتھ ۲۰۰۳ء سے ۲۰۲۲ء کے درمیان کل ۱۱۰ سے زیادہ فوجی مشقیں کر چکا ہے۔ ایک باضابطہ تعاون کا فریم ورک اسپیئر پارٹس تک رسائی اور زیادہ مضبوط صلاحیت سازی کے مواقع ایسے وقت میں دے رہا ہے جب بحیرہ نارتھ ناٹونا میں انڈونیشیا کو تیزی سے بڑھتے جارحانہ چین کا سامنا ہے اور انڈونیشیا کے لیے دفاعی صلاحیت کی تعمیر زیادہ اہم ہے۔ لیکن ایم ڈی سی پی معاہدے کو انڈونیشیا کے بیباس اکٹیف اصول کے تحت دیکھا جائے تو اس معاہدے کے ساتھ منسلک خطرات اتنے ہی ٹھوس ہیں۔ پہلا خطرہ فضائی حدود کی خود مختاری کا ہے، جو انڈونیشیا کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم ستون ہے۔ ۱۹۹۶ء کا میری ٹائم ریجن کا قانون اور ۲۰۲۵ء کا ہوائی اسپیس مینجمنٹ قانون ان شرائط کو متعین کرتا ہے جن کے تحت غیر ملکی فوجی طیاروں کو خود مختار فضائی حدود سے گزرنے کا حق حاصل ہے، جس سے انڈونیشیا کے جزیرہ نما سمندری راستوں تک رسائی محدود ہے۔ کوئی بھی بلینکٹ اوور فلائٹ کلیئرنس اس قانون سازی سے متصادم ہوگا اور اسی طرح کے حالات میں انڈونیشیا کی خود مختاری کی قانونی طور پر خلاف ورزی کرنے کے لیے دوسری بڑی طاقتوں کے لیے ایک مثال قائم کر سکتا ہے۔ یہ معاہدہ انڈونیشیا کو امریکہ چین تنازع کے اندر جغرافیائی و سیاسی طور پر ملوث ہونے کے خدشات بھی پیدا کرتا ہے۔ جکارتہ کی بیباس اکٹیف اصول کے تحت واضح طور پر عدم صف بندی اسے واشنگٹن اور بیجنگ دونوں سے فوائد کو برقرار رکھنے کے لیے سٹریٹجک خود مختاری فراہم کرتی ہے، لیکن یہ فائدہ امریکہ کو چین کے خلاف اپنی فضائی حدود استعمال کرنے کی اجازت دینے میں ضائع ہو جائے گا۔ یہ معاہدہ چین کے ساتھ انڈونیشیا کے تعلقات کو خطرے میں ڈال سکتا ہے جو اس کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر اور ایک اہم سرمایہ کار ہے۔ بیجنگ ایسے معاہدوں اور صف بندیوں کو اہمیت دیتا اور جوابی حکمت عملی اپناتا ہے جس کی ایک مثال ۲۰۲۱ء میں AUKUS شراکت داری کے اعلان کے بعد چین کے ساتھ آسٹریلیا کے بگڑتے تعلقات ہیں۔ انڈونیشیا کے لیے ایک بڑا رسک خطے میں مستقبل میں امریکی قیادت میں ہونے والے تنازع کی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔ اگر امریکی فوج انڈونیشیا کی فضائی حدود کے ذریعے لامحدود ٹرانزٹ حقوق حاصل کر لیتی ہے، تو یہ راہداری آبنائے تائیوان یا بحیرہ جنوبی

چین میں مستقبل میں ہونے والے کسی بھی تنازع میں استعمال ہو سکتی ہے۔ ایک بدترین صورت حال یہ ہو سکتی ہے کہ امریکہ چین کے فوجی اثاثوں کے خلاف حملہ کرنے کے لیے انڈونیشیا کی خود مختار فضائی حدود کا استعمال کرے، جو چین کو جوابی حملوں کے لیے بھڑکا سکتا ہے۔ انڈونیشیا کے صدر پرابوو سوبیانتو کی انتظامیہ کے تحت اس معاہدے پر تشویش اس لئے بھی بڑھ گئی ہے کہ خارجہ پالیسی کے فیصلوں کو اکثر عوام تک ناقص طور پر پہنچایا جاتا ہے۔ مبصرین کے خیال میں عوام کو کسی بھی سرکاری وضاحت سے پہلے غیر ملکی خبروں کے ذرائع سے اوور فلائٹ تنازع کے بارے میں معلوم ہوا۔ الفن فیبرین باسندورو کی رائے ہے کہ اس معاہدے کے نفاذ میں احتیاط برتنی چاہیے اور شفافیت کو یقینی بنانا چاہیے۔ بیبا اکٹیف اصول انڈونیشیا سے شراکت داری کو مسترد کرنے کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ اس کے بجائے یہ رہنما اصول دیتا ہے کہ تمام معاہدے برابری کی بنیاد پر بنائے جائیں، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ خود مختاری کو برقرار رکھا جائے اور قومی مفادات کو واضح اور عوامی طور پر بیان کیا جائے۔

سائمن ہوٹاگلنگ ”یوریشیا ریویو“ کے مضمون میں اس معاہدے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ملکی سیاست کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے انڈونیشیا کے باشندے اب بھی غیر ملکی فوجی مداخلت پر کسی حد تک شکوک وشبہات کا شکار ہیں اور سمجھ بوجھ کر اس بات کا یقین کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جو بھی معاہدہ کریں گے وہ ان کی خود مختاری کو مجروح نہیں کرے گا۔ ایک اور اہم عنصر لاگت ہو گا۔ انڈونیشیا کی دفاعی جدت کے لیے اہم مالی عزم کی ضرورت ہو گی، اور امریکہ کے ساتھ تعاون اتنا مہنگا نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے ملک کی دفاعی سٹریٹجک خود مختاری کو نقصان پہنچے اور ایک ایسا مالی بوجھ پیدا ہو جو مستقبل کی پالیسی کے اختیارات کو محدود کر دے۔ یہ انڈونیشیا کے مستقبل کے لیے بھی کئی اہم خطرات کو جنم دیتا ہے، جس میں ملک کا امریکہ اور چین کی دشمنی میں مزید پھسلنا، اپنے دفاعی نظام کو تیار کرنے کے لیے غیر ملکی ٹیکنالوجی پر حد سے زیادہ انحصار کرنا، جس سے آسیان اتحاد ٹوٹ جاتا ہے، چینی غصے کو دعوت دیتا ہے اور ممکنہ طور پر انڈونیشیا مخالف خارجہ پالیسی کے نئے اقدام کو جنم دیتا ہے۔ ان سے نمٹنے کے لیے، ملک کو MDCP کی مطابقت پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے سرد جنگ کے دور کے دوطرفہ اتحاد سے جدید دفاعی جدت تعاون کے معاہدے میں تبدیل کرنا ہو گا۔ مزید برآں، اس طرح کے نقطہ نظر کو مضبوطی سے ASEAN مرکزی سفارت کاری کے فن تعمیر میں شامل کیا جانا چاہیے اور دوسرے ٹیکنالوجی کے مالک ممالک اور دفاعی صنعتی پاور ہاؤسز بشمول جاپان، جنوبی کوریا، آسٹریلیا اور یورپی یونین کے ساتھ اتحاد قائم کرنا چاہیے۔ انڈونیشیا کو ملک کے مہنگے اور بڑے پیمانے پر خود مختار دفاعی خریداری کے نظام میں مزید شفافیت، قابل برداشت اور آگے کی سوچ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

کینیا میں امریکی شہریوں کے لیے ایبولا کوارنٹائن مرکز کے قیام کے خلاف احتجاج

کینیا کے وسطی شہر نانیوکی میں سینکڑوں نوجوانوں نے لائیکیپیا ایئر بیس کے قریب امریکی شہریوں کے لیے ایبولا وائرس سے متاثر افراد کے کوارنٹائن مرکز قائم کرنے کے منصوبے کے خلاف احتجاج کیا۔ کینیا کی ہائی کورٹ عدالت نے لا سوسائٹی آف کینیا اور ایک آئینی واچ ڈاگ کی درخواست پر اس سہولت کے قیام اور کسی بھی غیر ملکی مریض کی آمد کو عارضی طور پر معطل کر دیا تھا۔ دونوں تنظیموں کا کہنا ہے کہ کینیا کا صحت کا کمزور نظام غیر ملکی ایبولا مریضوں کے لیے مناسب نہیں، اس لیے انہیں ملک میں کوارنٹائن نہیں کیا جانا چاہیے۔ امریکی حکام نے کہا تھا کہ امریکہ بیرون ملک ایبولا سے متاثر ہونے والے امریکی شہریوں کو وطن واپس لانے کے بجائے کینیا میں نئی جگہ پر بھیجنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ سہولت لائیکیپیا ایئر بیس پر ہو گی اور جلد ۵۰ کوارنٹائن بیڈز کے ساتھ فعال ہو جائے گی۔ کینیا کے صحت کے وزیر ایڈن ڈوالے نے اتوار کو کہا کہ یہ کوارنٹائن مرکز ”سب کے لیے“ ہے صرف امریکی شہریوں کے لیے نہیں۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ مارکو روبیو نے کہا کہ امریکی حکومت کینیا کے ایبولا تیاری کے اقدامات کے لیے ۱۳ء۵ ملین ڈالر دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مقامی رہنماؤں، بشمول لائیکیپیا کے گورنر جوشوا ارونگو نے صحافیوں سے کہا کہ وہ ایبولا کوارنٹائن مرکز کے قیام کی مخالفت کرتے ہیں۔ گورنر نے کہا: ”یہ ہمارے لوگوں کو ایبولا سے متاثر کرے گا“، اور مزید کہا کہ ایئر بیس کے اندر بہت سے مقامی لوگ کام کرتے ہیں جو خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ کینیا میں اب تک ایبولا کا کوئی کیس سامنے نہیں آیا ہے اب اسے امریکہ کی بدمعاشی اور خود غرضی نہ کہا جائے تو کیا کہیں کہ وہ اپنے متاثرہ شہریوں کو ایک ایسے ملک میں ٹھہرانا چاہتا ہے جس کے صحت کے نظام کا امریکی صحت کے نظام سے کوئی موازنہ ہی نہیں ہے۔

کینیا مشرقی افریقہ میں امریکہ کے لیے ایک اہم اسٹریٹجک شراکت دار کے طور پر کام کرتا ہے۔ ایک بڑے غیر نیٹو اتحادی کے طور پر اعلیٰ، دفاعی شراکت داری، انسداد دہشت گردی، بحری سلامتی، اور مشترکہ علاقائی امن مشنز پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کرتی ہے۔

امریکہ نے مشترکہ دفاعی تنصیبات میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کی ہے، خاص طور پر الشباب کا مقابلہ کرنے کے لیے لامو کاؤنٹی میں منڈا بے ایئر فیلڈ کی اپگریڈیشن، اس کے علاوہ ممباسا میں کینیا نیوی بیس Mtongwe پر ۷۵۰،۰۰۰ ڈالر کے بحری تربیتی مرکز کی تعمیر۔ دوطرفہ فریم ورک کے ذریعے باضابطہ، شراکت داری میں انٹیلی جنس شیئرنگ، فوجی تعلیم، اور صلاحیت کی تعمیر بھی شامل ہے۔ یہ مشترکہ کثیر القومی مشنز کو بھی سہولت فراہم کرتا ہے، جیسے کہ ہیٹی میں اقوام متحدہ کی حمایت یافتہ سیکورٹی مشن میں کینیا کے اہم کردار کے لیے امریکی لاجسٹک اور مالی مدد۔ کینیا کی نیشنل فرانزک لیبارٹری کے اندر خصوصی FBI اور محکمہ انصاف کی ٹاسک فورسز کے ذریعے بین الاقوامی بدعنوانی اور سائبر سیکورٹی سے نمٹنے کے لیے توسیع بھی کی گئی ہے۔ بظاہر یہی نام نہاد دفاعی تعاون اور منصوبے ہی ہیں جو کینیا کے حکمرانوں کو ملکی سلامتی اور عوام کی جانوں کو امریکی خوشنودی کے لیے ایبولا وائرس جیسے خطروں میں ڈالنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔

جدید گاڑیاں صارفین کی نگرانی، ڈیٹا کمپائلنگ اور فروخت میں ملوث ہیں

تھامس جرمین ایک ممتاز ٹیکنالوجی صحافی اور کالم نگار ہیں۔ وہ ٹیک پوڈکاسٹ دی انٹرفیس کے شریک میزبان بھی ہیں۔ تقریباً ایک دہائی سے وہ مصنوعی ذہانت، آن لائن پرائیویسی، نگرانی، اور بڑی ٹیک کمپنیوں کی اجارہ داریوں پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ڈیجیٹل دنیا کے چھپے ہوئے رازوں سے پردہ ہٹا رہے ہیں۔ اپنے حالیہ مضمون میں انہوں نے جدید گاڑیوں کے حوالے سے ہوشربا انکشافات کیے ہیں۔ لکھتے ہیں: آج کل کی گاڑیاں دراصل پہیوں پر چلنے والے کمپیوٹرز ہیں، اور بڑی کمپنیاں ان کے ذریعے آپ کی ذاتی زندگی کی چھوٹی چھوٹی معلومات جمع کرکے منافع کما رہی ہیں۔ اگر آپ کار کمپنیوں کی پرائیویسی پالیسیز کا بغور جائزہ لیں، تو وہ خود یہ بات تسلیم کرتی ہیں۔ وہ جو معلومات اکٹھی کرتی ہیں، ان میں آپ کی درست لوکیشن، آپ کہاں جاتے ہیں، گاڑی میں آپ کے ساتھ کون ہے، کیا سن رہے ہیں، اور کیا آپ سیٹ بیلٹ باندھتے ہیں یا نہیں، یہاں تک کہ آپ کتنی تیزی سے گاڑی چلاتے ہیں یا کتنی زور سے بریک لگاتے ہیں، سب شامل ہو سکتا ہے۔ کچھ گاڑیاں تو ایسی معلومات بھی جمع کرتی ہیں جن کا آپ نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا، جیسے آپ کا وزن، عمر، نسل، اور چہرے کے تاثرات۔ کیا آپ ناک صاف کرتے ہیں؟ کچھ گاڑیوں میں اندرونی کیمرے لگے ہوتے ہیں جو ڈرائیور پر نظر رکھتے ہیں۔ اور زیادہ تر گاڑیاں انٹرنیٹ سے منسلک ہوتی ہیں جو یہ تمام ڈیٹا آپ کی لاعلمی میں منتقل کرتی رہتی ہیں۔

یہ صرف راز داری کا مسئلہ نہیں، یہ آپ کے مالی معاملات کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔ انشورنس کمپنیاں گاڑیوں سے حاصل ہونے والے ڈیٹا کی بڑی خریدار ہوتی ہیں اور اس کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے زیادہ رقم وصول کرتی ہیں۔ اور یہ بھی واضح نہیں کہ آپ کی معلومات کہاں جا رہی ہیں۔ کچھ کار کمپنیاں تسلیم کرتی ہیں کہ وہ آپ کا ڈیٹا فروخت کرتی ہیں، لیکن یہ نہیں بتاتیں کہ خریدار کون ہے۔ واشنگٹن ڈی سی میں بروکنگز انسٹیٹیوٹ کے سینئر فیلو ڈیریل ویسٹ کہتے ہیں کہ 'لوگ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کی گاڑی کتنے قسم کے ڈیٹا پوائنٹس جمع کرتی ہے اور انہیں دوسروں تک پہنچاتی ہے، چاہے وہ گاڑی بنانے والی کمپنی ہو یا تیسری پارٹی کی ایپلی کیشنز'۔

'اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زندگی کو تقریباً ہر لمحے کے حساب سے دوبارہ ترتیب دیا جا سکتا ہے'۔

امریکہ میں ایک وفاقی قانون جلد ہی اس ڈیٹا کی مقدار میں اضافہ کرنے والا ہے جو آپ کی گاڑی آپ کے بارے میں جمع کر سکتی ہے۔ جلد ہی امریکی کار کمپنیوں کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ گاڑیوں میں انفرا ریڈ بایو میٹرک کیمرے اور دیگر نظام نصب کریں، جو آپ کی جسمانی حرکات، آنکھوں کی حرکت اور رویے کے مختلف پہلوؤں کو مانیٹر کریں گے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ آپ نشے میں ہیں یا ڈرائیونگ کے لیے بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں۔ تاہم، اس کے ساتھ ہی یہ آپ کی صحت اور عادات سے متعلق ایک بالکل نیا اور وسیع ڈیٹا بھی جمع کرے گا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس معلومات کے استعمال پر کار کمپنیوں کے لیے کوئی واضح پابندیاں موجود نہیں ہیں۔

چونکہ آٹو موبائل کمپنیاں اپنے ڈیٹا کے دائرے کو مزید وسیع کرنے جا رہی ہیں، اس لیے یہ ایک نہایت اہم وقت ہے کہ ہم سمجھیں کہ گاڑی کے اندر درحقیقت کیا ہو رہا ہے اور اس کے آپ کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ کنسلٹنگ فرم مکینزی کے مطابق، ۲۰۲۱ء میں سڑکوں پر موجود تقریباً ۵۰ فیصد گاڑیاں انٹرنیٹ سے منسلک تھیں، اور اندازہ ہے کہ ۲۰۳۰ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۹۵ فیصد ہو جائے گی۔ اگر آپ کی گاڑی انٹرنیٹ سے جڑی ہوئی ہے تو راز داری ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر آپ کو لازماً توجہ دینی چاہیے۔

کار کمپنیاں اس وقت بھی آپ کی نگرانی کر سکتی ہیں جب آپ اپنا فون گاڑی کے انفوٹینمنٹ سسٹم سے جوڑتے ہیں یا ڈرائیونگ سے متعلق مخصوص ایپس استعمال کرتے ہیں۔ کچھ ڈرائیور انشورنس کمپنیوں کے ٹیلی میٹرکس سسٹم بھی استعمال کرتے ہیں، جو ممکنہ رعایت کے بدلے آپ کی ڈرائیونگ عادات کی نگرانی کرتے ہیں۔ ۲۰۲۳ء میں فائر فاکس براؤزر بنانے والی کمپنی موزیلا نے ۲۵ کار برانڈز کی پرائیویسی پالیسیز کا تجزیہ کیا۔ ہر ایک برانڈ موزیلا کے مقرر کردہ پرائیویسی اور سکیورٹی معیار پر پورا اترنے میں ناکام رہا۔ موزیلا کے مطابق، گاڑیاں 'رازداری کے حوالے سے اب تک کی سب سے خراب پروڈکٹ کیٹیگری' ثابت ہوئی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق، کار کمپنیاں یہ حق محفوظ رکھتی ہیں کہ وہ آپ کا نام، عمر، نسل، وزن، مالی معلومات، چہرے کے تاثرات، نفسیاتی رجحانات اور دیگر تفصیلات جمع کریں۔ مثال کے طور پر، کیا (Kia) کی پرائیویسی پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمپنی آپ کی 'جنسی زندگی' اور عمومی صحت سے متعلق معلومات بھی جمع کر سکتی ہے۔ امریکہ میں جنرل موٹرز (GM) کے خلاف کارروائی ہو چکی ہے کیونکہ اس پر الزام تھا کہ وہ صارفین کی اجازت کے بغیر گاڑیوں کی لوکیشن کا ڈیٹا فروخت کر رہی تھی۔ ہونڈا اور ہنڈائی پر بھی ایسے ہی الزامات عائد کیے گئے ہیں اور یہ صرف وہ مثالیں ہیں جن کے بارے میں عوام کو علم ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے مسلم ممالک میں اس حوالے سے آگاہی پھیلانے کے ساتھ ٹیکنالوجی ایکسپرٹس اس ایشو پر کام کریں تاکہ جو گاڑیاں مغربی ممالک سے امپورٹ ہو رہی ہیں ان میں صارفین کے ڈیٹا پرائیویسی کو یقینی بنایا جا سکے۔

رہائشی پلاٹوں کے نام پر ریاستی اداروں کی سرپرستی میں 'فائلوں کا غیر قانونی کاروبار

اویس چوہدری اسلام آباد میں دس سال سے پراپرٹی کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ انہوں نے غیر ملکی خبر رساں ادارے کو بتایا کہ ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں ایک طریقہ بہت عام ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے سوسائٹیاں اپنے پاس موجود رقبہ سے زیادہ فائلیں فروخت کر دیتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ 'اس میں ہوتا یہ ہے کہ ایک سوسائٹی کے پاس زمین کا خریدا گیا یا حاصل کردہ رقبہ صرف ۵۰ یا ۱۰۰ کنال ہوتا ہے، وہ اس رقبے کی تزئین و آرائش اور ڈویلپمنٹ کرتے ہیں، وہاں پر مشینری پہنچاتے ہیں، مارکیٹنگ فرم اور پراپرٹی ڈیلرز کو اکٹھا کیا جاتا ہے اور پھر سینکڑوں کنال کی فائلیں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اس میں ایسے لوگ جو یکمشت ادائیاں نہیں کر سکتے اور اقساط والے

آپشن اختیار کرتے ہیں، وہ آسان شکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگلے کچھ عرصے میں اسی پراجیکٹ کے ساتھ مزید اراضی خرید کر اسے بھی ڈویلپ کر دیا جائے گا، اور اسی خواب کی بنیاد پر لوگ اپنی جمع پونجی سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔'

ان کا کہنا تھا کہ 'ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ڈویلپر نے سو کنال زمین کرائے پر حاصل کی اور وہاں پر انہوں نے تین ہزار لوگوں کو فائلیں فروخت کر دیں۔ اب نیب اس کے پیچھے ہے۔'

لیکن سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری اداروں کا اس ساری صورتحال میں کیا کردار ہے؟ اسلام آباد کی ایک معروف سوسائٹی کے مالک پر رقبے سے زیادہ فائلیں بیچنے پر سینکڑوں ایف آئی آر درج ہوتی ہیں اور وہ سوسائٹی فیلڈ مارشل عاصم منیر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے فل پیج کے کلر اشتہار اخبار میں شائع کروا رہی ہوتی ہے۔ ایسے بہت سے کیسز ہیں جہاں سوسائٹیز کے بیچے گئے پلاٹس پر تعمیرات کے سالوں بعد انہیں غیر قانونی قرار دے کر مسمار کر دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں صرف اسلام آباد میں ۹۸ سوسائٹیز کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ اس کا بڑا نقصان سوسائٹی مالکان اٹھائیں گے یا وہ غریب لوگ جو اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی ایک گھر حاصل کرنے کے لیے لگا دیتے ہیں۔ جو اپنا پیٹ کاٹ کر ماہانہ قسطیں بھرتے ہیں۔ ایک اہم پیٹرن جو ان ہاؤسنگ سوسائٹیز کے بڑے سرمایہ کاروں کے حوالے سے نظر آتا ہے وہ یہ کہ ان شخصیات کو قانونی چھوٹ دے کر پھر ان سے میڈیا مالکان اور من پسند سیاسی شخصیات کو سپورٹ بھی دلوائی جاتی ہے۔ جب تک یہ مافیا فرمانبرداری سے ریاستی اداروں کے ہاتھوں استعمال ہوتا رہے تب تک انہیں چھوٹ ملتی ہے لیکن جہاں یہ ریاستی اداروں کی نافرمانی کریں یا ان کے مطالبات نہ مانیں تب انکی فائلیں کھل جاتی ہیں۔ ملک ریاض اس پریکٹس کی ایک واضح مثال ہے۔

فرانس میں بڑے پیمانے پر بچوں سے زیادتی کا سکینڈل

فرانس کے مقامی اور غیر ملکی اخبار بچوں سے 'بڑے پیمانے پر' زیادتی کے سکینڈل کی خبریں نشر کر رہے ہیں۔ درجنوں سرکاری نرسری اور پرائمری سکولوں کے 'مانیٹرز' (نگران) پر تشدد، جنسی حملے اور ریپ کے الزامات میں تفتیش ہو رہی ہے۔ پیرس کی پولیس ۱۰۰ سے زائد الزامات کی تحقیقات کر رہی ہے جن میں تین سال کی عمر کے بچوں کے ساتھ لنچ بریک، نیپ ٹائم (سونے کا وقت) اور آفٹر سکول ایکٹیویٹیز کے دوران بدسلوکی، جسمانی تشدد اور ریپ شامل ہیں۔ پیرس کی ٹاپ پراسیکیوٹر Laure Beccuau نے کہا: "ہم ۸۴ پری اسکولز، تقریباً ۲۰ پرائمری سکولز اور تقریباً ۱۰ اڈے کیئر سنٹرز میں تفتیش کر رہے ہیں"۔ وکلاء نے بتایا کہ تفتیش میں تین اور چار سال کی عمر کے بچوں کے مبینہ ریپ کے کیسز بھی شامل ہیں۔ والدین کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ وہ سالوں سے ان الزامات کو سنجیدگی سے لینے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان کے مطابق مانیٹرز کی بھرتی کے عمل اور چیکنگ میں ناکامیوں کی وجہ سے زیادتی جاری رہی۔ سکول مانیٹرز وہ بالغ افراد ہوتے ہیں جو لنچ، بریک ٹائم، نیپ اور آفٹر سکول ایکٹیویٹیز کے دوران بچوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ٹیچرز سے زیادہ وقت بچوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ یہ سکولوں یا تعلیم کے وزارت کے براہ راست ملازم نہیں ہوتے بلکہ سٹی ہال یا مقامی اتھارٹیز کی طرف سے بھرتی کیے جاتے ہیں، اکثر بغیر تربیت، پروفیشنل ڈپلوما کے اور زیادہ تر عارضی بنیادوں پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔ فرانس میں تین سال کی عمر سے نرسری سکول لازمی ہے اور مانیٹرز تین سے گیارہ سال کے بچوں کے لیے روزانہ موجود ہوتے ہیں۔ وکیل Louis Cailliez، جو پیرس کی دو فیمیلیز کی نمائندگی کرتے ہیں، نے فرانس میں سکول مانیٹر سیکٹر کو "تباہی" اور "قومی آفت" قرار دیا۔ پیرس کے نئے سوشلسٹ میئر Emmanuel Grégoire نے بیس ملین یورو کا پلان شروع کیا ہے تاکہ شہر کے سکول مانیٹر سسٹم میں "بڑی خرابیاں" دور کی جا سکیں۔ انتخاب سے پہلے، گریگوائر نے خود انکشاف کیا تھا کہ اسے بچپن میں (۹ سے ۱۰ سال کی عمر میں) پرائمری اسکول میں سکول مانیٹر نے جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔

والدین کی تنظیم kolektive SOS Périscolaire پانچ سال سے گواہی جمع کرنے اور انصاف کی مہم چلا رہی ہے۔ اس کی ایک بانی Anne نے کہا کہ یہ سکینڈل پورے فرانس میں ہے۔ صرف شہری سطح پر ہی نہیں بلکہ ریاست کی طرف سے بھی خرابیاں ہیں۔ ایک اور گروپ کی ترجمان نے کہا: "فرانسیسی معاشرہ آنکھیں کھول رہا ہے کہ سکول وہ پناہ گاہ نہیں جو ہم سمجھتے تھے۔ جب آپ صبح بچے کو سکول چھوڑتے ہیں تو وہ بچہ انتظامی خرابیوں اور Paedophile رویے سے بالکل محفوظ نہیں۔ یاد دلاتے چلیں کہ اس قبل ۲۰۲۱ء میں فرانس میں چرچ کے پادریوں کی جانب سے بچوں سے بڑے پیمانے پر زیادتی کے سکینڈل نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق سنہ ۱۹۵۰ء سے ۲۰۲۱ء تک تقریباً دو لاکھ سولہ ہزار بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی تھی۔ زیادتی کا شکار ہونے والوں میں زیادہ تر لڑکے ہیں۔ اس تحقیق کے سربراہ کا کہنا تھا کہ جنسی زیادتی کرنے والے پادریوں کی تعداد دو ہزار نو سو سے تین ہزار دو سو تک ہے چرچ کی انتظامیہ متاثرہ بچوں کے معاملے کو ظالمانہ طریقے سے نظر انداز کرتی رہی۔

فرانس سمیت تقریباً تمام ہی مغربی ممالک کو ان حالات کا سامنا ہے، حکومتیں ان جرائم کو روکنے کے لیے نظام کو بہتر بنانے اور قانون سازی کی بات تو کرتے ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جس شرم وحیا سے عاری تہذیب کے وہ داعی ہیں وہ تہذیب ان جنسی درندوں کی افزائش کے لیے نرسری کا کام کر رہی ہے ایسے میں آپ اپنی ناقص عقلیں لڑا کر لاکھ قوانین بنائیں اور پیسہ خرچ کریں یہ جرائم رکنے والے نہیں ہیں۔ مغرب کی اسی بیماری کو علامہ اقبال نے پہچانا اور اپنے اشعار میں بیان کیا:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید

ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

کاروباری پابندیاں دوبارہ لگائیں تو ملک گیر احتجاج ہو گا: مرکزی انجمن تاجران

پاکستان کی ایک نمایاں تاجر تنظیم نے حکومت کو خبر دار کیا کہ اگر بازاروں کو جلد بند کرنے کا فیصلہ دوبارہ نافذ کیا گیا تو ملک گیر احتجاج شروع کیا جائے گا۔ تاجروں نے حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ توانائی کی بچت کے لیے لگائی گئی کاروباری پابندیوں کو مستقل طور پر ختم کیا جائے۔ اپریل کے اوائل میں پاکستانی حکومت نے مہنگے درآمدی ایندھن کی بچت کے لیے کفایت شعاری منصوبے کے تحت دکانوں، بازاروں اور شاپنگ مالز کو رات آٹھ بجے تک بند کرنے کا حکم دیا تھا۔ تاہم ریستورانوں، بیکریوں، کریانہ سٹورز اور شادی ہالز کو رات ۱۰ بجے تک استثنیٰ حاصل تھا۔ یہ کفایت شعاری اقدامات امریکہ اور اسرائیل کی ایران سے جنگ کے بعد نافذ کیے گئے تھے۔ تاجروں نے بازاروں کو جلد بند کرنے کی پابندیوں کے خاتمے کا مطالبہ کرتے ہوئے شکایت کی کہ ان اقدامات سے ان کی آمدنی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ تاجروں کے کہنا ہے کہ شدید گرمی کے موسم میں کاروباری سرگرمیاں شام سات بجے کے بعد شروع ہوتی ہیں، دکانوں کو رات آٹھ بجے بند کرنے پر مجبور کرنا کاروبار کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسلام آباد میں کبھی احتجاجوں کو روکنے کے نام پر حکومت راستے بند کر دیتی ہے تو کبھی میچز کی سکیورٹی کے نام پر۔ حال ہی میں امریکہ ایران مذاکرات کے لیے جس طرح پورے اسلام آباد کو سیل کیا گیا تھا اس سے تو یہی لگتا ہے کہ حکمرانوں کی نظر میں عام انسانوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

حکومت کا مؤقف ہے کہ کاروبار جلد بند کرنے کی پابندیاں توانائی کے استعمال میں کمی، بجلی کی پیداوار کی لاگت کو قابو میں رکھنے اور کم آمدنی والے طبقات کو ایندھن کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے لگائی گئی تھیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکومت واقعی بچت میں سنجیدہ ہے تو ملک بھر میں وزراء کے ساتھ تیس چالیس گاڑیوں کا لشکر کیوں ہوتا ہے؟ عرصہ دراز سے بیوروکریسی اور سرکاری افسران کو ملنے والی فری بجلی گیس پٹرول پر تنقید ہوتی رہی ہے ان معاملات کو کیوں درست نہیں کیا جاتا؟

امریکہ کا اپنے اتحادیوں سے دفاعی بجٹ بڑھانے کا مطالبہ

امریکی وزیر دفاع پیٹ ہیگسیتھ نے ۳۰ مئی ۲۰۲۶ء کو سنگاپور میں ۲۳ویں شنگریلا ڈائیلاگ سربراہی اجلاس کے دوران خطاب کرتے ہوئے اپنے اتحادیوں اور شراکت داروں سے کئی مطالبے کر ڈالے۔ پیٹ ہیگسیتھ نے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے اس دیرینہ مطالبے کو دہرایا کہ اتحادی اپنے دفاعی اخراجات کا زیادہ بوجھ خود اٹھائیں۔ ٹرمپ نے واضح طور پر کہا ہے کہ یورپی اور نیٹو شراکت داروں کو واشنگٹن پر انحصار کم کرنا چاہیے۔

اس نے کہا: ”امریکہ کی جانب سے امیر ممالک کے دفاع کے لیے مالی امداد دینے کا دور ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں شراکت داروں کی ضرورت ہے، زیر سرپرستی ریاستوں کی نہیں۔ ہمارا اتحاد تب تک مضبوط نہیں ہو سکتا جب تک ہر کوئی اپنا حصہ نہ ڈالے۔ کوئی مفت خوری نہیں چلے گی“۔ امریکی وزیر دفاع پیٹ ہیگسیتھ نے ایشیائی اتحادیوں پر زور دیا کہ وہ چین کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنے اور خطے میں اس کو روکنے کے لیے فوجی اخراجات میں اضافہ کریں۔ پیٹ ہیگسیتھ نے کہا: ”کسی بھی بالا دست طاقت کے زیر تسلط بحر الکاہل، علاقائی طاقت کے توازن کو بگاڑ دے گا۔ چین سمیت کوئی بھی ریاست، اپنی بالا دستی مسلط نہیں کر سکتی اور ہماری قوم اور ہمارے اتحادیوں کی سکیورٹی یا خوشحالی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی“۔ پینٹاگون کے سربراہ نے کہا کہ امریکہ اپنے ایشیائی اتحادیوں اور شراکت داروں سے توقع کرتا ہے کہ وہ اپنے دفاعی اخراجات کو جی ڈی پی کے ۵ء۳ فیصد تک بڑھائیں گے۔ کبھی یہ ”ڈومور“ کے مطالبے مسلم ممالک پر مسلط اپنی کٹھ پتلیوں اور غلام حکومتوں سے ہوتے ہیں آج امریکہ کی یہ حالت ہے کہ اپنے اتحادیوں سے کبھی منت سماجت کرتا ہے کبھی غصے و ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور کبھی دھونس دھمکیوں پر اتر آتا ہے۔

وال سٹریٹ جنرل لکھتا ہے امریکہ اور یورپ کے درمیان بحر اوقیانوس کے حوالے سے تعلقات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں، ایران کی جنگ پر کشیدگی نے اس احساس کو بڑھایا ہے کہ دنیا کی سب سے اہم جغرافیائی سیاسی شراکت داری ”طلاق“ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ امریکہ یورپ اتحاد ایران جنگ کے حوالے سے بریکنگ پوائنٹ پر پہنچ رہا ہے۔ جو گرین لینڈ پر تعطل کے بعد پہلے ہی مشکل صورتحال میں تھا۔

نریندر مودی کا متحدہ عرب امارات کا دورہ: دفاعی تعاون کا معاہدہ اور اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری

انڈیا اور متحدہ عرب امارات کے درمیان دفاعی شراکت داری کے فریم ورک پر معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت دونوں ممالک جدید دفاعی ٹیکنالوجی میں اشتراک، انٹیلی جنس تبادلے اور دہشت گردی کے خلاف تعاون کو مزید مضبوط بنانے پر توجہ دیں گے۔ اس معاہدے کے تحت دونوں فریق دفاعی صنعت میں تعاون کو مزید گہرا کرنے اور جدید ٹیکنالوجی، تربیت، فوجی مشقیں، بحری سلامتی، سائبر دفاع اور محفوظ مواصلات کو بڑھانے پر متفق ہوئے ہیں۔ انڈیا اور متحدہ عرب امارات کے درمیان ۱۰۰ ارب ڈالر سے زیادہ کی تجارت ہوتی ہے اور امارات خلیج میں انڈیا کا سب سے بڑا شراکت دار ہے۔ متحدہ عرب امارات میں انڈیا کے سفیر دیپک مِتّل نے کہا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان سب سے اہم معاہدہ سٹریٹجک تیل کے ذخائر کو بڑھانے سے متعلق ہے۔ اس نے کہا کہ 'سب سے اہم پہلو انڈیا کے سٹریٹجک تیل کے ذخائر کو بڑھانا ہے۔ اسے تقریباً ۵۵ لاکھ بیرل سے بڑھا کر تین کروڑ بیرل تک لے جانے کی منصوبہ بندی ہے۔ اس کے تحت نئی جگہوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے، جن میں اڑیسہ کا چندیکھول بھی شامل ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ دونوں ممالک کے اسرائیل سے دفاعی و تجارتی تعلقات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

انڈیا اور اسرائیل کے مابین مالی سال ۲۰۲۴-۲۰۲۵ء میں، دو طرفہ تجارت تقریباً ۵ء۳ بلین ڈالر رہی۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۹۱ پر)

جو بقولِ سگِ اغیار 'خوارج' ٹھہرے

مولانا نوید قمرؔ

رب کی جنت کے خریدار خوارج ٹھہرے
دین احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفادار 'خوارج' ٹھہرے

جرم جن کا تھا فقط غلبۂ دیں کی خواہش
ایسے پاکیزہ گنہگار 'خوارج' ٹھہرے

جن کے کردار کی خوشبو سے زمانے مہکے
آج وہ صاحبِ کردار 'خوارج' ٹھہرے

جبر کے دور میں حق گوئی تھا شیوہ جن کا
وہ سبھی صاحب دستار 'خوارج' ٹھہرے

'لبرل اسلام' کے داعی پہ کوئی روک نہیں
دینِ خالص کے علم دار 'خوارج' ٹھہرے

خوب 'اسلامی' ریاست ہے ہماری جس میں
سب شریعت کے پرستار 'خوارج' ٹھہرے

جب وہ اُس پار تھے سرحد کے، مجاہد تھے تب
وہی سرحد کے اب اِس پار 'خوارج' ٹھہرے

یہ قمر جان لو مستقبل انہی کا ہو گا
جو بقول سگ اغیار 'خوارج' ٹھہرے

دعوت و جہاد کا راستہ

"دعوت و جہاد کا راستہ سازشوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ خطرات، قید و بند، قتل، دھتکارے جانے اور جھٹلائے جانے کا راستہ ہے۔ جو بھی عقیدے کا گراں بار اٹھانے اور دعوت کو پھیلانے کا ارادہ کرے وہ جان لے کہ یہ سب مشکلات تو اس کی راہ میں آئیں گی۔ جو کوئی اس کو دلچسپ تفریح، نرم کلام اور میٹھے بولوں کے ذریعے حاصل کرنے کا خواہش مند ہو تو اسے چاہیے کہ اِس دین کی بعثت سے لے کر آج تک، اِس دین کے داعیوں اور پیامبروں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لے اور تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ بھی اٹھا کر دیکھ لے۔"

شیخ عبداللہ عزام شہید رحمۃ اللہ علیہ

اِقتباس از درس: قُربانی اور ایثار